قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ
www.urducouncil.nic.in

اگست 2021 قیمت 15₹

ماہنامہ

اردو دنیا

نئی دہلی

Monthly **URDU DUNIYA**, New Delhi

جشن آزادی مبارک

ادب اطفال کی دنیا میں اہم ترین سنگ میل

قومی اردو کونسل کی فخریہ پیش کش

ماہنامہ بچوں کی دنیا دہلی

Monthly BACCHON KI DUNIYA, New Delhi

دل چسپ کہانیاں

معلوماتی مضامین

ہنسنے ہنسانے کی باتیں

پیاری پیاری نظمیں

قسط وار ناول

ان کے علاوہ:

کہکشاں ◆ سیاحتی مقامات

اردو فیس بک ◆ دماغی ورزش

ننھے فنکار ◆ ڈاک خانہ جیسے مستقل کالم

اور بہت کچھ

سب سے زیادہ چھپنے والا بچوں کا اردو رسالہ

قیمت فی شمارہ: 10 روپے   سالانہ: 100 روپے

سالانہ خریداری اور ایجنسی کے لیے رابطہ فرمائیں

زرتعاون سالانہ 100 روپے بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

ماہنامہ
اردو دنیا
دہلی
Monthly URDU DUNIYA, New Delhi

قومی اردو کونسل کا بین الاقوامی جریدہ

جلد:23، شمارہ:08، اگست 2021

مدیر : ڈاکٹر شیخ عقیل احمد
مشیر : حقانی القاسمی
معاونین: عبدالرشید اعظمی، یوسف رامپوری، نایاب حسن

ناشر اور طابع

ڈائرکٹر، قومی کونسل برائے فروغِ اردو زبان
وزارتِ تعلیم، محکمۂ اعلیٰ تعلیم، حکومتِ ہند

مطبع:

ایس نارائن اینڈ سنز، بی۔88، اوکھلا انڈسٹریل ایریا
فیز-II، نئی دہلی-110020

مقامِ اشاعت: دفتر قومی اردو کونسل

کمپوزنگ: محمد اکرام
ڈیزائننگ: محمد زید

قیمت -/15 روپے سالانہ -/150 روپے

Total Pages: 100

- اس شمارے کے قلم کاروں کی آرا سے قومی اردو کونسل NCPUL اور اس کے مدیر کا متفق ہونا ضروری نہیں
- ڈرافٹ NCPUL, New Delhi کے نام ارسال کریں

صدر دفتر

فروغِ اردو بھون، ایف سی 33/9، انسٹی ٹیوشنل ایریا جسولہ، نئی دہلی-110025
فون: 49539000 شعبۂ ادارت: 49539009

ویب سائٹ

http://www.urducouncil.nic.in
E-mail: editor@ncpul.in
urduduniyancpul@yahoo.co.in

شعبۂ فروخت

ویسٹ بلاک-8، ونگ-7 آر کے پورم، نئی دہلی۔110066
فون: 26109746، فیکس: 26108159
ای میل: sales@ncpul.in,ncpulsaleunit@gmail.com
شاخ: 22-7-110، تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس
بلاک نمبر 5-1 پتھر گٹی، حیدرآباد۔500002
فون: 040-24415194

مشمولات

اداریہ
ہماری بات 4

خطوط
ربط والتفات — قارئین کے خطوط 5

ادب: جہات اور زاویے
تحقیق کیسے کریں — غضنفر 10
میرابائی: عرفانِ ذات کی شاعرہ — قمر جمالی 13

حسرت موہانی کا شاعرانہ کردار — قیصر زماں 15
اردو، قومی یکجہتی اور اتحاد — محمد قمر سلیم 17
رام کے حوالے سے چکبست کی شاہکار نظم — احسان حسن 19
ماحولیاتی تحفظ اور ادبِ اطفال — زاہد ندیم احسن 22

نقد مثنوی کاشف الحقائق کے آئینے میں — سلمیٰ محمد رفیق 25
ماہنامہ معارف اور تحقیقات سلیمانی — اطہر حسین 28

زبان و تعلیم
ورچوئل تدریس میں گوگل کلاس روم کا استعمال — مشتاق احمد آئی پٹیل 32
عصر جدید کے طلبا میں اضطراب — محمد اطہر حسین 35

یاد رفتگاں
سہیل اختر — راشد جمال فاروقی 37
رتن سنگھ — نارائن پاٹیدار 39

لعل و گہر
قاضی سجاد حسین کی ادبی خدمات — عتیق الرحمٰن 42
فنکارانہ تخلیقی اظہار کا شاعر تسنیم انصاری — اسرار اللہ انصاری 45
سید محمد نسیم انہونوی — شہلا پروین 48

سمت و امکانات
مغربی بنگال میں اردو افسانہ — محمد علی حسین شائق 51
تمل ناڈو میں اردو افسانہ — اسانغنی مشتاق رفیقی 55
اردو میں افسانچہ نگاری کا تحقیقی وتنقیدی جائزہ — فردوس احمد بھٹ 57
اردو افسانوں میں خود کلامی کے عناصر — محمد علیم اسماعیل 60

اردو: تاریخ، تہذیب اور تکنیک
کس کو اردو زبان دے جاؤں — ابوزر عبدالاحد فرقانی 62
اردو میں ڈیجیٹائزیشن — پرویز احمد اعظمی 68
ریڈیو اور اردو کا باہمی رشتہ — نظام الدین احمد 70

نفسیات
کتھارسس کی نفسیاتی اہمیت اور ادبی معنویت — وحید الظفر خاں 72

نیا آسمان نئے ستارے
اکیسویں صدی میں اردو فکشن تنقید — نظیر احمد گنائی 75

کمپیوٹر
ایکسل میں کوائفیہ یا ڈاٹا بیس 77

کتابوں کی دنیا
تعارف وتبصرہ — ادارہ 79

عالمی اردو نامہ
اردو نامہ — ادارہ 88

خبرنامہ
اردو دنیا کی خبریں — ادارہ 90

ہماری بات

قارئین! اردو کی سرشت میں وطن کی محبت اور الفت شامل ہے۔ اس زبان نے ہر موڑ پر وطن کی سربلندی اور سا لمیت کی صدا بلند کی ہے۔ 'انقلاب زندہ باد' جیسے نعرے سے محبانِ وطن کے دلوں میں جوش و ولولہ پیدا کیا ہے اور ملک کو غلامی کی زنجیروں سے آزاد کرایا ہے۔ ہندوستان کی دوسری زبانوں کے ساتھ اردو زبان نے بھی ملک کو آزاد کرانے میں جو کردار ادا کیا ہے وہ ناقابل فراموش ہے۔

ایک وقت تھا جب سات سمندر پار سے آئے انگریزوں نے ہمارے ملک کو غلام بنالیا تھا اور باشندگانِ ہند پر مظالم ڈھانے شروع کر دیے تھے، اتنا ہی نہیں بلکہ صدیوں اور ہزاروں سال سے ایک ساتھ رہنے والے ہندوستانی طبقات کے درمیان ٹکراؤ پیدا کر کے انھوں نے ہمارے وطن کو کمزور کر دیا تھا، تو اس وقت اردو زبان نے آگے بڑھ کر اپنے ہموطنوں کے مابین اخوت و بھائی چارے کا نعرہ لگایا اور انگریزوں کو ملک سے باہر کرنے کے لیے تحریک آزادی کو تقویت دینا شروع کر دی۔ اردو کے شاعروں نے مجاہدین آزادی کے جوش کو گرمایا، افسانہ نگاروں نے تحریک آزادی میں روح پھونکی اور صحافیوں نے اپنی بیباک تحریروں سے برطانوی استعمار کے ایوان کو لرزہ براندام کر دیا۔

1857 کے موقعے پر اردو صحافیوں نے برطانوی سامراج کے خلاف کھل کر لکھا اور بے خوف وخطر کاروانِ حریت کی حمایت کی۔ عوام کے اندر ملک کی آزادی کے لیے جوش اور جذبہ پیدا کیا۔ مولوی محمد باقر کے 'دہلی اردو اخبار'، مولوی ظفر علی خاں کے 'زمیندار'، مولانا حسرت موہانی کے 'اردوئے معلی'، مولانا محمد علی جوہر کے 'ہمدرد' اور مولانا ابوالکلام آزاد کے 'الہلال' اور اردو کے دیگر درجنوں اخبارات وجرائد نے آزادی کی جدو جہد میں حصہ لینے والوں کا ساتھ دیا۔ ان میں سے کئی ایک کو قید و بند کی صعوبتیں برداشت کرنی پڑیں اور کئی ایک کو تختۂ دار چومنا پڑا، مگر انھوں نے بانگ دہل کہہ دیا:

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

مولانا الطاف حسین حالی، سرور جہاں آبادی، برج نرائن چکبست، علامہ اقبال، عرش ملسیانی، بسمل عظیم آبادی، جوش ملیح آبادی، تلوک چند محروم، سجاد ظہیر، رشید جہاں، اسرار الحق مجاز، لال چند فلک، فراق گورکھپوری، انور صابری، معین احسن جذبی، علی سردار جعفری، نذیر بنارسی جیسے سیکڑوں ادیب وشاعر تھے جنھوں نے شعلہ بار تحریروں اور تقریروں سے تحریک آزادی کی آبیاری کی اور بلاتفریق مذہب وملت ملک کے تمام طبقات کی جہدِ مسلسل سے 15/اگست 1947 کو ہمارا ملک آزاد ہوگیا

خوں شہیدانِ وطن کا رنگ لاکر ہی رہا آج یہ جنت نشاں ہندوستاں آزاد ہے

ملک کی آزادی کے بعد بھی اپنے وطن کے لیے اردو کا مثبت اور متحرک کردار جاری رہا اور اس زبان نے ہمیشہ یگانگت، یکجہتی، رواداری اور بقائے باہم پر زور دیا اور بکھرے ہوئے دانوں کو ایک لڑی میں پرونے کا کام بھی کیا۔ آج بھی جب کہ وطن کو آزاد ہوئے ثلث صدی بیت چکی ہے، گنگا وجمنی تہذیب کے تحفظ وفروغ کے لیے اس زبان کی کوششیں جگ ظاہر ہیں۔ اردو کے ادبا وشعرا محبت واخوت کے پیغام کو اپنی تحریروں کے ذریعے عام کر رہے ہیں اور ہندوستان کی اس تکثیری روایت اور روش کو زندہ رکھے ہوئے ہیں جو ہمارے ملک اور مٹی کی حقیقی شناخت ہے۔ اس زبان نے ہمیشہ اپنی مٹی اور ملک سے محبت کے جذبے کو بیدار کیا ہے۔ اسی وجہ سے اردو کی پوری شاعری حب الوطنی کے جذبات سے معمور ہے۔ اردو میں قومی اور وطنی شاعری کی ایک زریں تاریخ رہی ہے اور ایسے اشعار لکھے گئے ہیں جن میں وطن سے محبت اور الفت کا بے پناہ جذبہ موجزن ہے:

دل سے نکلے گی نہ مرکر بھی وطن کی الفت میری مٹی سے بھی خوشبوئے وفا آئے گی
وطن کی پاسبانی جان وایماں سے بھی افضل ہے میں اپنے ملک کی خاطر کفن بھی ساتھ رکھتا ہوں

عقیل احمد

شیخ عقیل احمد

ربط والتفات

ماهنامه 'اردو دنیا' میں 'آپ کی بات' کے تحت قارئین کے خطوط شائع کرنے کا قطعی مقصد نہیں ہوتا کہ محض ستائشی اور تحسینی کلمات لکھے جائیں بلکہ رسالے کے مشمولات کے حوالے سے نئے مباحث پر گفتگو کو آگے بڑھانا ہوتا ہے۔ ماضی میں مکتوبات بہت سے مضامین سے بھی زیادہ بیش قیمت ہوتے تھے کہ ان میں مشمولہ مضامین کے تعلق سے نئے نکات، مباحث کی نشاندھی کی جاتی تھی۔

قارئین سے گذارش ہے کہ ماہنامہ 'اردودنیا' کے مشمولات کے حوالے سے بحث انگیز خطوط ارسال کریں اور ان نئے موضوعات، عنوانات، شخصیات اور علاقوں کی نشاندھی کریں جنھیں نظرانداز کیا جاتا رہا ہے۔ آپ کے خطوط ہمارے لیے بہت اہمیت کے حامل ہوتے ہیں، ان سے ہمیں رسالے کو خوب سے خوب تر بنانے میں مدد ملتی ہے۔ (ادارہ)

قومی اردو کونسل کا یہ بین الاقوامی جریدہ ہے۔ اس رسالے کے مشیر حقانی القاسمی اور معاونین میں عبدالرشید اعظمی، یوسف رامپوری اور نایاب حسن ہیں۔ اداریہ ہماری بات میں مدیر نے بڑی اچھی بات کہی ہے:

''دراصل شخصیتیں ہی معاشرے کی صحیح سمت کا تعین کرتی ہیں اور وہ راستے دکھاتی ہیں جن پر چل کر معاشرہ ارتقا سے ہمکنار ہوتا ہے۔ یہ شخصیتیں نہ ہوتیں تو شاید معاشرے میں ہر سو تاریکی پھیلی ہوتی، ظلمتوں کا دور دورہ ہوتا اور وہ تمام برائیاں معاشرے کا حصہ بنتیں جو کسی بھی سماج کے اضمحلال اور زوال کا باعث ہوتی ہیں، اس لیے ہمیں ایسی شخصیات کے بچھڑنے کا شدید ملال ہے جو ہمارے معاشرے کی مثبت توانائیوں کا استعارہ ہیں۔''

مدیر کا بھرپور خراج ہے ان شخصیتوں کے لیے جو ہم سے بچھڑ گئیں ان کی جگہ لینا ناممکن نہیں تو مشکل ضرور ہے۔ مشمولات میں 16 عناوین کے تحت 100 صفحات میں 30 مضامین ہیں۔ اداریہ کے بعد خطوط (ربط و التفات) میں کئی مشاہیر کے خطوط ہیں۔ 'زبان وتعلیم' کے تحت 'عالمگیریت اور تعلیم باہمی رشتے اور اثرات' آفتاب عالم کا ہے۔ انھوں نے تعلیم پر عالمگیریت کے اثر کا جائزہ لیا ہے۔ 'نقد ونگاہ' میں پانچ مضامین ہیں۔ پہلا مضمون 'پنچ تنتر تہذیب وتاریخ کے آئینے میں' ڈاکٹر شاذیہ عمیر کا ہے۔ پنچ تنتر کے بارے میں یہ بات کافی ہے کہ دنیائے ادب میں یہ کام ہمیشہ اہمیت کا حامل رہا ہے اور رہے گا۔ دوسرا مضمون 'حیدرآباد میں اردو ناول' عبدالمغنی صدیقی کا ہے۔ انھوں نے بڑی تفصیل کے ساتھ ناول نگاروں کا جائزہ لیا ہے۔ جہاں تک میرا خیال ہے فاطمہ تاج بھی ناول نگار تھیں ان کا ذکر نہیں ہے۔ تیسرے مضمون 'فلسفۂ موت کی شعری تشریحات' میں صابر علی سیوانی نے اچھا تجزیہ کیا اور اشعار کا انتخاب بھی خوب ہے۔ انھوں نے لکھا کہ موت کے موضوع پر ہزاروں اشعار ملتے ہیں یقیناً اس لیے موت کا ایک دن معین

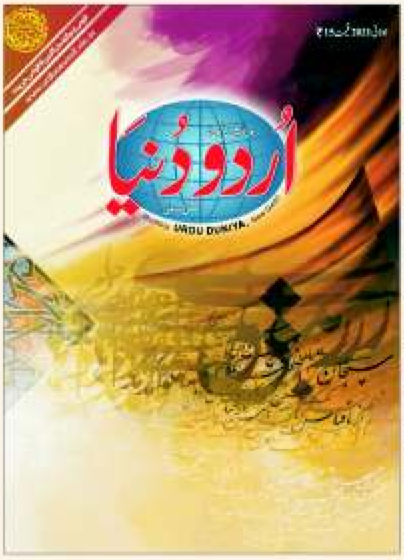

ہے۔ چوتھا مضمون 'قیصر تمکین کا تنقیدی رجحان' احسن ایوبی کا ہے۔ انھوں نے خوب لکھا اور یہ بتایا کہ قیصر تمکین اردو ادب کے ساتھ ساتھ عالمی ادبیات کا بھی سنجیدگی سے مطالعہ کرتے رہے۔ آخری مضمون 'تخلیق... وجود اور ارتقا' جاوید انور کا ہے۔ انھوں نے تخلیق کی وجہ تسمیہ کے ساتھ یہ بتایا ہے کہ روز اول سے ہی وہ تحقیقی، تجزیاتی اور مشاہداتی قوت کا مالک ہے۔ بڑے ہی سلجھے ہوئے انداز میں وجود اور ارتقا کا جائزہ لیا ہے۔

یاد شمیم میں پروفیسر شمیم حنفی پر دو مضامین 'یاد رنگ' نجمہ رحمانی اور 'پروفیسر شمیم حنفی' محمد قاسم انصاری کے ہیں جو بطور خراج عقیدت کے شامل ہیں۔

لعل و گہر میں پانچ مضامین ہیں جس میں کشمیر کی درد آشنا ترنم ریاض (قدوس جاوید)، شگفتہ مزاج نقاد: ناصر الدین انصار انھوں نے ڈاکٹر صفدر کی باغ و بہار شخصیت پر لکھا وہ ایک اچھے مزاح نگار تھے۔ شگوفہ حیدرآباد نے بھی ان کا گوشہ شائع کیا۔ فکر و احساس کا شاعر نیر سلطانپوری پر نشاں زیدی نے مختصر مگر جامع مضمون لکھا۔ نازش پرتاپ گڑھی کا شعری اختصاص خوب ہے اور ان کی تمام خوبیوں کا اس میں تفصیل سے ذکر کیا ہے۔ احمد جمال پاشا کی انشائیہ نگاری: شفیع احمد نے ان کی انشائیہ نگاری کو مختلف حوالوں کے ساتھ پیش کیا ہے ویسے احمد جمال پاشا پر بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ وہ ایک کامیاب انسان تھے۔

شمس و قمر میں چار مضامین ہیں۔ لعل و گہر کے بعد یہ آفتاب و مہتاب بھی خوب ہیں۔ اس میں انور اعظمی ایک مطالعہ (محمد الیاس الاعظمی)، الطاف شاہ آبادی کا شعری مزاج: اختر شاہ جہاں پوری نے شعروں کے تقابلی جائزے کے ذریعے ان کے شعری مزاج کی عکاسی کی ہے۔ حکیم آغا جان عیش کی غزل گوئی: نوشاد منظر نے ان کے قصائد کو چھوڑ کر ان کی غزلیہ شاعری کا جائزہ لیا اور کلیات عیش کے حوالے سے لکھا ہے اس میں آخری مضمون آمنہ ابوالحسن اردو افسانے کا ایک معتبر نام: ارشاد شفیق کا ہے۔ آمنہ ابوالحسن خواتین افسانہ نگاروں اور ناول نگاروں میں یقیناً ایک معتبر نام ہے۔ انھوں نے ان کے افسانوی ادب کا جائزہ لیا ہے۔

اساطیر اور اردو میں دو مضامین ہیں۔ پہلا مضمون 'اردو افسانوں میں ہندو اساطیر' (ابوبکر عباد) کا ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''اساطیر کی دنیا، فکشن کی دنیا کی طرح ہی بے حد وسیع، حیرت ناک، سحر انگیز، دلکش، پیچیدہ اور متنوع ہے۔ یہ ایک ایسی دنیا ہے جس میں بوالعجبی بھی ہے، بوقلمونی بھی کہ اس دنیا میں علم سے زیادہ عقیدے کی کارفرمائی ہوتی ہے، یقین پر گمان کو فوقیت حاصل ہوتی ہے، عقل پر عشق کو ترجیح دی جاتی ہے اور منطق کے مقابلے میں ممکنات کا سکہ چلتا ہے۔''

دوسرا مضمون 'اردو شاعری میں ہندو دیومالائی عناصر اور رام کا کردار' مہر فاطمہ کا ہے۔ یہ بھی اساطیری کہانیوں میں ہی آتا ہے۔ ہندو دیومالائی کہانیاں اساطیر میں شمار ہوتی ہیں۔ چکبست کی رامائن کے ایک سین کو نظم کیا ہے اور اس نظم کا ابتدائی حصہ دیا گیا ہے۔

اردو دنیا نے ایک اچھا سلسلہ کتاب دریچہ شروع کیا ہے جس میں کسی بھی شخص کے لیے جو کتابوں کا شوقین ہے وہ اس پر کچھ لکھ سکتا ہے۔ اس میں اس بار قیوم بدر کا ہے۔ آپ بھی اس طرح کا مضمون لکھ سکتے ہیں۔

زاویہ نظر میں ''پیغام آفاقی کا دوست' ابرار رحمانی کا مضمون ہے۔ دراصل عنوان سے ہی پتہ چلتا ہے کہ ان کے ناول 'دوست' پر ہے۔ 'نگر نگر اردو' عنوان سے ہی پتہ چلتا ہے کہ کسی نگر کا ذکر ہوگا اس بار قمر النساء کا مضمون کرناٹک کی نسائی شاعری ہے۔ کرناٹک کے بعض حصے دکن میں شامل تھے۔ گلبرگہ، بیدر، رائچور وغیرہ میں بھی ادب پروان چڑھا اور آہستہ آہستہ نسائی ادب کو فروغ ملا۔ 'خصوصی گفتگو کے تحت' غلام نبی کمار نے پروفیسر عزیز اللہ شیرانی سے گفتگو کی ہے۔ کافی طویل انٹرویو ہے اور بہت ہی اچھے سوالات انھوں نے کیے اور عمدہ جوابات شیرانی صاحب نے دیے۔ 'عربی ادبیات' میں شمس کمال انجم کا علم نحو کی سب سے پہلی کتاب الکتاب: اردو والوں کے لیے عربی اور فارسی کے علوم سے بھی واقفیت ضروری ہے اس سے تحریر و تقریر میں نکھار پیدا ہوتا ہے۔ سیبویہ کی کتاب کے بارے میں وہ لکھتے ہیں ''علمائے نحو کے یہاں سیبویہ کی کتاب کی شہرت و منزلت کی وجہ سے لفظ کتاب بذات خود ایک 'علم' بن گیا تھا۔''

عربی ادبیات میں دوسرا مضمون فیصل نذیر کا 'معلقاتی شاعری مستند یا مسترد؟' ہے۔ دراصل معلقاتی شاعری زمانہ جاہلیت کی وہ عربی شاعری ہے جسے بازار عکاظ میں انتخاب کے بعد دیوار کعبہ پر لٹکا دیا جاتا۔ اس کا جائزہ انھوں نے لیا ہے۔

'صحت اور سائنس' میں شمس الاسلام فاروقی کا مضمون ہنسی کے فائدے ہیں۔ سائنسی اعتبار سے انھوں نے فائدے بتائے ہیں مگر آج کے زمانے میں مسکرانا بھی محال ہے۔

مسکرانے کی تمنا ہمیں بھی ہے مگر
مسکراتے ہوئے حالات کہاں ملتے ہیں

مگر فاروقی صاحب نے کہا ہے کہ:

''ہنسنا مسکرانا اور قہقہے لگانا دراصل ایک ایسا بندھن ہے جو لوگوں کو باہم باندھ کر رکھتا ہے۔''

کتابوں کی دنیا میں تبصرہ و تعارف کے تحت جزیرہ نہیں ہوں میں، انتظار حسین کی افسانہ نگاری، متن اور معنیاتی نظام، خاں محبوب طرزی: لکھنؤ کا ایک مقبول ناول نگار، نور الحسنین اپنے ناولوں کے آئینے میں، مناظر عاشق ہرگانوی کا ناول، شبنمی لمس کے بعد ایک ڈسکورس، وہ دس اور دوسری کہانیاں، موجوں کا اضطراب، میری کتابیں اور مبصرین، اردو صحافت کا مزاج پر تبصرے شامل ہیں۔ اس کے بعد قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں، آخر میں وفیات میں 15 ادیبوں اور شاعروں کو خراج

عقیدت پیش کیا ہے۔ اردو دنیا کے چند شماروں سے وفیات کو جمع کیا جائے تو ایک اچھا کتابچہ تیار ہوسکتا ہے۔

100 رنگین صفحات آنکھوں کو خیرہ کر دیتے ہیں اور ان پر رنگین چمکتے ہوئے مضامین ادب میں قوس قزح کا رنگ بکھیر رہے ہیں۔ اردو دنیا دہلی میں لاک ڈاؤن کے باوجود اس آب و تاب سے نکل رہا ہے جس کے لیے مدیر اور ادارہ قابل مبارکباد ہیں۔

❖ **ڈاکٹر م ق سلیم**: صدر شعبۂ اردو، شاداں کالج، تلنگانہ

ماہنامہ اردو دنیا کے مئی جون اور جولائی کے شمارے دستیاب ہوئے۔ ان میں موجود علم و ادب کے نقش و نگار پر نظر پڑتے ہی بے اختیار یہ مصرع یاد آ گیا۔

حیراں ہوں کہ دو آنکھوں سے کیا کیا دیکھوں!

جولائی کے شمارے میں شاذیہ عمیر نے پنچ تنتر کا تذکرہ کرتے ہوئے جانوروں کے متعلق ادبیات میں موجود اہم تخلیقات کا احاطہ کیا ہے۔ ڈاکٹر ناصر الدین انصار کا تحریر کردہ خاکے، 'شگفتہ مزاج نقاد، میں ڈاکٹر صفدر کی شخصیت اور فن پر سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے، یہ ایک بھرپور خراج عقیدت ہے۔ مرحوم اپنی گراں قدر ادبی خدمات کے سبب ادب میں جس پذیرائی کے مستحق تھے وہ انھیں جیتے جی نصیب نہ ہوئی، اس مضمون کی اشاعت سے آپ نے ایک بڑی کمی کو پورا کر دیا۔

شفیع احمد نے اپنے مضمون 'احمد جمال پاشا کی انشائیہ نگاری کے ابتدائی کلمات میں مشہور ادیب احمد جمال پاشا اور صنف انشائیہ کے تعارف کا حق ادا کر دیا مگر اس کے بعد اس صنف میں موصوف کی خصوصی خدمات کی جس طرح مٹی پلید کی گئی وہ افسوسناک ہے۔ یہ سلوک کسی اور ظرافت نگار کے ساتھ ہوتا تو انشائیہ سے متعلق موجود اختلاف رائے کے پیش نظر اسے برداشت کیا جا سکتا تھا مگر احمد جمال پاشا کو انشائیے سے ایک غیر معمولی تعلق رہا ہے۔ وہ صفِ اول کے طنز و مزاح نگار بھی تھے اور انشائیہ نگار بھی (خیر سے یہ دونوں مختلف چیزیں ہیں) ڈاکٹر وزیر آغا کی انشائیہ نگاری کی تحریک میں بھارت سے صرف تین ادیب شامل ہوئے تھے ان میں سب سے اہم نام احمد جمال پاشا کا ہے۔ (مذکورہ مضمون میں ان کے اس اہم رول کا ذکر تک نہیں ہے)۔

احمد جمال پاشا نے نہ صرف اپنی تخلیقات سے انشائیے کو استحکام بخشا بلکہ اس کے متعلق مضامین لکھ کر اس صنف کے خد و خال واضح کیے۔ ماہنامہ اوراق، لاہور کے انشائیہ نمبر میں انھوں نے عام مضمون، طنزیہ و مزاحیہ مضمون اور انشائیہ کے درمیان پائے جانے والے فرق کو واضح کرنے کی غرض سے ایک ہی موضوع 'بوز' پر تینوں قسم کے مضامین لکھ کر ایک بڑے مغالطے کو دور کرنے کی کامیاب کوشش کی تھی۔ شفیع احمد نے احمد جمال پاشا کی مزاح نگاری کو انشائیہ نگاری کے خانے میں ڈال کر اس میدان میں ان کے اصل کام کو غائب ہی کر دیا۔ ان کے انشائیوں کے سلسلے میں 'مارشل لا' اور 'شکر کا چکر' کا ذکر کیا گیا ہے جبکہ یہ دونوں سرے سے انشائیے ہیں ہی نہیں۔ یہ خالص طنزیہ و مزاحیہ مضامین ہیں۔ احمد جمال پاشا کے مشہور انشائیے درج ذیل ہیں۔ 'بے ترتیبی، ہجرت، شور، تنہائی کی حمایت میں، بور، اصولوں کی مخالفت میں اور کچھ بلیوں کے سلسلے میں' ہیں۔ ان سے متعلق مضمون میں کوئی بات نہیں کی گئی۔ احمد جمال پاشا کی انشائیہ نگاری اور ان کی اس صنف کی ترویج و بقا کے سلسلے میں خدمات پر مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔

❖ **محمد اسد اللہ**: 30 گلستان کالونی، پانڈے امرائی لائس، جعفر نگر، ناگپور، مہاراشٹر

ماہنامہ 'اردو دنیا' جون 2021 میں سب سے پہلے میری نظر عظیم راہی افسانہ نگار کے مضمون 'قمر اقبال' پر پڑی۔ عظیم راہی نے قمر اقبال کے بارے میں اور ان کے فن کے بارے میں کچھ ایسا لکھا ہے کہ جیسے میں کوئی فلم دیکھ رہا ہوں، ایک ایک سطر میں حق بہ دار حق رسید والی بات کہی ہے۔ اس کے علاوہ عظیم راہی نے خود کے بارے میں بھی لکھا ہے کہ کس طرح انھوں نے ادبی دنیا میں اپنے قلم کو جنبش دے کر اپنا مقام ادبی دنیا میں بنایا ہے۔ ''ادبی دنیا میں مقام بنانا کوئی آسان کام نہیں ہوتا'' ایک مثال دے رہا ہوں۔

قمر اقبال تثلیثات بھی لکھتے تھے اور اورنگ آباد ٹائمز میں غزل بھی لکھتے تھے۔ عظیم راہی نے قمر اقبال کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے وہ بہت خوب لکھا ہے۔ ایسا لگتا ہے عظیم راہی نے قمر اقبال کا حق ادا کر دیا ہے۔

❖ **سمیع الدین اطہر**: اورنگ آباد، مہاراشٹر

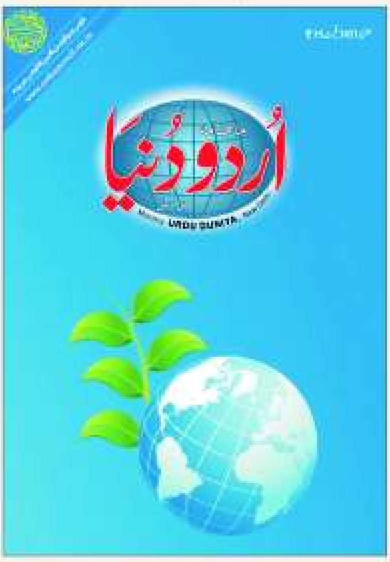

'اردو دنیا' ایک منفرد رسالہ ہے۔ ہندوستان میں اپنی انفرادیت کو برقرار رکھے ہوئے ہے۔ راقم الحروف 2008 سے رسالہ بار بار پڑھتا ہے۔ کبھی کوئی اکتاہٹ نہیں ہوتی جب کہ روزنامہ پڑھنے کا دل نہیں کرتا۔ 'اردو دنیا' ایک سال کا 150 روپیہ لے کر بارہ ماہ تک پوری دنیا کی اور پورے ملک کی معلومات قارئین کو فراہم کرتا ہے۔ میں ان تمام ادبا کو مبارکباد پیش کرتا ہوں جو اس رسالے میں اپنے زرخیز ذہن کی جانکاری عوام تک پہنچاتے ہیں۔ میرے پاس ایسے الفاظ نہیں جن سے میں ان لوگوں کی محبت اور شفقت کو خراج تحسین پیش کر سکوں۔ سوائے اس کے کہ اللہ تعالیٰ آپ کو اور طاقت دے کہ آپ اردو کی خدمت کرتے رہیں، آمین!

❖ **عبدالعزیز بٹ**، موضع: شاندرہ، تحصیل سرنکوٹ، ضلع پونچھ، جموں و کشمیر

اردو ماہنامے اور رسالے پڑھنے کا شوق بچپن سے ہی رہا ہے، کچھ رسالے گھر آیا کرتے تھے اور جو کمی رہ جاتی تھی وہ شبلی لائبریری پوری کر دیا کرتی تھی۔ حال ہی میں ایک ادب دوست کے ہاتھوں قومی اردو کونسل کے زیر اہتمام شائع ہونے والے ماہنامہ 'اردو دنیا' کے مارچ 2020 کا شمارہ موصول ہوا۔ کورونائی دور کے چلتے کئی ماہ

سے رسالہ کی ہارڈ کاپی پڑھنے کو نہیں ملی تھی اور ویب سائٹ پر ہی رسالے کا دیدار ہو جایا کرتا تھا، حالانکہ اکثر مکتبہ ''دانش محل' لکھنؤ سے خرید کر پڑھنے کا موقع مل جاتا تھا۔ شوق کے ہاتھوں 'اردو دنیا' کھولا اور عادت کے مطابق سب سے پہلے فہرست پر نظر ڈالی، عمدہ مشمولات اور وقیع مضامین پر مشتمل 'اردو دنیا' صوری و معنوی دونوں لحاظ سے پسند آیا، بلکہ دل میں اترتا چلا گیا۔

بطور خاص 'سیفی سرونجی سے گفتگو' کے عنوان پر نظر پڑی تو غنچۂ دل کھل اٹھا اور ساتھ ہی محترم ڈاکٹر سیفی سرونجی اور استوتی اگروال کی رنگین تصویر کی شمولیت سے انٹرویو پڑھنے کا لطف دوبالا ہو گیا، سوال و جواب کے اس خوبصورت سیشن کو حرف بہ حرف پڑھا اور دل جھوم اٹھا۔ یہ انٹرویو نہایت دلچسپ ہے، جو سرونجی صاحب سے محبت کرنے والوں اور ان کے قارئین کے لیے بہت سے ایسے گوشوں پر روشنی ڈالتا ہے، جن پر آپ کی تعمیر ہوئی ہے اور اب وہ جیسے آپ کی شخصیت میں کہیں روپوش ہو کر شعبہ حیات کا اہم باب ہو گئے ہیں، تسنیم وکوثر سے دھلی زبان کے ساتھ درمیان درمیان میں سیفی سرونجی صاحب کی ظرافت کمال کی ہے۔ سرونجی صاحب کی اردو زبان وادب سے محبت اور لگاؤ، اس کے لیے کی گئی کوششوں کا ذکر پڑھ کر کہیں آنکھیں بھیگ گئیں تو کہیں چشم نم مسکرا اٹھی۔ آپ بیتی 'یہ تو سچا قصہ ہے' اور سفرنامہ 'سرونج سے لندن تک' پڑھنے کی چاہ بڑھ گئی، سہ ماہی 'انتساب عالمی' کا آغاز، چار دہائیوں پر مشتمل اس کا ادبی سفر و خدمات کے بارے میں جان کر بہت خوشی ہوئی، جس نے سرونج میں ایک نئی روح پھونکی اور نہ جانے کتنے شاعروں وادیبوں کو زندگی عطا کی، سیفی صاحب سے ہونے والی اس قلمی ملاقات کا سہرا ماہنامہ 'اردو دنیا' کو جاتا ہے، جس نے سرونج کے سفر اور سیفی صاحب سے ملاقات اور ان کی لائبریری دیکھنے کی خواہش بیدار کر دی، سیفی لائبریری میں تقریباً پچیس ہزار کتابیں موجود ہیں جو میرے لیے یقیناً دلچسپی سے خالی نہیں ہوگی۔

علاوہ ازیں 'مجروح سلطان پوری کا ابتدائی ادبی سفر' امین حسن کا لکھا ہوا ہے، جس میں عمدہ پیرائے میں مجروح سلطان پوری کی زندگی کا سرسری جائزہ پیش کرتے ہوئے ادبی زندگی کا احاطہ کیا گیا ہے، اور حوالوں کی کثرت سے پختگی پیدا کرنے کی کوشش کی گئی ہے، اسی طرح 'مجروح سلطان پوری اور فلمی نغمے' کے عنوان سے سریتا چوہان نے ایک بہترین مضمون تحریر کیا ہے جس میں مجروح کی شاعری کے مختلف پہلوؤں کو اجاگر کرنے کے ساتھ، نغموں اور گیتوں کے حوالے سے سیر حاصل گفتگو کی گئی ہے، اور سابقہ دونوں مضامین ایک ہی سلسلے کی دو کڑیاں محسوس ہوتی ہیں۔

'اردو دنیا' کو ہمیشہ کی طرح عمدہ سرورق وطباعت سے آراستہ اپنے منفرد، معیاری اور معلوماتی مشمولات کے ساتھ پا کر بہت خوشی ہوئی۔ 'پہلی تخلیق پہلا تاثر' کا سلسلہ بھی پسند آیا اور امید ہے ایسے سلسلے قارئین کو متوجہ کریں گے اور لکھنے والوں کو حوصلہ بخشتے رہیں گے۔

ایس ایم حسینی، ندوہ کیمپس، ڈالی گنج لکھنؤ، اتر پردیش

پہلی تخلیق پہلا تاثر

رسائل وجرائد کسی بھی زبان کی ترویج واشاعت میں اہم کردار ادا کرتے ہیں۔ ان کی بدولت ادیبوں، شاعروں اور دیگر قلمکاروں کی تخلیقات کی قارئین ادب کی کثیر تعداد تک رسائی ممکن ہوتی ہے۔ کہنہ مشق اساتذہ اور مضمون نویسوں کی نگارشات کا مطالعہ کرنے سے نئی نسل کے ہونہار اور لائق طالب علموں کو بھی لکھنے کی تحریک ملتی ہے۔ آج کے نومشق قلم کاروں کی اگر حوصلہ افزائی نہیں کی جائے گی تو مستقبل میں صاحب

طرز ادیب اور قلم کار ملنا ناممکن ہے۔ ہر زبان کی طرح اردو زبان میں بھی بعض ایسے رسائل اور جرائد ہیں جو نومشق قلم کاروں کو موقع فراہم کرتے ہیں جس سے ان کو حوصلہ افزائی ہوتی ہے اور وہ اس سے تحریک پا کر اور بہتر لکھنے میں منہمک ہو جاتے ہیں۔ 'اردو دنیا' اس سلسلے میں سب سے زیادہ اہمیت کا حامل ہے۔ اس رسالے میں جہاں تجربہ کار اور منجھے ہوئے قلم کاروں کے مضامین شائع ہوتے ہیں وہیں نومشق قلم کاروں کی تحریروں کو بھی مناسب جگہ دی جاتی ہے۔ یہ امر اردو زبان وادب کے مستقبل کے لیے قابل ستائش ہے۔

ماہنامہ 'اردو دنیا' اردو زبان وادب کا ترجمان رسالہ ہے۔ میرے جیسے ہر نومشق قلم کار کی اس میں چھپنے کی خواہش ہوتی ہے۔ جون 2021 کا شمارہ دیکھتے ہی میری خوشی کی کوئی انتہا نہ رہی۔ اپنا نام مضمون نگاروں کی فہرست میں دیکھ کر یقین نہیں آ رہا تھا کیا واقعی میرا مضمون اردو دنیا میں شامل ہے۔ میں بی۔ اے کے طالب علمی کے دوران اس شہرت یافتہ اور ملک کے طول وعرض میں سب سے زیادہ پڑھے جانے والے اردو رسالے سے مانوس ہوا ہوں۔ اس میں شامل مشمولات کو بڑے انہماک سے پڑھنا میرا معمول بن گیا ہے۔ پی ایچ ڈی کے دوران میں نے بیسیوں مضامین لکھے جن میں بعض ملکی سطح کے رسائل وجرائد میں شائع بھی ہوئے ہیں، لیکن دل میں اردو دنیا میں چھپنے کی حسرت باقی تھی۔ جس نے مزید محنت کرنے کے لیے اکسایا اور میں بہتر سے بہتر کرنے کی کوشش میں جٹ گیا۔ ایک دن اپنا مضمون 'اکیسویں صدی میں اردو غزل کے امکانات کشمیر کے حوالے سے' اردو دنیا کو روانہ کر کے منتظر اشاعت رہا۔ چونکہ ادارے کو بے شمار مضامین موصول ہوتے ہیں اس لیے کچھ عرصے کے انتظار کے بعد میرا مضمون شامل کیا گیا ہے۔ الحمد للہ آج میرا وہ دیرینہ خواب پورا ہو گیا۔

مشتاق احمد گنائی، ساہمبورہ پانپور پلوامہ کشمیر

قلمکاروں سے چند معروضات

ماہنامہ 'اردو دنیا' علمی اور ادبی مجلہ ہے جس میں ادبیات، سماجیات، اقتصادیات، تہذیب وثقافت، تعلیم و تدریس، زبان ولسانیات، سائنس وٹکنالوجی، طب وفلسفہ، فنونِ لطیفہ، نفسیات، زبان کی زمینی صورت حال، عالمی ادبیات اور دیگر موضوعات پر مضامین شائع کیے جاتے ہیں۔ یہ خالص علمی اور ادبی نوعیت کا رسالہ ہے۔ اس میں مذہبی مباحث اور متنازعہ فیہ مسائل پر مضامین کی اشاعت کی گنجائش نہیں ہے۔ یہ رسالہ صرف 100 صفحات پر مشتمل ہوتا ہے۔ اس رسالے میں پوری اردو دنیا کے دانشوروں، ادیبوں اور قلمکاروں کی تحریریں اشاعت کے لیے موصول ہوتی ہیں۔ بہت سے مضامین اشاعت کے لیے منظور کر لیے جاتے ہیں لیکن بہت سی تحریریں اشاعت سے محروم رہ جاتی ہیں۔ بہ کثرت مضامین موصول ہونے کی وجہ سے ادارے کو بہت سی دقتوں کا سامنا بھی کرنا پڑتا ہے۔ اس لیے قلمکاروں سے گذارش ہے کہ اپنی تحریریں بھیجتے وقت مندرجہ ذیل امور کا بطورِ خاص لحاظ رکھیں۔

- مضمون غیر مطبوعہ ہو۔ کسی اخبار/مجلے میں ارسال نہ کیا گیا ہو اور نہ ہی اپنی یا کسی مرتب کردہ کتاب میں شامل ہو۔
- مضمون ادارے کے مزاج، معیار اور پالیسی کے منافی نہ ہو۔
- مضمون ان پیج پروگرام میں ہو اور 2500 (پچیس سو) الفاظ سے کم اور 4000 الفاظ سے زیادہ نہ ہو۔
- مضمون میں اعداد وشمار رومن میں لکھیں اور مضمون کے آخر میں حوالے/حواشی (کتب اور مضامین) کا اندراج ضرور کریں۔
- اچھوتے، نئے اور اہم موضوعات پر بھیجے ہوئے مضامین ترجیحی طور پر شائع کیے جائیں گے اور عمومی نوعیت کے مضامین کی اشاعت موصول ہونے کی ترتیب کے لحاظ سے کی جائے گی۔
- ایسے موضوعات یا شخصیات پر مضامین کی اشاعت ممکن نہیں جن پر بہ کثرت کتابیں یا مقالے شائع ہو چکے ہوں۔ ایسے موضوعات/شخصیات پر مضامین بھیجتے وقت چند سطروں میں نئے نکات اور نئے زاویے کی نشاندہی لازمی ہوگی۔
- جن مضامین میں زبان و بیان کی خامیاں اور حقائق، حوالے املا جملہ کی غلطیاں ہوں گی انھیں کسی بھی صورت میں اشاعت کے لیے منظور نہیں کیا جائے گا۔
- مضمون میں اشعار اور اقتباس کی صحت کا التزام اور ضرورت سے زیادہ اشعار اور اقتباسات سے پرہیز لازمی ہے۔
- شخصیات پر مضمون بھیجتے وقت متعلقہ فنکار کی تصویریں، کتابوں کا عکس اور دیگر ضروری معلومات ضرور ارسال کریں۔
- شہر یا ادارے پر لکھتے ہوئے اس سے متعلق تصاویر اور دیگر اہم معلومات لازمی بھیجیں۔
- درج ذیل تصدیق نامہ موصول ہوئے بغیر مضمون کی اشاعت پر غور نہیں کیا جائے گا:

''میرا مضمون غیر مطبوعہ ہے۔ کسی اخبار/ مجلہ/ اپنی یا مرتب کردہ کتاب میں شامل نہیں ہے۔ یہ کسی کتاب/مضمون کا سرقہ یا چربہ نہیں ہے۔ اگر کچھ نقص پایا گیا تو اس کے لیے میں خود ذمہ دار ہوں گا/ہوں گی۔''

- کسی دوسری زبان کا ترجمہ اصل متن کے ساتھ ارسال کریں اور مصنف کا اجازت نامہ بھی منسلک کریں۔
- مضمون میں پہلے یا آخری صفحے پر مضمون نگار کا نام، مکمل پتہ مع پن کوڈ (انگلش میں) اور موبائل نمبر ضروری ہے۔

مضمون کی حتمی منظوری ایڈیٹوریل ریویو کے بعد ہی دی جائے گی۔

قلمکار حضرات اخلاقی ضوابط Ethical guidelines کا پورا خیال رکھیں۔

—ادارہ

تحقیق کیسے کریں

غضنفر

تحقیق کے معنی و مبادیات اور طریقۂ عمل کو آسانی سے سمجھنے کے لیے ایک کلیدی لفظ 'تتکک' کو یاد رکھا جاسکتا ہے۔ یہ لفظ تین سوالوں کو جنم دیتا ہے:

1 تحقیق کیا؟ 2 تحقیق کیوں؟ 3 تحقیق کیسے؟

غور کیا جائے تو ان تینوں سوالوں کے جواب خود اس لفظِ تحقیق میں موجود ہیں۔ اس لفظ میں شامل پانچوں حروف پانچ بنیادی پہلوؤں کو سامنے لاتے ہیں یعنی:

حرفِ ت لاتا ہے: تلاش و تفتیش، تشریح و تعبیر، ترتیب و تدوین، تعلیق و تخریج، تاویل و تطبیق اور تحسین و تنقید کو

حرفِ ح لاتا ہے: حقائق، حواشی اور حوالے کو

حرفِ ق لاتا ہے: قوانین و قواعد اور قرینِ قیاس کو

حرفِ ی لاتا ہے: یقین اور یقین دہانی کو

اور حرفِ ق لاتا ہے: قدر و قیمت کو

ان پانچوں پہلوؤں کو سامنے رکھ کر دوبارہ جب کیا، کیوں، اور کیسے پر غور کریں تو

کیا کے لیے جو جواب ملے گا وہ ہے موضوع

کیوں کے لیے جو جواب حاصل ہوگا وہ ہے مقصد

اور کیسے کے لیے جو جواب سامنے آئے گا وہ ہے طریقۂ کار

ان جوابات کا مطلب یہ ہوا کہ تحقیق کا کوئی نہ کوئی موضوع ہوگا۔ یہ موضوع کوئی مصنف ہوسکتا ہے یا اس مصنف کی کوئی تصنیف۔ زبان و ادب یا علوم و فنون کا کوئی دور ہوسکتا ہے یا کوئی رجحان یا تحریک یا موضوع سے متعلق کوئی اور پہلو۔

اس موضوع پر تلاش و تفتیش، ترتیب و تدوین اور تشریح و تعبیر کا کوئی نہ کوئی مقصد ہوگا۔ یہ مقصد کسی مصنف کے ادبی یا علمی کارناموں کو دنیا کے سامنے لانا ہوسکتا ہے یا کسی تصنیف کو نئے اصولوں کی روشنی میں جانچنا اور پرکھنا ہوسکتا ہے یا کسی دور کے کسی ایسے پہلو کو منظرِ عام پر لانا ہوسکتا ہے جو ابھی تک اندھیرے میں رہا ہو یا اسی قبیل کا کوئی اور کام۔ اور اس موضوع سے متعلق حقائق کو سامنے لانے اور مقصد کو حاصل کرنے کا کوئی نہ کوئی طریقۂ کار بھی ہوگا۔ یہ طریقۂ کار موضوع کی ترتیب و تدوین بھی ہوسکتا ہے اور اس کی تعلیق و تخریج بھی۔ اس کا محاکمہ اور جائزہ بھی اور تنقیدی تجزیہ بھی۔ ان تینوں سوالوں کے جواب کو لفظ مَمَط سے یاد رکھا جاسکتا ہے:

مَمَط یعنی:

م: موضوع

م: مقاصد

اور

ط: طریقۂ کار

ان مختصر جوابات کی تفصیلات درج ذیل ہیں:

تلاش و تفتیش : تلاش و تفتیش سے مراد ہے موضوع سے متعلق مواد کی چھان بین، مواد ماخذ تک رسائی حاصل شدہ مواد کی روشنی میں تحقیق کے باقی مراحل پر غور و فکر۔

تشریح و تعبیر: کسی موضوع پر تلاش و تفتیش کے ذریعہ جمع کیے گئے مواد کے ایک ایک پہلو کو پھیلانا، ایک ایک نکتے کو کھولنا، اشاروں کو واضح کرنا، مبہم اور گنجلک باتوں کی وضاحت و صراحت کرنا، متنازعہ فیہ مسئلوں کا حل تلاش کرنا اور متون کی تہہ تک پہنچ کر موضوع و مواد کے موتیوں کو ڈھونڈ نکالنا تشریح و تعبیر ہے۔

تدوین و ترتیب: اس کے لغوی معنی ہیں جمع کرنا، مرتب کرنا۔ کسی مصنف کی کسی تصنیف کے مختلف نسخوں کا مقابلہ کرکے درست متن تیار کرنا یا کسی مصنف کی منتشر تخلیقات یا کسی تخلیق کے منتشر اجزا کو صحیح ترتیب سے جمع کرنا تدوین و ترتیب کہلاتا ہے۔ تدوین و ترتیب میں ساری توجہ اس بات پر ہوتی ہے کہ جو متن پیش کیا جارہا ہے وہ مصنف کی مرضی و منشا کے عین مطابق ہے یا نہیں اور اگر کچھ اشکال و اشتباہ ہیں تو اس صورت میں یہ کوشش ہوتی ہے کہ وہ مصنف کی منشا سے زیادہ قریب رہے۔ یعنی بہت دور نہ محسوس ہو۔

تحقیق میں متن کی تدوین کے علاوہ مضامین کی ترتیب بھی دی جاتی ہے۔ ترتیب میں اس بات کی کوشش ہوتی ہے کہ تمام مضامین یا مقالات کسی نہ کسی ترتیب میں رہیں اور ان کے درمیان منطقی ربط قائم رہے یعنی کس مضمون کو پہلے رکھا جائے اور کس کو بعد میں اور کوئی مضمون پہلے کیوں رکھا جارہا ہے اور کوئی بعد میں کیوں اس کا جواز بھی پیش کیا جائے۔ یہ ترتیب کئی اعتبار سے ہوسکتی ہے۔ مثلاً یہ بہ اعتبار ابجدی ہوسکتی ہے، تاریخ وار ہوسکتی ہے اور با اعتبار موضوع بھی ہوسکتی ہے۔

تعلیق و تخریج: تحقیق کی اصطلاح میں تعلیقات وہ یادداشتیں ہیں جو کتاب کے ضمیمے کے طور پر درج کی جاتی ہیں۔ اس ضمیمے کی ضرورت اس لیے پیش آتی ہے کہ متن میں کچھ ایسی باتیں بھی مذکور ہوتی ہیں جو مبہم اور مشکل ہوتی ہیں جن کی توضیح متن کی تفہیم لیے ضروری ہے۔ اس لیے کہ بعض اوقات توضیحات کی غیر موجودگی میں اصل مفہوم تک رسائی نہیں ہو پاتی۔ اسی بنا پر تحقیق میں تعلیقات نگاری پر خاصا زور دیا جاتا رہا ہے اور اسے متن کا لازمی جز سمجھا جاتا رہا ہے۔ دوسرے لفظوں میں کسی نسخے میں مندرج اصل معلومات میں جب ہم کسی دوسرے ذرائع سے کچھ اضافہ کرتے ہیں تو وہ تعلیقات کے ذیل میں آتا ہے۔ مثلاً کسی شاعر کا ذکر کسی تذکرے میں ہوا ہے لیکن اس کا سنہ وفات وہاں درج نہیں ہے۔ اگر بعد میں سالِ وفات کی تحقیق ہوجاتی ہے تو اس تذکرہ کی تدوین کے دوران سالِ وفات درج کردیا جاتا ہے لیکن اسے اصل متن میں نہیں بلکہ تعلیقات کے ذیل میں رکھا جاتا ہے اور اسے حاشیے پر درج کیا جاتا ہے۔ تعلیق سے کتاب کی اہمیت اور قدر و قیمت میں اضافہ ہوتا ہے۔ مواد و موضوع کی تفہیم و تنقید میں مدد بھی ملتی ہے۔ ساتھ ہی اس سے کتاب کی تاریخی اور ادبی اہمیت کا اندازہ بھی کیا جاسکتا ہے۔ اس سے مصنف کے علم و فضل کا اندازہ ہوتا ہی ہے اور اس کی کوتاہیوں کا بھی پتا چلتا ہے۔ اس کی اہمیت یوں بھی ہے کہ اگر تعلیقات نہ لکھی جائیں تو غلطیوں کا شمار بھی مدتوں علم کے درجے میں ہوتا رہے گا۔

تعلیق کی طرح تخریج بھی تحقیق کا ایک اہم حصہ ہے۔ یہ ایک بہت ہی کارآمد عمل ہے جس کے ذریعہ کسی مصنف کے کلام میں موجود دوسروں کے کلام کی نشاندہی کی جاتی ہے۔ اکثر مصنف اپنے بیان کو زیادہ دلچسپ معتبر، مستند اور وقیع بنانے کے لیے دوسری کتابوں یا دوسرے مصنفوں کے کلام سے اقتباسات استعمال کرتے ہیں۔ مثلاً بہت سے کتابوں میں قرآنی آیات، احادیثِ نبوی، مشہور و معروف اقوال، ضرب الامثال، اشعار وغیرہ کا استعمال بھی دیکھنے کو ملتا ہے۔ رقعات، ملفوظات، الغات

اور تاریخ کی تصنیفات میں خاص طور سے دوسرے کے کلام سے مدد لی جاتی ہے۔ انھیں آیات واقوال واشعار کی نشاندہی تخریج کے زمرے میں آتی ہے۔

تخریج کے عمل سے متن کی افادیت میں کئی اعتبار سے اضافہ ہوتا ہے۔ مثلاً اس کی وجہ سے متن کی صحت کا امکان بڑھ جاتا ہے۔ چونکہ اکثر متون کی بنیاد مخطوطات پر ہوتی ہے اور ایک مخطوطہ دوسرے مخطوطہ سے نقل ہوتا ہے اور اس نقل میں کاتب اپنی کم علمی اور کبھی بسیار علمی اور کبھی کبھی عجلت کے سبب زیادہ احتیاط نہیں برت پاتا اور جو بات اس کی سمجھ میں نہیں آتی اس کو اپنے حساب سے بدل دیتا ہے۔

تاویل وتطبیق: تحقیق کے دوران محقق کو بعض مقامات پر تاویلات کے عمل سے گزرنا ہوتا ہے۔ اس عمل میں کسی ظاہری معنی والے فقرے کو کسی مناسبت کی وجہ سے دوسرے معنی کی طرف منسوب کرنا ہوتا ہے۔ یعنی کسی بات کو دوسری طرح بیان کرنا یا کسی مسئلے کو اور طرح سے پیش کرنا یا کسی عبارت کا دوسرے طور پر مطلب بٹھانا تاویل کہلاتا ہے۔

تطبیق سے مراد کسی تحقیقی عمل کے دوران خطی نسخے یا متن کے دیگر نسخوں سے مطابقت پیدا کرنا ہے۔ تحقیق کے دوران محقق کو اساسی یعنی اوریجنل نسخے کے علاوہ دوسرے نسخوں کو بھی سامنے رکھنا ہوتا ہے۔ اصل نسخے اور دوسرے نسخوں کے تطابق کے دوران متن کے درمیان جو اختلاف سامنے آتا ہے اسے حاشیہ میں حوالہ کے ساتھ درج کردیا جاتا ہے۔ اس سے متن میں کتابت کے دوران جو تسامحات در آتے ہیں ان کی بھی نشاندہی ہوجاتی ہے اور نسخے کا کوئی لفظ یا فقرہ کسی وجہ سے اگر گنجلک، مبہم اور غیر واضح ہے تو اس کی اصل صورت بھی سامنے آجاتی ہے اور کسی وجہ سے کہیں پر کوئی لفظ چھوٹ گیا ہے تو دوسرے نسخوں کی مدد سے اس لفظ کو پھر سے لکھ دیا جاتا ہے۔ یعنی تحریر کی خالی جگہیں پُر ہوجاتی ہیں اور کھانچے ختم ہوجاتے ہیں۔

تحسین وتنقید: موضوع سے متعلق مواد کی تعریف اور پسندیدگی کے اظہار کا نام تحسین اور اس کی کمیوں اور خامیوں کی گرفت کا نام تنقید ہے۔ تحقیق کرتے وقت یہ دونوں پہلو بھی محقق کے سامنے رہتے ہیں اور اس کے اثرات تحقیقی نتائج میں بھی نظر آتے ہیں۔ اس حصے میں محقق مصنف کو اس کے علمی اور ادبی کارناموں پر جی کھول کر داد دیتا ہے۔ اس کی خوبیوں پر واہ واہ کرتا ہے۔ ساتھ ہی کمیوں، کمزوریوں اور کوتاہیوں کو بھی اُجاگر کرتا ہے، اس طرح وہ اپنے معروضی نقطۂ نظر کا ثبوت بھی فراہم کرتا ہے۔

ح: حقائق، حواشی اور حوالہ: تحقیق کے یہ تین ایسے امور ہیں کہ جن کے بغیر تلاش وتفتیش ترتیب وتدوین تشریح و تعبیر تاویل وتطبیق، تخریج وتعلیق اور تحسین وتنقید کا کوئی بھی کام مکمل نہیں ہوسکتا۔ اس لیے کہ تحقیق کی بنیاد حقائق پر رکھی جاتی ہے۔ حقائق وہ سچائیاں ہیں جو تحقیقی کام کو مکمل کرنے کے لیے نہایت تگ ودو، محنت ومشقت اور تلاش وجستجو کے بعد جمع کی جاتی ہیں۔ ان حقائق کی معنویت کو بڑھانے، انھیں واضح شکل وصورت دینے اور شک وشبہات کے غبار سے نکال کر مستند بنانے کے لیے حواشی لگائی جاتے ہیں۔ انھیں سچ کی کسوٹی پر پرکھنے کے لیے حوالے دیے جاتے ہیں اور اصل ماٰخذ تک پہنچنے کے لیے راستے ہموار کیے جاتے ہیں۔ حقائق کے ضمن میں محقق کے تین بنیادی کام ہیں:

1 نئے حقائق کی تلاش۔ 2 حقائق کی تصدیق یا تردید
3 حقائق کی تشریح وتعبیر

حقائق کے ذرائع: جن ذرائع سے حقائق تک رسائی ہوتی ہے وہ حسب ذیل ہیں:

- فن کار کے ہاتھ کے لکھے ہوئے نسخے
- فن کار کی یادداشتیں یا روزنامچے
- خطوط (ان میں مصنف یا فنکار کے خطوط کے ساتھ ساتھ وہ خطوط بھی شامل ہیں جو فنکار کے فن کے متعلق فنکار کو دوسروں کی طرف سے لکھے گئے۔)
- خودنوشت سوانح حیات
- اس کے خاندان، احباب، عزیز واقارب اور شاگردوں کی اس پر لکھی گئیں ادبی یا غیر ادبی تحریریں۔
- قانونی دستاویزات • معاصرین کی تحریریں
- مصنف کی سوانح حیات
- مصنف کے عہد کی ادبی تاریخیں، تذکرہ وغیرہ
- کتب ورسائل جو فن کار کے زیر مطالعہ رہے

حقائق کے نام پر جمع کیا گیا مواد کتنا سچ ہے؟ اس کی سچائی کے ثبوت کیا ہیں؟ یہ جاننے کے لیے اصل ماٰخذ تک پہنچنا اور اس کا حوالہ ضروری ہوتا ہے۔ کیوں کہ اس کے بغیر تحقیق شک وشبہات کے گھیرے میں آجاتی ہے۔ لہٰذا حقائق کا مستند ہونا اور اس کے لیے اصل ماٰخذ کا حوالہ حاشیے پر درج کرنا ضروری ہے۔ حوالے کے لیے ضروری ہے کہ بنیادی اور ثانوی دونوں طرح کے ماٰخذ درج کیے جائیں۔ حوالوں کے اندراج میں حوالہ نگاری کے اصولوں کو سامنے رکھا جائے۔ حواشی کا پوری طرح سے خیال رکھا جائے اور اس بات کی کوشش کی جائے کہ اصل متن اور حاشیے کے متن کا امتیاز باقی رہے۔

ق: قوانین وقواعد اور قرین قیاس: تحقیق کے لیے جمع کیے گئے حقائق کو کس طرح پیش کیا جائے؟ انھیں کس طرح ترتیب دیا جائے؟ کس بات کو کہاں اور کب لایا جائے؟ کس طرح استدلال کیا جائے؟ بہتر اور مناسب نتائج برآمد کرنے کے لیے کون سے اصول اپنائے جائیں؟ ان سارے کاموں کے لیے قوانین وقواعد یعنی اصول و ضوابط کا ہونا ضروری ہے۔ کیوں کہ ان کے بغیر کسی منطقی انجام تک نہیں پہنچا جاسکتا۔ تحقیق میں بعض اوقات ایسے مواد بھی شامل کرنے پڑتے ہیں جو مصدقہ حقائق تو نہیں ہوتے مگر ان کو اس طرح دلائل وبراہین کے ساتھ پیش کرنا ہوتا ہے کہ وہ قرین قیاس معلوم ہوں۔ یہ کام نہایت مشکل اور خطرناک ہوتا ہے مگر اچھے محقق اس کام کو آسان بنا کر پیش کرتے ہیں اور کسی بھی طرح کے خطرے کو قریب نہیں آنے دیتے۔

ی: یقین اور یقین دہانی: تحقیق میں اس بات کا خاص خیال رکھا جاتا ہے کہ تلاش وجستجو کے بعد موضوع سے متعلق جو بھی مواد سامنے آئے اس پر محقق پہلے خود یقین کرے اور اسے اس طرح سے پیش کرے کہ دوسروں کو بھی اس پر یقین آجائے۔ اس کے بغیر تحقیقی کام نہ تو محقق کے لیے یقینی بن سکے گا اور نہ ہی دوسروں کے لیے قابل یقین ہوسکے گا۔

ق: قدر وقیمت: تحقیق کا بنیادی مقصد یہ ہے کہ وہ موضوع کی قدر وقیمت کو سامنے لاسکے۔ حقائق کی اہمیت کو اجاگر کرسکے۔ اگر کسی جھوٹ پر سچ کا ملمع چڑھا ہوا ہے تو اسے اتار سکے، اس جھوٹ کی قلعی کھول سکے اور اگر سچ کو دبایا گیا ہے تو اسے ابھار کر سامنے لاسکے اور اس کی قدر وقیمت سے دنیا کو فائدہ پہنچا سکے۔

مذکورہ بالا پہلوؤں کی روشنی میں یہ کہا جاسکتا ہے کہ کسی تخلیق، تصنیف اور تالیف میں موجود حقائق کی تلاش و تفتیش، تشریح وتعبیر، ترتیب وتدوین، تخریج وتعلیق، تاویل و تطبیق کے ساتھ تحسین وتنقید اور تعین قدر کا نام تحقیق ہے۔ یعنی تحقیق نام ہے اس نظام کا جس کے ذریعے کسی موضوع سے متعلق تمام ماٰخذ کا پورے غور وخوض کے ساتھ مطالعہ کیا جاتا ہے اور اس کے تمام پہلوؤں کا مکمل نظم وضبط اور صبر وتحمل کے ساتھ جائزہ لے کر صحیح نتائج تک پہنچا جاتا ہے۔

تحقیق کے عمل میں دو چیزیں بہت ضروری ہیں۔ ایک مسلمات کی جانچ پرکھ ہے اور دوسری تشکیک۔ مسلمات کی جانچ پرکھ اس لیے ضروری ہے کہ اصل حقائق تک رسائی کے بغیر صحیح نتائج تک پہنچنا ممکن نہیں ہے اور تشکیک اس لیے ضروری ہے کہ اس کے بغیر تحقیق کے امکانات روشن نہیں ہوسکتے۔ اگر محقق کے ذہن میں شک و شبہات کا مادہ موجود نہیں تو اس پر تحقیق کے دروازے نہیں کھل سکتے۔ لہٰذا یہ ضروری ہے کہ تحقیق کے دوران اس کے ذہن میں شک وشبہات ...... پھوٹتے رہیں۔

مقاصد: جیسا کے اوپر ذکر ہوا تحقیق کیوں کا مطلب ہے تحقیق کا مقصد۔ یعنی تحقیق کے مقاصد کیا ہیں؟ یہ ضروری نہیں کہ ہر تحقیق کے مقاصد یکساں ہوں؟ الگ الگ تحقیق کے الگ الگ مقاصد ہوسکتے ہیں۔ لیکن کچھ بنیادی

مقاصد ایسے ہیں جو ہر تحقیقی کام سے جڑے ہوئے ہیں مثلاً:

- کسی بات کی تہہ تک پہنچنا۔
- حقائق کو صحیح تناظر میں پیش کرنا۔
- کسی مفروضے کو حقیقت کا جامہ پہنانا۔
- بکھرے ہوئے خیالات و تجربات کو ترتیب دینا۔
- کسی حقیقت کو ان کے ماخذ اور صحیح حوالے کے ساتھ سامنے لانا۔
- زمانے کی گرد میں دبی کسی چمکیلی شے کو باہر لانا۔
- دنیا کے نئے نئے حقائق سے واقف کرانا۔
- نئے حقائق کی روشنی میں زندگی کو نئی سمت دینا۔
- کسی موضوع کے صحیح خط و خال کو سامنے لانا۔
- کسی موضوع کی صحیح قدر و قیمت سے روشناس کرانا۔
- کسی موضوع کی صحیح سمت و رفتار متعین کرنا۔
- نئے نتائج برآمد کرنا۔
- نئے نقطۂ نظر سے موجود اشیا کو دیکھنا۔
- طلبہ میں تلاش و جستجو کی عادت ڈالنا۔
- طلبہ کی قوتِ ممیزہ کو بیدار کرنا
- قوتِ استدلال کو قوی بنانا۔
- منطقی نتیجے پر پہنچنے کی مشق کرانا۔
- دماغی محنت کی عادت ڈالنا۔
- صحیح اور غلط، بہتر اور کم تر اور اعلیٰ اور ادنیٰ میں امتیاز کرنے کی صلاحیت پیدا کرنا۔
- معروضیت اور موضوعیت کے فرق کی مشق کرانا۔
- اظہار کو علمی استدلالی اور معروضی بنانا۔

یہ ایسے مقاصد ہیں جو تحقیق کے سلسلے میں عمومی حیثیت رکھتے ہیں۔ان کے علاوہ تحقیق کے کچھ ایسے مقاصد بھی ہیں جن کا تعلق صرف تحقیق کے موضوع سے ہوتا ہے یعنی جو مخصوص ہوتے ہیں مثلاً:

- کسی مخصوص سچ کی تلاش کرنا۔
- پہلے سے موجود کسی نظریے کو رد کرنا اور اس کی جگہ کسی نئے نظریے کو سامنے لانا۔
- کسی گمنام فرد کے کارناموں کو منظر عام پر لانا۔
- کسی کتاب یا کسی فن کار کی فنی خصوصیات کی صحیح قدر و قیمت متعین کرنا۔
- کسی تصنیف، یا کسی صنف، یا کسی مصنف کے متعلق پھیلی ہوئی غلط فہمیوں کو دور کرنا۔
- گمنامی میں پڑے کسی انسان کے کارناموں کو سامنے لانا۔
- بدلے ہوئے حالات میں کسی مروجہ نظریے کی قدر و قیمت کا ازسرِ نو تعین کرنا۔
- کسی خاص دانشور، ادیب، مفکر، ماہر زبان کے خیالات، نظریات و افکار سے متعارف کرانا۔
- کسی دور کے محسوسات و خیالات، نظریات سے متعارف کرانا۔
- کسی مخصوص نظریے کی جانچ پرکھ کرنا۔
- کسی مخصوص ادیب و شاعر کے حیات و کارنامے کا جائزہ لینا۔
- کسی مخصوص شاعر یا ادیب یا کسی مصنف کے مقام کا تعین کرنا۔
- کسی غلط بات کو صحیح ثابت کرنا۔
- کسی نظریہ کو نئے انداز سے دیکھنا۔
- کسی مخصوص موضوع کی قدر و قیمت کا تعین کرنا۔

تحقیق کے طریقۂ کار پر گفتگو کرنے سے پہلے یہ جان لینا ضروری ہے کہ تحقیق کرنے والے کے اندر کن کن صفات کا ہونا ناگزیر ہے۔ محقق کو میرے خیال میں درج ذیل اوصاف سے متصف ہونا چاہیے:

* محقق کا ذہن منطقی ہونا چاہیے۔
* اس کے استدلال میں وزن ہونا چاہیے۔
* موضوع کے تمام اہم پہلوؤں اور نکات پر اُس کی نظر ہونی چاہیے۔
* اسے زیادہ تر ماخذ کا پتا ہونا چاہیے۔
* کس موضوع کے لیے کون سا طریقہ مناسب ہے اس کا بھی اُسے علم ہونا چاہیے۔
* موضوع کے تمام مباحث کو پھیلانے اور اُسے سمیٹنے کا ہنر آنا چاہیے۔
* حوالہ نگاری اور حاشیہ نگاری سے اچھی طرح واقفیت ہونی چاہیے۔
* اشاریہ کا ہنر آنا چاہیے۔
* کتابیات مرتب کرنے کے طور طریقوں کی جانکاری ہونی چاہیے اور
* رموزِ اوقاف اور مخففات کے استعمال کا بھی علم ہونا چاہیے۔

اگر مذکورہ بالا اصول و ضوابط کی روشنی میں تحقیق کا کام شروع کیا گیا تو یقیناً نتائج اچھے برآمد ہونگے اور کسی موضوع سے متعلق نئے گوشے سامنے آسکیں گے۔

3 طریقۂ کار: موضوع اور مقصد کے بعد تیسرا مرحلہ طریقۂ کار کا ہوتا ہے۔اس سے پہلے کہ تحقیق کے طریقۂ کار کی وضاحت کی جائے یہ جان لینا ضروری ہے کہ طریقۂ کار کو کیسا ہونا چاہیے؟ اس ضمن میں درج ذیل باتیں قابل غور ہیں:

- معروضی اپروچ • ایماندارانہ رویہ
- موضوعیت سے گریز • انصاف پسندی
- صداقت شعاری • صاف گوئی
- خطابت اور استعاراتی انداز سے اجتناب

2 موضوع کے انتخاب میں درج ذیل امور کو ملحوظ رکھا جائے:

- دلچسپی • ذہنی ہم آہنگی
- استعداد • زبان و بیان پر قدرت

طریقۂ کار کے مراحل: تحقیق کا کام جن مراحل سے گزرتا ہے وہ حسبِ ذیل ہیں:

پہلا مرحلہ: انتخابِ موضوع

دوسرا مرحلہ: ترتیبِ خاکہ

تیسرا مرحلہ: تقسیم ابواب: دیباچہ، ابواب، ماحصل

چوتھا مرحلہ: فہرستِ کتب و رسائل

پانچواں مرحلہ: مطالعہ اور نوٹنگ

چھٹا مرحلہ: نکات کی ترتیب

ساتواں مرحلہ: ایک ایک باب کی تکمیلیت

آٹھواں مرحلہ: تمام ابواب کا ماحصل

نواں مرحلہ: حواشی

دسواں مرحلہ: کتابیات

گیارہواں مرحلہ: اشاریہ سازی

تحقیق کی زبان

زبان اظہار کا مؤثر ترین وسیلہ ہے لیکن یہ وسیلہ مؤثر اسی وقت بن سکتا ہے جب یہ اپنے موضوع سے ہم آہنگ ہو۔ تحقیق ایک علمی کام ہے اور اس کا بنیادی مقصد وقت کی گرد سے حقائق کو نکال کر لوگوں تک پہنچانا اور اسے اس حد تک یقینی بنانا ہے کہ ان پر یقین کرنے میں کسی کو کسی طرح کا کوئی شبہ نہ رہ جائے۔ایسے موضوع کے لیے ایسی زبان ہونی چاہیے جو حقائق کو بغیر کسی ملمع اور ملاوٹ کے بے کم و کاست بیان کردے۔ تحقیق کی زبان کو لفظِ آواس کے ذریعہ سمجھا جاسکتا ہے یعنی:

آ= آسان و= وضاحتی

ا= استدلالی س= سائنٹفک

تحقیق کرنے والے کو زبان کی مختلف صورتوں کے فرق سے بھی واقف ہونا چاہیے۔ مثلاً: سادہ زبان اور رنگین زبان میں کیا فرق ہے؟ تخلیقی اور غیر تخلیقی زبان کا امتیاز کیا ہے؟ تفصیل اور اختصار کا فرق کیا ہے اور دونوں کے لکھنے کا طریقۂ کار کیا ہوتا ہے وغیرہ۔

تحقیق کے زبان و بیان کے سلسلے میں مندرجہ ذیل باتوں کا خیال رکھنا ضروری ہے:

1 زبان سادہ اور سائنٹفک ہو

2 اسلوب استدلالی ہو

3 زبان مرصّع اور مسجّع نہ ہو

■

Prof. Ghazanfar
'Bushra', Lane-A12, Hamza Colony
New Sir Syed Nagar extn.
Aligarh - 202002 (UP)

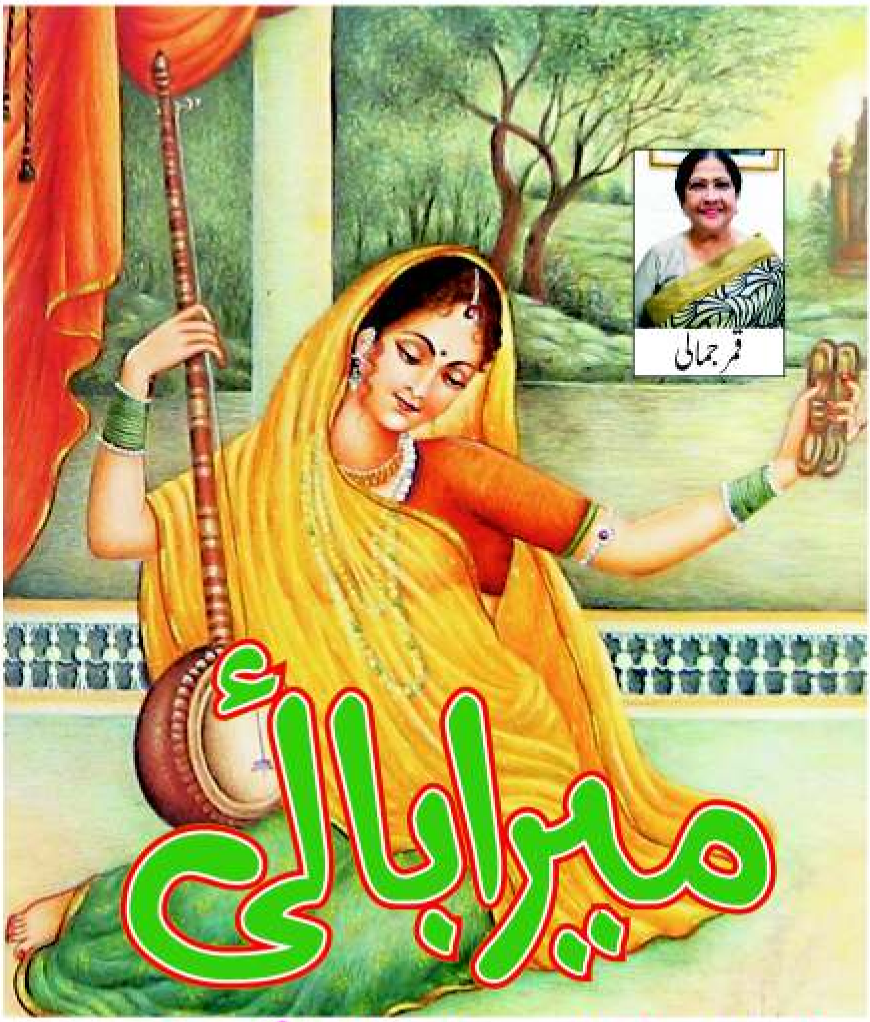

قمر جمالی

میرابائی

استغراق اور عرفانِ ذات کی شاعرہ

سولہویں صدی عیسوی میں مردوں کی اس وسیع وعریض مملکت میں ایک عورت بھی موجود تھی جس نے 'میں اور تو' کے سارے فاصلوں کو یکسر ختم کر دیا تھا،یہ خاتون تھی "میرابائی۔"

میرا کا جنم 1555 میں اس وقت کے میڑتا ریاست کے بانی راؤ دودا کے چوتھے بیٹے رتن سنگھ کے یہاں ہوا، راؤ دودا' جودھپور کے معمار راجہ راؤ جودھا کے بیٹے تھے، میرابائی' راؤ دودا کی پوتی اور راؤ جودھا کی پڑپوتی تھیں۔ ان کی پیدائش ناگور کے بالاجی گاؤں میں ہوئی۔ میڑتا کے راؤ دودا' ان کے بیٹے راؤ ویرم دیو، راؤ جے مل' سبھی شجاعت اور دلیری میں اپنا ثانی نہیں رکھتے تھے، یہ لوگ 'وشنو بھگت' کے روپ میں مشہور تھے۔ ہندوستان میں اس وقت بھکتی مومنٹ زوروں پر تھی، یہ وہ زمانہ تھا جب ہندوستان میں مغل حکومت قائم تھی اور روحانی منظر نامہ، صوفی' سنتوں سے بھرا پڑا تھا۔

ایک طرف......

رامانند کے چیلے؛ دھنان، پیپا سائیں، رائے داس، اور کبیر کے چیلے؛ سرت گوپال داس، جگن ناتھ، دوارکا، بھگوان داس، جیون داس اور دادو دیال' شمال اور جنوب میں سرگرمِ عمل تھے۔

دوسری طرف......

مغلیہ دربار میں ایرانی صوفیوں کی آمد نے ہندوستان کو مختلف مذہبی افکار وطریقت کی آماج گاہ بنا دیا تھا۔اسی سولہویں صدی عیسوی میں راجستھان میں میرابائی تزکیہ نفس کے مراحل سے گزر رہی تھی۔ میرابائی' سنت مسلک 'ویشنوا بھگتی مومنٹ' کی مویّد تھی جس میں لارڈ کرشنا کی پوجا کی جاتی ہے' جس کے ذریعہ وہ موکش یعنی نجات پانا چاہتی تھی۔

ایک تحقیق کے مطابق میرا نے بارہ سو۔تا۔تیرہ سو گیت لکھے جو اس کے عرفانِ ذات کے مظہر ہیں۔میرا کا فلسفۂ حیات دراصل فلسفۂ عشق ہے، جو فلسفۂ تصوف کا ایک جزو ہے،جس میں فنا۔فی اللہ کا رمز چھپا ہے اور جس میں جسم وجان کے رشتے "نہ میں"......"نہ تو" پر ختم ہو جاتے ہیں۔

میرا کی زندگی کی حکایات کہ کیسے وہ بھگوان کرشنا سے متاثر ہوئی سب جانتے ہیں۔وہ کوئی گوشت پوست کا انسان نہیں تھا۔ میرا کے عشق کی ابتداء ہی درونِ ذات سے ہوئی۔عشق کے سارے قرینے اس نے اسی بت سنگ کے ساتھ طے کیے،اور اسی میں اپنی ذات کو جذب کیا۔یہی سارے احساسات اس کی شاعری میں در آئے۔

میرابائی کی شاعری، دراصل عرفانِ ذات کی شاعری ہے جس میں طہارتِ ذات، عشقِ حقیقی اور داخلی جذبات کا ایسا طومار ہے کہ سننے اور پڑھنے والوں کو ان کے ذہن میں جگ مگ کرتی بیشمار کرنیں پھوٹتی محسوس ہوتی ہیں۔ میرا کے ہاں محبت ابتدا بھی ہے' محبت انتہا بھی ہے۔

محبت ہی بقا ہے اور محبت ہی فنا ہے۔

یہی وجہ ہے کہ اس کی شاعری میں روحانیت کا وہ سلسلہ جو زیریں لہر میں بہتا محسوس ہوتا ہے،اس کے محبوب کو کوئی ماورائی یا اساطیری روپ نہیں دیتا بلکہ اسے وہ اپنے ساتھ ایک زندہ وجود محسوس کرتی ہے اور اس کے ساتھ جینے اور اسی کے ساتھ مرنے کا ذکر کرتی ہے۔ اگرچہ میرا کے داخلی جذبات میں بشریت کے ظاہری جذبات کا اظہار ہوتا ہے مگر اس کے جذبۂ خود سپردگی میں ایک تقدس، ایک نہایت ہی پاکیزہ احساس کی موجودگی کا ادراک بھی ہوتا ہے۔

میرا کا محبوب جو اوروں کے لیے پتھر کا خدا ہے، جسے ہندو مذہب میں بھگوان کرشنا کہا جاتا ہے' اس کے لیے محض ایک پیکرِ جمال ہے،ایک ایسا فینومینا ہے جسے وہ کئی ناموں سے پکارتی ہے،کبھی بالا کرشنا،کبھی گردھاری، کبھی لالہ، کبھی ہری، کبھی نندلال، موہن، رگھو ناتھ، مراری، کنوڈو، کانہا،کنہیا،شیام،شاما دیو،گردھر اور گووندا۔ کمال یہ ہے کہ وہ اسے نشاط اور الم یعنی ہر تجربے میں ایک نئے روپ میں دیکھتی ہے اور یاد کرتی ہے، جیسے

مکھن چُراتے ہوئے......ماکھن چور
گائے چُراتے ہوئے......گووند، گوپال
تر بھنگا کا نقش اُبھارتے ہوئے......بنسی بجیا
گووردھن پہاڑ کو شہادت کی انگلی پر اُٹھاتے ہوئے
......گری دھر
ہولی کھیلتے ہوئے......شیام

راس لیلا میں ایک ساتھ کئی پیکروں کو لیے گوپیوں کا ہاتھ تھامے جمنا تٹ پر مستانہ وار گھومتے ہوئے......میرا نے اُسے ایک قوت سے تعبیر کیا ہے اور اسے پانے کی چاہت کو بڑی شدت سے ظاہر کیا ہے۔کبھی کبھی تو اس حد تک، کہ لگتا ہے میرا نے کرشن کو اپنے اندر جذب کر لیا ہے۔ یہ حقیقت بھی ہے کہ کرشن اُس کے وجود میں اندر کہیں رچا بسا ملتا ہے،اسی لیے اس کی شاعری میں وصال

کا ذکر ایک جرأت انگیز تجربے کی طرح ابھرتا ہے۔ زندگی کے یہی وہ نادیدہ اور ناآسودہ جذبات اس کی شاعری میں توانائی بن کر دوڑتے ہیں۔ میرا کی شاعری میں لفظ اور آواز کا آہنگ لہروں کی روانی کی طرح ایک سیلِ رواں کی صورت اس کے وجود کو سیراب کرتا ہوا سننے والوں کے دلوں میں کائناتی عرفان کو بیدار کرتا ہے۔

اس کا ایک گیت ملاحظہ کیجیے۔

ہولی پیا بن لاگری کھاری
سنو گاؤں دیس سب سنو
سونی سیج اٹاری
سونی برہن پیت بنا ڈالے
تج گیا پیو پیاری
برہا دکھ ماری

'فراق اور جدائی' میرا کے کلام کا بنیادی وصف ہے، حق تو یہ ہے کہ میرا 'ویوگن' (یعنی ایسی عورت جو اپنے محبوب سے الگ ہے) کے تجربوں کی ممتاز شاعرہ ہے۔ فراق کے سارے جذبے: غم، غصہ، شکوے، شکایت، اضطراب، بے چینی، بے خوابی، بے اعتباری، وسوسے، اندیشے، یہ سارے جذبے میرا کی شاعری میں المیے کی شکل میں نہیں بلکہ انبساط کی شکل میں موجود ہیں جو ایک انہونی سی بات ہے۔ خصوصاً میرا کے نشاطیہ نغموں میں اس پر سرمستی کا عالم ہوتا ہے یہاں تک کہ 'ضم' کا پہلو نمودار ہونے کے قریب ہے، لیکن ایسا نہیں ہوتا، کیونکہ میرا کی معصومیت اُسے پاکیزگی کا پیرہن عطا کرتی ہے۔

دراصل میرا بائی کے کلام کی روحانیت، تحت الشعور کی پوشیدہ آرزوؤں اور تمناؤں کی کسمساہٹوں کو نمایاں کرتی ہوئی روحانیت کی تکمیل ہے، محبوب کو پانے کی چاہت جب غم کی تہوں سے نکل کر نشاط و انبساط تک پہنچتی ہے، تو وہاں اس کے لیے ایک منفرد پیکر تراشتی ہے، اور میرا کی شاعری ملن اور فراق کا ایک عجیب اور منفرد آہنگ پیدا کرتی ہے جس کے ارتعاش پر میرا مست ہو کر ناچتی ہے، اس وقت اسے یہ احساس نہیں رہتا کہ اس کا محبوب محض ایک تصور ہے، ایک فینومینا ہے، ملاحظہ کیجیے۔

آیا مورے انگنا ــــ پھر گیا میں جنوا کھوئے
ہری پدھارا انگنا گیا ــــ میں ابھاگن سوئے
داسی میرا لالہ گردھر ــــ ملتا بچھڑیاں کوئے

ایک اور گیت کا ٹکڑا:

تم بن موری کون کھبر لے ــــ گووردھن گردھاری

بیراگن کے روپ میں میرا کے عشق میں ایسی قلندری اور سرمستی ہے کہ تیز و تند احساسات میں جسم اور روح کی سرحدیں ایک دوسرے میں مدغم ہو گئی ہیں۔ یہ عشقیہ شاعری کی معراج ہے۔

ع جب سے تم بچھڑے ہو پربھو
ع درد کی ماری بن بن ڈولوں
ع میرو من موہنا آئیو
ع بادل دیکھ ڈری میں شام...... وغیرہ وغیرہ

میرا عشق کی لذت آمیز اور لمسیاتی کیفیتوں کی شاعرہ ہے جو عشق میں گرمیِ عشق اور لحن کو ترنم ریز بناتی ہے۔

وصل کی آرزو ایک غیر معمولی آرزو ہے جو ہجر اور فراق کے کرب انگیز لمحوں میں پیدا ہوتی ہے، مگر یہ جذبہ میرا کے اندر حزن و یاس کا سبب نہیں بنتا بلکہ اسے تقویت بخشتا ہے اور اس کی رگ و پے میں توانائی بن کر دوڑتا ہے۔

ملاحظہ کیجیے۔

باجیا جھانج مردنگ مرگیا
باجیا کر یک تارو
آیا پسند پیا گھر تیاری
موہری پیرا بھاری
شیام کیاری بساری
تاری ارج کراں گردھاری
رکھیو لاج ہماری
تیرا رے پربھول جائے مادھو
جنم جنم دی کنواری
منے لاگی سرن تاری

اس گیت میں میرا کے داخلی جذبات شدت اختیار کر گئے ہیں، جہاں اظہارِ ذات...... عرفانِ ذات تک پہنچ جاتا ہے۔

اور میرا...... اپنے جنم جنم سے کنواری رہنے اور اپنی دوشیزگی کی دُہائی دے کر گردھاری سے عرض کرتی ہے:

''ہر طرف رنگ بکھرے ہیں پر میری سیج سونی ہے، ڈھول تاشے، جھانجھ کی آوازیں فضا میں بکھری ہیں مگر سب بیکار ہیں، اے گردھاری! میری لاج رکھ، اپنی تمام تر آرزوؤں کے ساتھ تیرے انتظار میں ہوں۔''

میرا نے اپنے نغموں میں بار بار اپنی خود سپردگی کا اعلان کیا، حالانکہ وہ جانتی ہے اس کا محبوب اس کے بیاہتا شوہر راجہ بھوج راج (چتوڑ کے راجہ مہارانا سنگرام سنگھ کے بڑے بیٹے*) کی طرح گوشت پوست کا انسان نہیں ہے۔ یہی وہ مقام ہے جہاں میرا کا عشق 'عرفانِ ذات کی کڑیوں سے مل جاتا ہے اور میرا اپنی ذاتِ فانی کو ذاتِ باقی میں ضم کرنے کی آرزو کرتی ہے اور یہاں میرا کا فلسفۂ حیات نہایت معصوم، مگر بہت گمبھیر ہو جاتا ہے، وہ اپنے وجود کو مدغم ہوتے کھلی آنکھوں سے دیکھتی ہے اور پاؤں میں گھونگرو باندھ کر......

ع پگ گھونگرو باندھے میرا ناچے رے

ناچتی ہے، اور...... محسوس کرتی ہے کہ اس کا محبوب دبے پاؤں اس کے گھر آتا ہے۔ دیکھیے۔

گردھر مہارو ساتھی پریتم   دیکھت روپ لبھاؤں
رین پڑے تبھی سو جاؤں   بھور بھئے تب اٹھ جاؤں
جو پہرو دے سوئی پہروں   جو دے سوئی کھاؤں
میری ان کی پریت پرانی   اُن بن پل نہ رہاؤں
جہاں بٹھاوے تبھی بیٹھوں   بیچے تو بک جاؤں
میرا کے پربھو گردھر ناگر
بار بار بول جاؤں

میرا بائی نے جن جذبوں کے تحت اپنے دیوتا کو اپنا پتی مان کر پوجا کی ان جذبوں کو ہندو دھرم وِدوانوں نے 'نودھا بھگتی' کا نام دیا۔ ملاحظہ کیجیے۔

پنتھ نہاروں، ڈگر بوہاروں، اودھی مارگ جوئی
میراں کے پربھو، کب رے ملوگے، کم ملیا سکھ ہوئی

ہیری میں تو درد دیوانی، میرو درد نہ جانے کوئی
گھائل کی گتی گھائل جانے، کی جن لائی ہوئے

درد کی ماری بن بن ڈولوں، وید ملیا نہ کوئے
میرا کے پربھو پیڑ مٹے جب، وید سانولیا ہوئے

چونکہ میرا کا عشق بے ریا اور شفاف ہے اس لیے بیباک ہے۔ میرا بائی نے سیکڑوں گیت لکھے جو اس کے من بھاون جذبوں سے سرشار ہیں، جن میں اس کی ذات کا اظہار ہے، کائنات کا عرفان ہے۔

میرا سولہویں صدی کی ایک ایسی شاعرہ ہے جس نے اپنے نغموں کو لحن بھی دیا اور آہنگ بھی اور اپنی فکروں سے فنا فی اللہ کی راستے کی نشاندہی بھی کی۔

میرا بائی نے نہایت مختصر حیات پائی، 1604 میں صرف 48/49 سال کی عمر میں انتقال کر گئی، اس مختصر حیات میں میرا نے فلسفۂ عشق کا ایک ایسا باب کھولا جو صدیوں سے زیرِ بحث رہنے کے باوجود بھی مزید بحث طلب ہے۔

■

Qamar Jamali
H. No.: 4-5, Himagiri Nagar Colony
Gandamguda
Hydershahkote (Post)
Hyderabad - 500091 (Telangana)
Mob.:9985503977

1 میرا کی شادی 1557 میں میواڑ کے راجہ مہاراجہ سنگرام سنگھ کے بڑے بیٹے راجہ بھوج راج سے ہوئی اور چھ سال بعد راجہ بھوج راج کا انتقال ہو گیا اور میرا بیوہ ہو گئی۔

حسرت کا شاعرانہ کردار

قیصر زماں

حسرت موہانی بڑے غزل گو تھے اور غزل کے رسیا بھی، شاید اسی لیے غزل کے ذکر کے ساتھ حسرت کی یاد بے اختیار آتی ہے۔ حسرت صرف تغزل اور شعر کی بوقلمونیوں میں کھو کر نہیں رہ گئے بلکہ انھوں نے زندگی کی بصیرت بھی حاصل کی اور کشاکش حیات سے نبرد آزما بھی ہوئے۔ حسرت کے مطالعے میں ہم صاف طور پر دو قسموں کے رجحانات سے دو چار ہوتے ہیں۔ ایک قسم تو ان کے رجحانات اور خیالات کی ہے جس سے ہمارے سامنے شاعر اور فنکار حسرت کا تصور ابھرتا ہے اور دوسری قسم کے رجحان 'آدمی حسرت' کی تصویر ہمارے سامنے پیش کرتے ہیں۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ حسرت دونوں ہی مقام پر اپنے عہد کے اکثر ہم سفروں سے ممتاز نظر آتے ہیں، حسرت کی یہی خوبی میرے خیال میں ان کی مقبولیت اور جاودانی کا سبب بنی، ان کی غزلوں میں ہمیں شاعر اور فنکار حسرت کے ساتھ 'آدمی حسرت' بھی چلتا پھرتا دکھائی دیتا ہے اور یہی 'آدمی' حسرت کی شاعری کو زندگی اور شاعرانہ فکر و بصیرت عطا کرتا ہے۔

حسرت کی غزلوں میں شعر و شباب کے ذکر کے شانہ بہ شانہ عصری حسیت کی ترجمانی کا رجحان بھی صاف صاف نظر آتا ہے۔ حسرت نے زندگی کو قریب سے دیکھا تھا اس لیے انھوں نے عارض و رخسار کے ساتھ ساتھ سنگریزے بھی جمع کیے، زلف و کاکل کے ساتھ 'چکی کی مشقت' کا تصور بھی پیش کیا۔ دراصل حسرت کی شاعری کا یہ رویہ یا رجحان ان کے عہد کا تقاضا تھا۔ ملک کی غلامی، ہم وطنوں کا استحصال، ظلم و تشدد کے پھیلتے سائے میں حسرت کی شاعری پروان چڑھی۔ ان کے سامنے وطن کا ماضی جہاں پر شکوہ تھا وہیں خاک و خون آلود بھی۔ 1857 کے انقلاب کی ناکامی کی تصویر ان کے ذہن پر چھائی ہوئی تھی لیکن دوسری جانب ان کی فطرت میں جذب و شوق کا عنصر بھی موجود تھا۔ چنانچہ ان کی شاعری دونوں جذبوں کی مفاہمت کی شکل میں نمودار ہوئی۔ حسرت کی وہ شاعری جو انھوں نے اپنی جوانی میں کی، اس میں حسن و محبت کی داستان طرازی، جذب و شوق کا اظہار اور روحانی و جمالیات تجربات کے نقوش ملتے ہیں۔ ان کی شباب کی غزلوں میں جذبوں کا گرم لہو رواں ملتا ہے۔ چنانچہ ان کی ابتدائی غزل بقول نیاز فتح پوری ان کی پہلی غزل ہے۔ جو عشق و سرمستی کی روداد معلوم ہوتی ہے اور شاعرانہ مرتبے کے کمال کو چھوتی ہوئی محسوس ہوتی ہے۔ اگرچہ ان میں ان کے شعور و ادراک کی ناپختگی کی علامت بھی موجود ہے۔

مسجدوں میں کون جائے واعظا اب
تو اک بت سے ارادت ہو گئی
عشق نے ان کو سکھا دی شاعری
اب تو اچھی فکر حسرت ہو گئی

اس غزل کو نیاز فتح پوری نے طفلانہ فکر کا نمائندہ قرار دیا ہے اور یہ بھی بتلانے کی کوشش کی ہے کہ یہ غزل دراصل اس بات کا اشاریہ ہے کہ ابھی حسرت کی شاعری 'حسرت تعمیر' کے مرحلے میں ہے۔ اس پر کسی عمارت کا پرشکوہ علم بلند نہیں ہوا ہے۔ یہ پہلی غزل ہے جو 13-14 سال کی عمر میں کہی گئی تھی۔ اس میں جو رنگ و آہنگ ہے اس سے نہ صرف حسرت کی شاعرانہ فطرت کی غمازی ہوتی ہے بلکہ یہ بھی کہ حسرت کی شخصیت میں جس طرح سیاست کی جڑیں بہت گہری تھیں اسی طرح شاعری بھی ان کی شخصیت کا لازمی جزو تھا۔ یہاں مجھے خلیق انجم کی اس رائے سے اتفاق نہیں کہ حسرت کا مزاج شاعری سے زیادہ سیاست سے لگاؤ رکھتا تھا اور ان کو شاید سیاست کے لیے ہی بنایا گیا تھا۔ میں تو یہ سمجھتا ہوں کہ شاعر حسرت اور سیاست داں حسرت دونوں متوازی طریق پر پیکر خاکی میں جمع ہو گئے تھے اور اپنے اپنے مواقع پر دونوں کا اظہار ہوا۔ ان دونوں میں حسرت کو ان کی منفرد صلاحیتوں کی وجہ سے پوری کامیابی حاصل ہوئی۔ رشید احمد صدیقی نے ان کی شاعری پر اپنی رائے اس طرح دی ہے کہ "معاصر غزل گو بھی اپنا اپنا مقام رکھتے ہیں پھر بھی حسرت کی غزل گوئی ممتاز اور منفرد ہے۔" احتشام صاحب کا خیال ہے کہ "حسرت موجودہ دور کے سب سے بڑے غزل گو تسلیم کیے گئے ہیں اور اردو شاعری کے مسلسل ارتقا میں ان کی ایک اہم جگہ ہے۔" سرور صاحب نے تو انھیں اردو شاعری کے دوسرے دور کا سب سے بڑا کلاسیکی شاعر تسلیم کیا ہے۔

رشید احمد صدیقی، سید احتشام حسین اور سرور صاحب کے خیالات کی روشنی میں یہ کہا جا سکتا ہے کہ حسرت کی شاعرانہ حیثیت کسی جہت سے کمزور نہیں تھی۔ یہ ایک الگ مسئلہ ہے کہ حسرت کی غزلوں میں مضامین اور موضوعات کی رنگارنگی نہیں ملتی۔ ان کی شاعری کا جو بہترین حصہ ہے اس میں داستان حسن و عشق کا یک رنگا دھارا بہتا ہوا معلوم ہوتا ہے۔ اس کی وجہیں خواہ کچھ بھی ہوں متقدمین کی پیروی یا رجحان طبع، مگر ہے کچھ ایسا ہی۔

حسن و عشق کے موضوع سے حسرت کو خاصا ربط تھا، وہی موضوعات سیاسی بصیرتوں اور انقلابی جذبوں کے پیدا ہونے تک حسرت نے جو شاعری کی اس میں حسن و عشق کے معمولات کو بیان کرتے رہے۔ ہجر و وصال کی قدیم روایت کو دہرانے کا عمل ان کی شاعری میں جاری رہا۔ 1893-1903 تک کی پوری شاعری اسی نہج پر نظر آتی ہے۔ مثلاً

نہ ہو مجھ سا کوئی محو تمنا ہوا کرتی ہے باتیں دل سے کیا کیا
ہوا حسرت مجھے پھر شوق صحرا، جنوں نے پھر مجھے سمجھا دیا کیا

میری نگاہ شوق کا شکوہ نہیں جاتا
سوتے بھی وہ پاس سے دیکھا نہیں جاتا

1903 کے بعد کی غزلوں کا رنگ بھی رومانی شاعری کا نمائندہ نظر آتا ہے اور اس میں بھی حسرت کے سیاسی شعور اور تقاضے کے اشارے نہیں ملتے، اس دور کی شاعری میں بھی حسرت انہی موضوعات کی طرف متوجہ رہے جو خالص رومانی اور روایتی ہیں۔ مثلاً

رونق پیرہن کوئی خوبی جسم نازنیں
اور شوخ ہو گیا رنگ ترے لباس کا

اس دور کی ایک غزل اس عہد میں بھی اور آج تک زبان زد خاص و عام ہے۔

بڑھ گئی تم سے تو مل کر اور بھی بے تابیاں
ہم یہ سمجھے تھے کہ اب دل کو شکیبا کر دیا
سب غلط کہتے تھے لطف یار کو وجہ سکوں
درد دل اس نے تو حسرت اور دونا کر دیا

غرض یہ کہ حسرت کی شاعرانہ عظمت اپنی جگہ تسلیم، ان کی اچھی شاعری کا یک رخا پن بری طرح کھٹکتا ہے اور ایسا

محسوس ہوتا ہے کہ حسرت نے اردو غزل کو جو کچھ دیا اس میں نئے پن کی تخلیق کی بجائے اساتذہ کا رنگ و آہنگ برتنے میں ہی انھوں نے عافیت سمجھی اور اسی رنگ سے اپنی پوری شاعری کا مزاج تیار کیا۔ خلیل صاحب نے حسرت کی شاعری پر لکھتے ہوئے ایک اہم نکتے کی نشاندہی کی ہے اور لکھا ہے کہ:

''قدیم شعرا کے دواوین کی چھان بین جس ذوق و شوق سے حسرت نے کی تھی اور صف دوئم اور صف سوئم کے شعرا کے اچھے اشعار کا انتخاب جس خوبی سے پیش کیا وہ ان کا قابل قدر کارنامہ ہے۔ حسرت نے ان تمام شعرا سے فائدہ اٹھانے کی کوشش کی۔ ان کے یہاں تمام رنگوں کی جھلکیاں ملتی ہیں اور شعرائے قدیم کے دستور کے مطابق ذ، ظ، ض اور ط وغیرہ کی ردیفوں میں بھی غزلیں کہنے کی کوشش کی ہے۔''

حسرت کا کلام پڑھ کر یہ اندازہ ہوتا ہے کہ وہ صرف دوئم درجے کے شعرا کا رنگ کامیابی سے نباہ سکے ہیں۔ ان کا مزاج میر، غالب یا صف اول کے شعرا سے ہم آہنگ نہیں ہے۔ تتبع کوئی بری چیز نہیں لیکن تتبع میں بھی تخلیق اور جدت طرازی کی جا سکتی تھی۔ جن غزلوں کو حسرت نے محض زلف و رخسار کی عبارت آرائی کا رنگ دیا ہے۔ ان میں روح عصر کے تقاضے بھی شامل کیے جا سکتے تھے۔ حسرت اگر ایسا کرتے تو صرف ان کی شخصیت پر نہیں بلکہ اردو شاعری پر بھی بڑے گہرے اور مثبت اثرات مرتسم ہو سکتے تھے لیکن حسرت کسی نئی منزل کی تلاش نہ کر سکے اور غزل کے روایتی مزاج سے ہی وابستہ رہے۔ دراصل حسرت کی فطرت میں عشق جنوں ساماں نے گھر کر لیا تھا اور تجربۂ عشق سے اپنے وطن موہان ہی میں آشنا ہو چکے تھے۔ حسرت کا یہ عشق ان کا جذبۂ پرستش زندگی کے ہر ہر قدم پر ان کے ساتھ رہا۔ ضمیمہ دیوان کی غزلیں ان کے پورے تجربات محبت کی غمازی کرتی ہیں۔ موہان کے قیام کے زمانے میں حسرت نے جتنی بھی غزلیں کہیں ان کی جنوں خیزی، عشق کی تندی و سرمستی ہی ملتی ہے، لیکن حسرت ہمیشہ انھی جذبوں سے بندھے نہ رہ سکے اور 1903 کے بعد ان کی طبیعت نے دوسرا رخ اختیار کیا۔ جسے ان کی شاعری کا دوسرا موڑ بھی قرار دیا جا سکتا ہے اور یہاں ان کی شاعری کا موضوع ان کے عہد کا مزاج، مطالبہ اور عصری حسیت کا اعلامیہ نظر آتا ہے۔ حسرت نے اس زمانے کی تحریکات کو سمجھا، قومی یا ملکی مسائل نے انھیں اپنی طرف متوجہ ہونے پر مجبور کیا، یہیں سے حسرت کا شعری مزاج نئے شاہ راہ کی تلاش کرتا ہوا دکھائی دیتا ہے۔ اب صرف نالۂ فراق یا ہجر و وصال کا ذکر نہیں رہا بلکہ اس میں ایک قسم کی حقیقت شناسی اور احساس فرض کا اظہار بھی دکھائی دیتا ہے۔ وہ اپنی ایک غزل میں اس انحراف کا اعتراف کرتے نظر آتے ہیں۔

سر سے سودائے بتان بے وفا جاتا رہا
ہو گیا دل اب ولائے شوق سے رشک چمن
بے خودی ہائے محبت سے نہیں کچھ واسطہ
ہم سمجھتے ہیں اب ایسے شوق کو دیوانہ پن

1903 کے بعد کی ایک اور غزل حسرت کے اس فکری انقلاب کی نمائندہ معلوم ہوتی ہے۔

توڑ کر عہد وفا ناآشنا ہو جائیے
بندہ پرور جائیے اچھا خفا ہو جائیے
جی میں آتا ہے کہ اس شوخ تغافل کیش سے
اب نہ ملیے پھر کبھی اور بے وفا ہو جائیے
بھول کر اس ستم پرور کی پھر آئے نہ یاد
اس قدر بے گانۂ عہد وفا ہو جائیے

غرض کہ زندگی کے اس حصے میں حسرت نے اپنی فکری اور فنی بصیرتوں کے واردات کو اظہار کا ذریعہ بنایا اور خود کو ملک کی آزادی، انسانی آزادی اور خاص طور پر استحصال کے شکار طبقات کی آزادی کے لیے وقف کر دیا۔ زندگی کے اس مرحلے میں حسرت نے بڑا ہی جرأت مندانہ اقدام کیا اور معاشرے میں پھیلی ہوئی ایسی تمام رسموں کے خلاف آواز اٹھائی جنھوں نے انسان کو یا معاشرے کو کسی بھی طرح اذیت میں مبتلا کر رکھا تھا۔ اس دور کے حسرت پر زندگی اور اس کا نصب العین حاوی اور غالب رہا۔ ہم اس حسرت کو یاد رکھ سکتے ہیں جس نے زندگی کی ترجمانی اور اس کی افزائش کا بہترین فریضہ انجام دیا۔ اور یہ بھی کسی کارنامے سے کم نہیں۔

حسرت کی اس زندگی کا آغاز 'اردوئے معلّی' کا پہلا شمارہ تھا جو یکم جولائی 1903 کو شائع ہوا تھا۔ رسالے کے سرورق پر سید فضل الحسن حسرت موہانی (بی اے) درج تھا۔ یہیں سے حسرت کی سیاسی اور عملی زندگی شروع ہوتی ہے۔ 'اردوئے معلّی' کے عہد میں سر عبدالقادر کا 'مخزن' نوبت رائے نظر کا 'خدنگ نظر' بھی موجود تھا۔ لیکن ان ماہناموں کے ہوتے ہوئے بھی حسرت موہانی کے 'اردوئے معلّی' نے بہت زیادہ مقبولیت حاصل کی، اس مقبولیت کی وجہ خود حسرت کی ذات تھی اور سب سے اہم وجہ یہ تھی کہ حسرت نے 'اردوئے معلّی' سے اصلاح ذوق کا کام لینا چاہا تھا۔ اسی لیے اس میں کسی قسم کی غرض مندانہ سیاست نہ تھی اور یہی وجہ ہے کہ حسرت کا ماہنامہ اپنے مقاصد میں بے حد کامیاب رہا۔ حسرت نے قوم کے ذہن و مزاج کی اصلاح کو اپنا نصب العین بنایا تھا۔ حسرت اپنے اس مقصد میں کامیاب رہے اور ایک ایسا طبقہ بہرحال بنا جس نے قدیم روایتی طرز فکر کے بجائے زندہ اور متحرک فکر کی ترجمانی کی، اور اس طرح حسرت موہانی نے زلف و محبوب کی سج دھج کے ساتھ ملک و قوم کے ذہن و دماغ کی نشو و نما میں بھی تاریخی کردار پیش کیا۔ حسرت کی اس عملی زندگی میں سب سے بڑی چیز ان کی سچائی اور بے مثال انسانی ہمدردی تھی۔ انھوں نے کبھی بھی ظلم کے خلاف مصلحت بینی اختیار نہیں کی، اس بے باک اور بے خوف سیاست داں کو اپنی جرأت اور حوصلہ مندی کے عوض زندگی بھر 'زندانی' بن کر رہنا پڑا لیکن اس نے اپنی ڈگر نہ چھوڑی۔ اس لیے یہ کہنا بے محل نہ ہوگا کہ حسرت جس قدر عظمتیں بحیثیت کلاسیکی شاعر یا بحیثیت غزل گو رکھتے ہیں اسی طرح حسرت بحیثیت آدمی بھی عظیم اور آنے والی نسلوں کے لیے سرمایۂ بصیرت ہیں۔

حسرت کی شاعری میں براہ راست انھوں نے بھی عمل کی تلقین نہیں کی مگر ان کا تغزل بھی نئے رنگ کا ہے۔ بقول عسکری صاحب: ان کے یہاں ہمیں ایک نیا وجدان، نئی سرشاری، نیا ذوق و شوق، نیا والہانہ پن نظر آتا ہے جو اس سے پہلے اردو شاعری میں نایاب نہیں تو کمیاب ضرور ہے۔ حسرت نے جس طرح سیاست کی دنیا میں زندگی گزاری ہے اسی کا عکس ان کی عشقیہ شاعری میں نظر آتا ہے، جس سے ان کے یہاں ایک علو فکر اور خودداری نظر آتی ہے۔ انھوں نے اپنا یہ مسلک اس طرح بیان کیا ہے۔

کسی پر مٹ کے رہ جاتا ہے حسرت
ہمیں کیا کام عمر جاوداں سے

یہاں حسرت کے مزاج کی طرفگی بھی نظر آتی ہے مگر زمانے کے اثرات کا کچھ کم ہاتھ نہیں۔ یہ بات ہم اس وقت تک نہیں سمجھ پاتے جب تک ہم حسرت کی شاعری کا مقابلہ مولانا محمد علی جوہر کی شاعری سے نہ کریں۔ کیوں کہ دونوں کا خارجی ماحول ایک جیسا تھا، سیاسی خیالات اور سیاسی جد و جہد ایک ہی قسم کی تھی اور سیاسی زندگی کی مصیبتیں دونوں کو جھیلنی پڑیں۔ اس لیے دونوں کے یہاں ایک جیسے عناصر مل جاتے ہیں۔ خلیل صاحب کا یہ خیال بڑی حد تک درست ہے کہ:

''حسرت کے دیوان کا انتخاب کیا جائے اور ان کی شاعری کا وہ حصہ جو ان کا بہترین سرمایہ کہا جاتا ہے ایک جگہ اکٹھا کر دیا جائے تو سب سے پہلے جو بات ہمیں معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ ان کی شاعری ان کی آپ بیتی ہے۔ یہی ان کی خصوصیت بھی ہے اور یہی ان کا عیب بھی۔''

■

Dr.Quaisar Zaman
Urdu Ghar,Suleman Colony
Hazaribagh(Jharkhand)
Mob:09031919207
Email:quaisarzaman98@gmail.com

قمر سلیم

اردو، قومی یکجہتی اور اتحاد

دنیا کے سب سے بڑے جمہوری ملک ہندوستان میں مختلف فرقے مختلف علاقوں میں مختلف زبانیں بولتے ہوئے بھی ایک ساتھ رہ رہے ہیں۔ ہمیشہ ہی اس ملک میں ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائیوں نے میل ملاپ کی مثالیں قایم کی ہیں۔ خاص طور سے ہندوستان کے اکثریتی طبقے اور سب سے بڑے اقلیتی طبقے نے قومی یکجہتی کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کی کوشش کی ہے۔

دہلی اور اس کے قرب وجوار میں بولی جانے والی کھڑی بولی سے نکلنے والی زبان جس نے خالص ہندوستانی ماحول میں فروغ پایا اور جو ہر خاص و عام کی زبان بن گئی۔ یہ کوئی اور نہیں بلکہ اردو ہے جو اپنی جاذبیت اور شیرینی کی وجہ سے آج تک سر چڑھ کر بول رہی ہے۔ وقت کے ساتھ ساتھ اردو اہل زبان یعنی برصغیر کی زبان ہی نہیں رہ گئی بلکہ مغربی ممالک میں بھی بولی جانے لگی۔ اس کی وجہ اس زبان کی شگفتگی اور شائستگی بھی ہے۔ جس نے قومی یکجہتی اور اتحاد میں اہم رول ادا کیا ہے۔

قومی یکجہتی کا تعلق شہری کی ذہنی ہم آہنگی، جذباتی ہم آہنگی اور حب الوطنی کے جذبے سے ہے۔ جس کی بنا پر ایک ملک کے باشندے اپنے ملک کے لیے بڑی سے بڑی قربانی دینے کو تیار رہتے ہیں۔ قومی یکجہتی کے جذبے کی بنا پر ملک کے شہریوں میں آپس میں برداشت کا مادہ پیدا ہوتا ہے۔ قومی یکجہتی ایک نفسیاتی اور تعلیمی عمل ہے۔ اس میں لوگوں کے لیے ہم آہنگی، آپسی تعلقات، عام شہریت کا جذبہ اور ملک سے محبت کا جذبہ شامل ہے

قومی یکجہتی ایک نفسیاتی اور تعلیمی عمل ہے۔ اس میں لوگوں کے لیے ہم آہنگی، آپسی تعلقات، عام شہریت کا جذبہ اور ملک سے محبت کا جذبہ شامل ہے جیسا کہ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے کہا تھا کہ قومی یکجہتی اینٹ اور چونے، ہتھوڑے اور چھینی سے نہیں بنائی جاتی ہے۔

جیسا کہ ڈاکٹر رادھا کرشنن نے کہا تھا کہ قومی یکجہتی اینٹ اور چونے، ہتھوڑے اور چھینی سے نہیں بنائی جاتی ہے۔ یہ تو افراد کے دماغوں اور دلوں میں پیار یا محبت کے جذبے سے فروغ پاتی ہے۔ اس کے پیدا ہونے کا ایک ہی راستہ ہے اور وہ ہے تعلیم کا راستہ۔ یہ راستہ حالانکہ بہت دھیما ہے لیکن مستقل اور ٹھوس ہے۔

دنیا کے سب سے بڑے جمہوری ملک ہندوستان میں مختلف فرقے مختلف علاقوں میں مختلف زبانیں بولتے ہوئے بھی ایک ساتھ رہ رہے ہیں۔ ہمیشہ ہی اس ملک میں ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائیوں نے میل ملاپ کی مثالیں قایم کی ہیں۔ خاص طور سے ہندوستان کے اکثریتی طبقے اور سب سے بڑے اقلیتی طبقے نے قومی یکجہتی کی بنیادوں کو مضبوط کرنے کی کوشش کی ہے۔

ہندوستان میں قومی یکجہتی کی تاریخ پر اگر نظر ڈالیں تو ہندوستان میں ایک عرصے تک ہندو اور مسلمانوں کی حکومتیں رہی ہیں۔ دونوں ہی حکومتوں کے دور میں ہندو مسلمان دو بھائیوں کی طرح رہے ہیں لیکن ایک وقت ایسا بھی آیا جب ہندوستان کے عوام غیر ملکی حکومت کے غلام ہوگئے۔ 1857 میں انگریزی حکومت کے خلاف ہندوستانیوں نے جد و جہد شروع کی۔ آزادی کی 90 سالہ لڑائی میں ہندو، مسلمان، سکھ اور عیسائیوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا۔ گاندھی جی کے ساتھ ساتھ آزادی کے لیے جن لوگوں نے قربانیاں دی ہیں ان میں اینی بیسینٹ، گوکھلے، تلک، لاجپت رائے، سبھاش چندر بوس، مولانا محمد علی جوہر، مولانا محمود علی، مولانا ابوالکلام آزاد، بھگت سنگھ، چندر شیکھر آزاد، اشفاق اللہ، پنڈت جواہر لال نہرو، سردار پٹیل وغیرہ کے نام نمایاں ہیں۔ ان رہنماؤں کی قربانیاں رنگ لائیں۔ بالآخر 15 اگست 1947 کو ہندوستان آزاد ہوگیا۔

ہندوستان میں یکجہتی کی مثالیں صرف اس دور میں ہی نہیں ملتی ہیں بلکہ اس کی پوری تاریخ ہے۔ جب سے مسلمانوں نے ہندوستان کی سرزمین پر قدم رکھا تب سے ہی آپسی میل ملاپ، بھائی چارے کا بول بالا رہا ہے۔ ہندوستان میں ترکوں کی آمد سے مسلمانوں کی حکومت کا آغاز ہوا حالانکہ اس سے پہلے عربوں کو ہندوستان کی تہذیب وتمدن سے دلچسپی رہی ہے۔ عرب اور بدھ مذہب کو ماننے والوں میں تجارتی اور ثقافتی تعلقات تھے۔ ہندوستان میں ہر دور میں یکجہتی کی مثالیں ملتی ہیں چاہے گجرات کے بلہر راجہ ہوں یا ملابار کے ساموری راجہ، چاہے راجہ گوڑ ہوں یا الور کے راجہ مہروگ، خلجی خاندان کی حکومت ہو، تغلق خاندان کی حکومت ہو یا مغلیہ خاندان کی حکومت ہو کوئی بھی دور ایسا نہیں ہے جس میں تعصب کی مثالیں ملتی ہوں۔ ان تمام حکومتوں میں ہندو مسلمان آپس میں مل کر رہتے تھے۔ ان سبھی راجاؤں اور بادشاہوں نے ہندو

مسلمانوں کے ساتھ کسی طرح کا بھی تعصبانہ برتاؤ اختیار نہیں کیا۔ ہر دور میں ہندو مسلمانوں کو اپنے اپنے مذہب کو ماننے اور اپنے طریقے سے عبادت کرنے کی اجازت تھی۔ بادشاہوں کے محلوں میں ہندو اور راجاؤں کے دربار میں مسلمان اونچے عہدوں پر فائز تھے۔ قومی یکجہتی کی ایسی مثالیں دونوں کے دور میں ملتی ہیں۔

اردو ہندوستانی اور ایرانی تہذیب کا سنگم ہے۔ اور اس تہذیب کی آبیاری مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں نے مل کر کی ہے۔ اردو نے ہمیشہ محبت کا پیغام دیا ہے بلکہ اس کی شیرینی نے نفرت کو محبت کے جذبے میں تبدیل کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو مسلمان ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ یوں تو اردو ایرانیوں اور ہندوستانیوں کی تہذیب کے سنگم کا نتیجہ ہے لیکن آریوں کے وقت سے ہی ہندوستان مختلف تہذیبوں کی آماجگاہ رہا ہے۔ ایرانی، یونانی، تاتاری، ترکی، عربی وغیرہ اپنی تہذیب و ثقافت کے ساتھ ہندوستان آئے اور ہندوستان کی تہذیب پر اپنے گہرے نقوش چھوڑے۔ ہندوستانی تہذیب ایک ایسی تہذیب ہے جس نے اپنے وسیع دامن کی وجہ سے ہر تہذیب کا خیر مقدم کیا اور مختلف تہذیبوں کو اپنے اندر سمو لیا اور اس طرح ایک مخلوط تہذیب بن کر ابھری۔ باہمی رواداری، ایثار و قربانی، محبت و اخوت اس مخلوط تہذیب کے اوصاف تھے۔ اگر دیکھا جائے تو ہندوستانی تہذیب میں مختلف رنگوں کی آمیزش ہے جو انفرادیت سے ہٹ کر اجتماعیت کی نمائندگی کرتی ہے۔ اور اگر کہا جائے کہ اردو نے گنگا جمنی تہذیب کے تقاضوں کو پورا کیا تو غلط نہیں ہوگا۔

ہم اردو زبان کا جائزہ لیں تو یہ بات سمجھ میں آتی ہے کہ اردو نے ایک جذبے کے تحت فروغ پایا اور وہ جذبہ تھا یکجہتی اور اتحاد کا۔ اتحاد کے حصول کے لیے اردو ہر خاص و عام کی زبان بن گئی۔ اس نے مختلف تہذیبوں، مختلف قوموں، مختلف مذاہب، مختلف عقائد کو ایک مالا میں پرو دیا۔ جبھی تو علامہ اقبال کہتے ہیں۔

چشتیؒ نے جس زمیں میں پیغام حق سنایا
نانک نے جس چمن میں وحدت کا گیت گایا
تاتاریوں نے جس کو اپنا وطن بنایا
جس نے حجازیوں سے دشت عرب چھڑایا
میرا وطن وہی ہے میرا وطن وہی ہے

اردو زبان نے نثر اور شاعری دونوں سے ہی ہر خاص و عام کا دل جیتا ہے اور یہ حقیقت ہے کہ اردو شاعری نے اپنے اور پرائے ہر کسی کا دل جیت لیا ہے۔ اردو ایک ایسی زبان ہے جو نہ جاننے والے کو بھی اپنی طرف متوجہ کرتی

> اردو ہندوستانی اور ایرانی تہذیب کا سنگم ہے۔ اور اس تہذیب کی آبیاری مسلمانوں، ہندوؤں، سکھوں نے مل کر کی ہے۔ اردو نے ہمیشہ محبت کا پیغام دیا ہے بلکہ اس کی شیرینی نے نفرت کو محبت کے جذبے میں تبدیل کیا ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ہندو مسلمان ایک لڑی میں پروئے ہوئے ہیں۔ یوں تو اردو ایرانیوں اور ہندوستانیوں کی تہذیب کے سنگم کا نتیجہ ہے لیکن آریوں کے وقت سے ہی ہندوستان مختلف تہذیبوں کی آماجگاہ رہا ہے۔

ہے اور نہ چاہتے ہوئے بھی وہ وہ اس کا دلدادہ ہوئے بغیر نہیں رہتا۔ اتنی چاشنی شاید ہی کسی زبان میں ہو۔ مفہوم سے ناواقف ہونے کے باوجود کوئی بھی شخص جب اردو اشعار سنتا ہے تو داد تحسین دیے بنا رہ نہیں پاتا۔ گھروں، سڑکوں سے لے کر پارلیمنٹ تک اردو اشعار کی گونج سنائی دیتی ہے۔ اردو جب بولتی ہے تو دل کی گہرائیوں سے بولتی ہے اور اردو اشعار جب نکلتے ہیں تو وہ یہ نہیں دیکھتے ہیں کہ کہنے والا ہندو ہے، مسلمان ہے یا سکھ، عیسائی۔ بقول آتش۔

بت خانہ کھود ڈالیے مسجد کو ڈھائیے
دل کو نہ توڑیے کہ خدا کا مقام ہے

یہی نہیں اردو شعرا نے بہت خوبصورتی کے ساتھ دو تہذیبوں کی عکاسی کی ہے۔ مندر، مسجد، گرودوارہ، گرجا، شوالہ کلیسا کا اس طرح بیان کیا ہے کہ ایک مخلوط تہذیب جھلکتی ہے۔ بقول غالب۔

ایماں مجھے روکے ہے جو کھینچے ہے مجھے کفر
کعبہ میرے پیچھے ہے کلیسا میرے آگے

میر کا بھی اپنا ہی انداز ہے۔

میر کے دین و مذہب کو اب پوچھتے کیا ہو ان نے تو
قشقہ کھینچا دیر میں بیٹھا کب کا ترک اسلام کیا

اردو زبان کی تعمیر اور فروغ میں ہر قوم نے حصہ لیا ہے جہاں ہندوؤں اور سکھوں میں پریم چند، دیا شنکر نسیم، ہر گوپال تفتہ، فراق گورکھپوری، رتن ناتھ سرشار، برج نارائن چکبست، کرشن چند، راجندر سنگھ بیدی، کنور مہندر سنگھ بیدی، آنند نارائن ملا، اوپیندر ناتھ اشک، تلوک چند محروم، گیان چند جین، سریندر پرکاش، جگن ناتھ آزاد، گوپی چند نارنگ، گلزار زتشی وغیرہ شامل ہیں وہیں عیسائیوں نے بھی اس کی تعمیر اور فروغ میں شانے سے شانہ ملایا۔ ان میں ہم ڈاکٹر گلکرسٹ کی فراخ دلی کو نہیں بھلا سکتے۔

اردو کی ایک خوبی یہ بھی ہے کہ یہ زبان خالص ہندوستانی زبان ہے جو یہیں پیدا ہوئی، یہیں پلی اور یہیں فروغ پا رہی ہے۔ اس میں شک نہیں ہے کہ اردو اتحاد پیدا کرنے کے لیے نفرت کو محبت کا جامہ پہنا رہی ہے۔ لوگوں کو آپسی بھائی چارے اور محبت و اخوت کا پیغام دے رہی ہے۔ یہی اردو ہے جس نے آزادی کی جنگ لڑنے والوں میں جوش و خروش پیدا کیا، جس نے مذہب و ملت میں فرق کیے بنا ہر ایک کو وطن کی آزادی کے لیے اکسایا اور آزادی کے دیوانوں نے اس کی آواز پر لبیک کہا۔ ان کے دل قربانی کے جذبے سے سرشار تھے اور اتحاد ان کی طاقت تھی۔ بقول حنیف کیفی۔

مرا گلشن وہ گلشن ہے
جہاں صدہا طرح کے پھول کھلتے ہیں
جدا ہر ایک خوشبو
جدا ہر ایک کی صورت
الگ ہے رنگ ہر اک کا
الگ پہچان ہے سب کی
مگر گلشن کی نسبت سے...
سبھی اک نام سے پہچانے جاتے ہیں
ہزاروں سال سے یہ مشترک پہچان قائم ہے
ہے صد رشک زمانہ میرے گلشن کی یہ صد رنگی میں یک رنگی

تہذیبی ہم آہنگی قومی یکجہتی کے لیے ضروری ہے۔ ہندوستان ایک ایسا ملک ہے جہاں بہت سی تہذیبیں ایک ساتھ فروغ پا سکتی ہیں۔ انھیں مساوی طور پر بڑھاوا دینے سے ان کے آپسی تعلقات کی بنا پر گنگا جمنی تہذیب فروغ پا سکے گی۔ اس تہذیبی ہم آہنگی سے قومی یکجہتی کو بڑھاوا ملے گا۔

حواشی:

1 خاک ہند: چکبست برج نارائن، ریختہ
2 بانگ درا: علامہ اقبال، ریختہ
3 دی کانسپٹ آف نیشنل انٹیگریشن: رمن دیپ کور، 2 جون 2013، میپس آف انڈیا ڈاٹ کام
4 دی کانسپٹ آف نیشنل انٹیگریشن: نصیر احمد لون، انٹرنیشنل جرنل آف ریسرچ، جلد 5 شمارہ 1، جنوری 2018
5 نیشنل انٹیگریشن اینڈ اِٹس امپورٹنس اِن ماڈرن ورلڈ: جین ٹیلر، 25 جولائی 2017، افورڈ ہیل۔ پیپرس ڈاٹ کام
6 سحر سے پہلے: حنیف کیفی، 2004
7 ڈیجیٹل اردو غزل ریڈر: کولمبیا ڈاٹ ای ڈی یو

■

Dr. Mohd Qamar Saleem
Flat No: 3, Atma Shanti Co-Operative
Housing Society, Plot No: 33, Sector-03
Washi, Navi Mumbai - 400703 (MS)
Mob.:09322645061

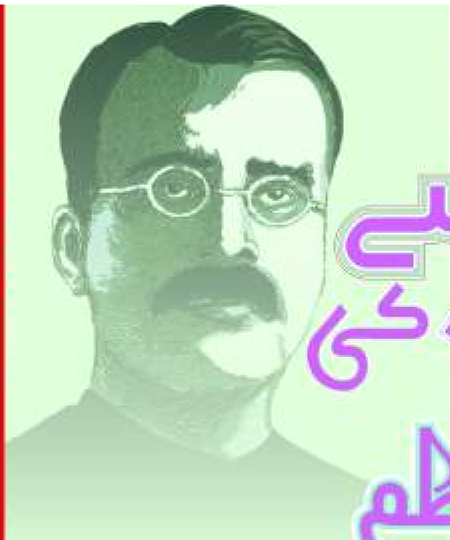

رام کے حوالے سے چکبست کی شاہکار نظم

احسان حسن

عموماً دنیا کی ہر بڑی شاعری میں شعرا نے عظیم شخصیتوں پر طبع آزمائی کی ہے۔ ہندوستان میں بالخصوص اور پوری دنیا میں بالعموم رام کی شخصیت اور رام کا کردار اپنے ایثار اور اپنی آدرش وادی شناخت کے باعث اعلیٰ مرتبے اور اعتقاد کا حامل ہے۔ اُردو میں بھی رام پر کافی کچھ لکھا گیا ہے۔ اردو شاعری میں رام پر متعدد تخلیقات موجود ہیں، مثلاً علامہ اقبال کی نظم ہے رام پر۔ اسی طرح اور بھی قدیم و جدید شاعروں کے یہاں رام پر شاعری کی گئی ہے۔ غزلوں میں کسی مصرعے، کسی شعر میں اور نظموں میں تو باقاعدہ تفصیل کے ساتھ۔ کیفی اعظمی کی ایک نظم ہے 'دوسرا بن باس' اردو کی مختلف مثنویوں میں بھی رام کے تذکرے ملتے ہیں خواہ وہ روزمرہ اور محاوروں کی شکل میں ہوں یا پھر تمثیلی اور تلمیحی پیرائے میں۔ اقبال کی نظم جس کا عنوان ہی 'رام' ہے ملاحظہ ہو

لبریز ہے شراب حقیقت سے جامِ ہند
سب فلسفی ہیں خطہ مغرب کے رام ہند
یہ ہندیوں کے فکر فلک رس کا ہے اثر
رفعت میں آسماں سے بھی اونچا ہے بام ہند
اس دیس میں ہوئے ہیں ہزاروں ملک سرشت
مشہور جن کے دم سے ہے دُنیا میں نام ہند
ہے رام کے وجود پہ ہندوستاں کو ناز
اہل نظر سمجھتے ہیں اس کو امام ہند
اعجاز اس چراغِ ہدایت کا ہے یہی
روشن تراز سحر ہے زمانے میں شام ہند
تلوار کا دھنی تھا، شجاعت میں فرد تھا
پاکیزگی میں، جوشِ محبت میں فرد تھا

(نظم 'رام' از علامہ اقبال، بانگ درا، ص 270، ایجوکیشنل پبلشنگ ہاوس دہلی)

اپنی اس نظم میں علامہ اقبال نے رام کو 'امامِ ہند' سے تعبیر کیا ہے اور اس کی تائید اہل نظر سے کروائی ہے۔

چکبست کی نظم 'رامائن کا ایک سین' اُردو شاعری میں موجود رام پر تخلیق کردہ تمام تخلیقات میں منفرد حیثیت رکھتی ہے۔ یہ نظم بہت مقبول ہے اور اس کی ادبی قدر و قیمت بھی مسلم ہے۔ بن باس کے لیے روانہ ہونے سے پہلے اپنی ماں سے رام کا مخاطب ہونا، گفتگو کی جذباتیت اور اس کا فطری لمس بے جوڑ ہے۔ رام لعل نابھوی لکھتے ہیں:

"چکبست کا شاہکار 'رامائن کا ایک سین' ہے۔ اسے دو حصوں میں تقسیم کیا گیا ہے۔ ایک شری رام چندر جی کا ماں سے رخصت ہونا اور دوسرا ماں کا جواب۔ ایک طرف ماں ہے، پوری ممتا لیے ہوئے دوسری طرف بیٹا ہے مکمل فرماں بردار۔ چکبست نے اسے ڈرامائی انداز میں پیش کیا ہے۔ ایک داستان چند بندوں میں خوبصورتی سے محدود کی گئی ہے۔ کسی زبان کی شاعری میں مذہبی داستانوں کی سخت ضرورت ہوتی ہے۔ شاعری گیتوں اور غزلوں سے ہی مالا مال نہیں ہوتی۔ چکبست کی نظر سے یہ مسئلہ روپوش نہیں رہا۔ ماں بیٹے کا مکالمہ، بیان کی روانی اور شستگی، پڑھنے والے کا تجسس، دیکھنے سے ہی تعلق رکھتا ہے۔ یہ نظم لاکھوں لوگوں کو ازبر ہے اور بہت تو اسے ہر روز پڑھتے ہیں۔"

(مونوگراف 'چکبست' از رام لعل نابھوی، ص 44-43، مطبوعہ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی)

رام چندر جی راجہ (راج کمار) تھے، وہ ایک راج گھرانے کے چشم و چراغ تھے، ولی عہد تھے۔ ایسے میں ان کا سلوک، ان کا کردار، کنبے کے افراد سے ان کا گفتگو

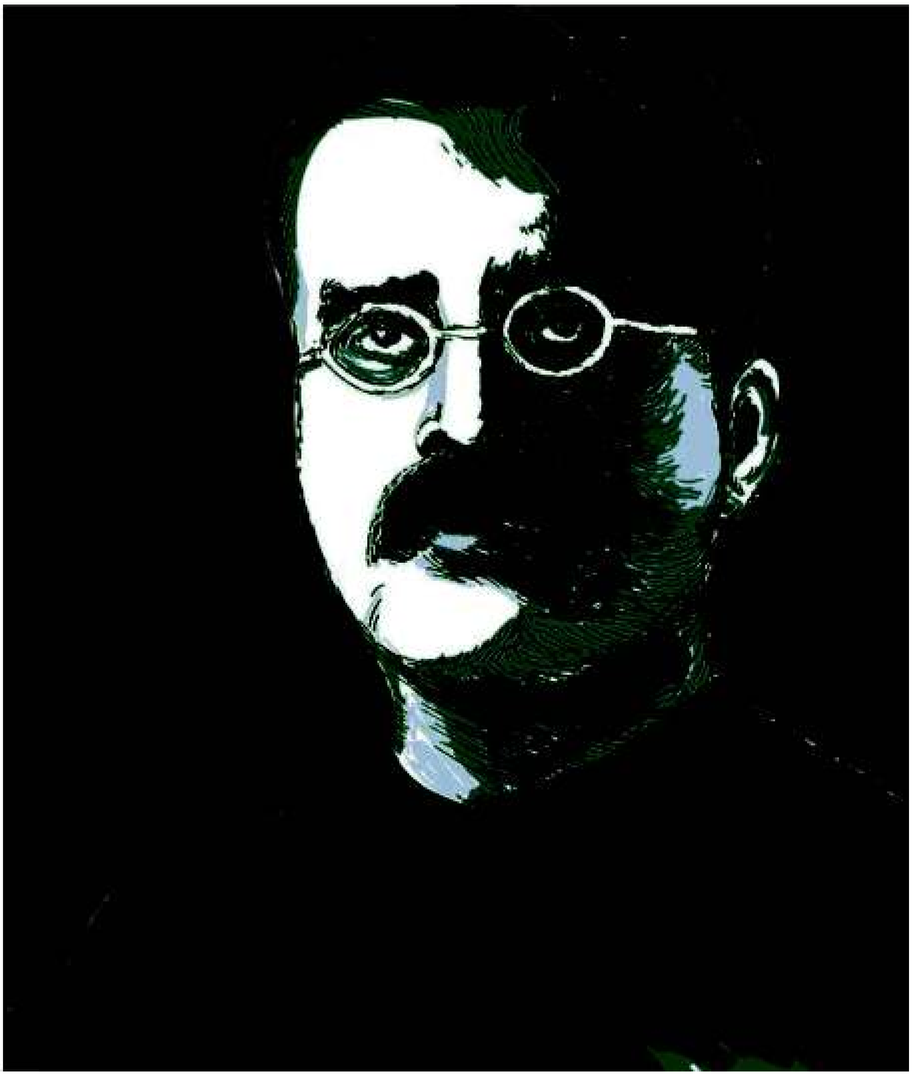

کرنے کا انداز، فطری ردِّعمل اور بالکل عوامی لب ولہجہ ان سب باتوں کو چکبست نے اس خوبصورتی اور فنکارانہ چابکدستی سے پیش کیا ہے۔ چکبست کی نظم کی مقبولیت اور اس کے ہر دل عزیز ہونے کا راز بھی یہی ہے جیسا کہ اوپر کے اقتباس میں رام لعل نابھوی نے لکھا ہے کہ تمام لوگوں کو یہ نظم یاد ہے اور بہت سے لوگ اسے روز ہی پڑھتے ہیں۔ رام چندر جی کے مکالمے، ماں سے ان کا مخاطب ہونا اور ماں کی فکر مندی ان تمام پہلوؤں سے ہمارا فطری انسلاک، جذباتی ربط قائم ہو جاتا ہے۔ وہیں دوسری طرف جب ہم اُن کے ارادے اور بن باس سے ذرا بھی خائف نہ ہونے کی غیر معمولی قوت اور بلند ترین اخلاقیات سے روبرو ہوتے ہیں تو رام کے نہ صرف کردار کے قائل ہو جاتے ہیں بلکہ ایک خاص قسم کی عقیدت بھی ہمارے دلوں میں پیدا ہو جاتی ہے۔

چکبست کی نظم 'رامائن کا ایک سین' اردو نظم نگاری کے باغ میں اپنے عہد و موضوع کے اعتبار سے گُل لالہ ہے۔ یہ اپنے طور کی ایک انوکھی نظم ہے۔ مسدس کی ہیئت میں لکھی گئی یہ نظم بیک وقت مرثیہ اور مثنوی کا لطف دیتی ہے۔ چکبست کا تمام کلام 'صبح وطن' میں موجود ہے یہ کتاب پانچ حصوں میں تقسیم کی گئی ہے۔ اس میں نظمیں، غزلیں قطعات، رباعیات اور کچھ متفرق کلام شامل ہیں۔ نظموں کی تعداد زیادہ ہے جو مسدس میں بھی ہیں اور مخمس میں بھی۔

'رامائن کا ایک سین' نظم میں جو افسانویت ہے، کہانی پن ہے اور جس مخصوص انداز کی تفصیل اور مکالموں کے ساتھ نظم آگے بڑھتی ہے اس سے مثنوی کا گمان غالب ہوتا ہے۔ غور طلب ہے کہ نظم کی بسم اللہ ہی رخصت ہونے اور جدائی کے موضوع سے ہوتی ہے۔ پوری نظم میں ایک مغموم اور سوگوار فضا برقرار رہتی ہے جو 'رامائن کا ایک سین' نظم کو مرثیے کے محسوسات سے معمور کر دیتی ہے۔ نظم میں مرثیہ اور مثنوی کے التزام کی ایسی فنی پختگی نمایاں ہے جو اس نظم کو Epic کا لمس دیتی ہے۔ نظم ''رامائن کا ایک سین'' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

رخصت ہوا وہ باپ سے لے کر خدا کا نام
راہِ وفا کی منزلِ اوّل ہوئی تمام
منظور تھا جو ماں کی زیارت کا انتظام
دامن میں اشک پونچھ کے دل سے کیا کلام
اظہارِ بے کسی سے ستم ہوگا اور بھی
دیکھا ہمیں اُداس تو غم ہوگا اور بھی
دیکھے ہیں اس سے بڑھ کے زمانے نے انقلاب
جن سے کہ بے گناہوں کی عمریں ہوئیں خراب
سوزِ دروں سے قلب و جگر ہو گئے کباب
پیری مٹی کسی کی کسی کا مٹا شباب
کچھ بن نہیں پڑا جو نصیبے بگڑ گئے
وہ بجلیاں گریں کہ بھرے گھر اُجڑ گئے

(انتخاب منظومات (حصہ اوّل) ص 45,48 مطبوعہ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ)

رام لعل نابھوی لکھتے ہیں:

''اس نظم میں انسانی نفسیات کا مطالعہ اور زندگی کا مشاہدہ بھرپور ہے۔ عبدالقادر سروری کا کہنا ہے کہ رامائن کے بعض دلچسپ اور موثر واقعات کو چکبست نے مسدس کی شکل اور انیس کے انداز میں پیش کرنے کی کوشش کی ہے۔ چکبست کی یہ نظم اُردو شاعری میں قابل قدر ہے کیونکہ اس کا موضوع بھی مرثیہ کے موضوع کی طرح مہتم بالشان ہے اور اسلوب بیان میں بھی مرثیے کی جھلک موجود ہے۔ یہ نظم حزنیہ ہے اور اس میں ڈرامائی خوبی بڑی حد تک موجود ہے''

(مونوگراف چکبست' از رام لعل نابھوی، ص 45، مطبوعہ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی)

چکبست نے نظم 'رامائن کا ایک سین' میں بن باس کو روانہ ہو رہے رام کو ہیرو کے طور پر پیش کیا ہے۔ نظم میں مرکزی رول رام کا ہے۔ باپ ماں وغیرہ سے وداع لینے میں رام کا کردار جس طرح سے اُبھر کر سامنے آتا ہے اس سے فطری طور پر ہم اپنے آپ کو رام کے ساتھ جذبات کی سطح پر جوڑ لیتے ہیں اور ان کا دُکھ درد ہمیں ذاتی دُکھ درد معلوم ہونے لگتا ہے۔ دوسری طرف رام جن اصولوں اور آدرشوں پر عمل کرتے ہوئے بن باس کو روانہ ہو رہے ہوتے ہیں اُس سے ہمارے دلوں میں رام کے تئیں عقیدت اور مضبوط ہوتی ہے اور ہم ان آدرشوں کے ساتھ بن باس کو روانہ ہو رہے رام کے ساتھ کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ہم اپنے اندر ایک قوت محسوس کرنے لگتے ہیں، اس نظم کی یہی نزاکت اس کو اعلیٰ درجے کی تخلیق بناتی ہے کہ ایک طرف

چکبست نے نظم ' رامائن کا ایک سین' میں بن باس کو روانہ ہورہے رام کو ہیروکے طور پر پیش کیا ہے۔نظم میں مرکزی رول رام کا ہے۔باپ ماں وغیرہ سے وداع لینے میں رام کا کردار جس طرح سے اُبھر کر سامنے آتا ہے اس سے فطری طور پر ہم اپنے آپ کو رام کے ساتھ جذبات کی سطح پر جوڑ لیتے ہیں اور ان کا دُکھ درد ہمیں ذاتی دُکھ درد معلوم ہونے لگتا ہے۔

جذبات میں ہمارے آنسو بھی نکل رہے ہوتے ہیں تو دوسری طرف بات جب اصولوں کی آتی ہے تو راج محل کو چھوڑ کر ہم جنگل کی زندگی کی حمایت کرتے ہیں۔ بن باس کے لیے روانہ ہونے سے پہلے ماں کے ساتھ رام کے مکالمے اور ان مکالموں کا نیچرل انداز اور شدتِ احساس ایک زبردست تاثر قائم کرتے ہیں۔

پھر یہ کہا کہ میں نے سنی سب یہ داستان
لاکھوں برس کی عمر ہو دیتے ہو ماں کو گیان
لیکن جو میرے دل کو ہے درپیش امتحان
بچے ہو اس کا علم نہیں تم کو بے گمان
اس درد کا شریک تمھارا جگر نہیں
کچھ ماتا کی آنچ کی تم کو خبر نہیں
بن باس پر خوشی سے جو راضی نہ ہوں گا میں
کس طرح منہ دکھانے کے قابل رہوں گا میں
کیوں کر زبانِ غیر کے طعنے سنوں گا میں
دنیا جو یہ کہے گی تو پھر کیا کہوں گا میں
لڑکے نے بے حیائی کو نقشِ جبیں کیا
کیا بے ادب تھا؟ باپ کا کہنا نہیں کیا

(انتخاب منظومات (حصہ اول) ص 49,51 مطبوعہ اتر پردیش اردو اکادمی لکھنؤ)

نظم 'رامائن کا ایک سین' کی خصوصیت یہ ہے کہ بیک وقت اس میں معمولی اور غیر معمولی کا تصادم ہے۔ رام کا اہل خانہ سے رخصت ہونے کا منظر اور جب وہ باپ سے مل کر ماں سے مخاطب ہوتے ہیں تو بالکل عام ماں بیٹے کی سی جذباتی کیفیت ہوتی ہے لیکن جیسے ہی رام بن باس کو جانے کے اپنے فیصلے کو جائز قرار دینے لگتے ہیں اور ماں سے اصرار کرتے ہیں کہ بن باس کی اجازت دیں کیونکہ یہ فرض، اصول اور خاندان کے آدرش کی خاطر ضروری ہے تو رام کا غیر معمولی عکس ہمارے سامنے نمودار ہوتا ہے۔ ایک طرف رام کی شخصیت کا وہ پہلو ہے جو ہماری زندگیوں کا حصہ ہے تو دوسری طرف نہایت غیر معمولی اور آفاقی جلوہ نمودار ہوتا ہے۔ چکبست کا کمال یہ ہے کہ نزاکت سے بھرے اس موضوع کو نہایت فطری انداز میں بڑے خوبصورت طریقے سے نظم کے پیرائے میں اس طرح پیش کیا ہے کہ عقیدت میں قاری کے سر کو جھکا دیتا ہے۔ نظم 'رامائن کا ایک سین' کے چند اشعار ملاحظہ ہوں۔

پڑتا ہے جس غریب پہ رنج و محن کا بار
کرتا ہے اس کو صبر عطا آپ کردگار
مایوس ہو کے ہوتے ہیں انسان گناہ گار
یہ جانتے نہیں وہ ہے دانائے روزگار

انسان اس کی راہ میں ثابت قدم رہے
گردن وہی ہے امرِ رضا میں جو خم رہے
اور آپ کو تو کچھ بھی نہیں رنج کا مقام
بعد سفر وطن میں ہم آئیں گے شاد کام
ہوتے ہیں بات کرنے میں چودہ برس تمام
قائم امید ہی سے ہے دُنیا ہے جس کا نام
اور یوں کہیں بھی رنج وبلا سے مفر نہیں
کیا ہوگا دو گھڑی میں؟ کسی کو خبر نہیں

('انتخاب منظومات (حصہ اول)' ص، 48، مطبوعہ اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ)

رام لعل نابھوی لکھتے ہیں:

''فن کی استعداد فطری ہوتی ہے۔ فنکارانہ استعداد خدا کی دین ہے۔ فن میں فنکار کا مقام اس کی تخلیقات سے متعین ہوتا ہے جو اس کی شخصیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ ادیب یا شاعر میں انسانیت بدرجۂ اولی ہوتی ہے۔ کیونکہ وہ معیارِ حیات ہوتا ہے۔ ایک آدمی میں بیک وقت کئی آدمی زندہ رہتے ہیں۔ کئی آدمی بیک وقت متصادم رہتے ہیں۔ ایک روشن دماغ میں کئی روشن دماغوں کی صلاحیتیں موجود ہوتی ہیں۔ شخصیت کی سبھی جہتوں سے ملاقات ممکن نہیں۔ ان شخصیتوں میں جو شخصیت غالب ہوتی ہے وہ اس شخص کی شخصیت بن جاتی ہے۔ لہٰذا کسی فنکار کا فنی مقام معلوم کرنے کے لیے ضروری ہے کہ اس کے ذہنی ارتقاء کا جائزہ لیا جائے اور اس کے کارناموں کا مطالعہ ایمانداری سے کیا جائے۔''

(مونوگراف چکبست 'از رام لعل نابھوی، ص 68، مطبوعہ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی)

چکبست ایک پاکیزہ شخصیت کے مالک تھے۔ ان کے اندر وطن اور قوم کی محبت بے پناہ تھی۔ اس لیے ان کی تمام تر تخلیقات قومیت اور وطنیت کے جذبے سے لبریز ہیں۔ چکبست نے غزلیں بھی کہی ہیں۔ ان کی غزلوں میں بھی ایک شفاف اور صاف ستھرا احساس نمایاں ہے زیادہ تر اشعار کے مرکز میں نئی نسل، وطن، قوم اور قوم کی تربیت ہے۔ چکبست نے اپنی غزلوں میں بھی عشقیہ موضوعات او رمحبت کے مضامین سے اجتناب برتا ہے۔ 'رامائن کا ایک سین' جیسی نظم وہی شاعر لکھ سکتا ہے جس کی زندگی میں اصول اور آدرش اولیت رکھتے ہوں۔ جو اپنے فرض کو پورا کرنے کی خاطر ہر مصیبت اُٹھانے کا حوصلہ رکھتا ہو۔

راحت ہو یا کہ رنج خوشی ہو کہ انتشار
واجب ہر ایک رنگ میں ہے شکر کردگار

تم ہی نہیں ہو کشتۂ نیرنگِ روزگار
ماتم کدہ میں دہر کے لاکھوں ہیں سوگوار
سختی سہی نہیں کہ اُٹھائی کڑی نہیں
دنیا میں کیا کسی پہ مصیبت پڑی نہیں

('انتخاب منظومات (حصہ اول)' ص 47، مطبوعہ اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ)

برج موہن دتاتریہ کیفی لکھتے ہیں:

''چکبست ایک شاعر کی حیثیت سے داخلی رنگ کے بادشاہ تھے۔ اور خارجی منظر نگاری میں بھی کم نہ تھے۔ وجہ یہ ہے کہ خیالات اور جذبات کا جوش وخروش ان کی فطرت میں بے حد تھا۔ چکبست کا شعور وسیع، تخیل بلند اور ذہن ہمہ گیر تھا اور وہ زبردست صاحب طرز تھے۔''

('کیا خوب آدمی تھا' از برج موہن دتاتریہ کیفی، ص 36)

اپنے مخصوص طرز میں مہارت اور کلاسیکی اصناف پر عبور کا ہی نتیجہ ہے کہ نظم 'رامائن کا ایک سین' میں مرثیہ اور مثنوی دونوں کا رنگ شیر وشکر ہو گیا ہے۔ ایسے فنکارانہ التزام کی مثالیں اردو شاعری میں خال خال ہی ہیں۔

چکبست کی نظم 'رامائن کا ایک سین' کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں۔

لیتی کسی فقیر کے گھر میں اگر جنم
ہوتے نہ میری جان کو سامان یہ بہم
ڈستا نہ سانپ بن کے مجھے شوکت وحشم
تم مرے لال تھے مجھے کس سلطنت سے کم
میں خوش ہوں پھونک دے کوئی اس تخت وتاج کو
تم ہی نہیں تو آگ لگا دوں گی راج کو

('انتخاب منظومات (حصہ اول)' ص 46، مطبوعہ اترپردیش اردو اکادمی، لکھنؤ)

نظم 'رامائن کا ایک سین' جس کی بہترین مثال ہے۔ اس نظم کے یہ اشعار ذرا ملاحظہ ہوں۔

یہ جعل یہ فریب یہ سازش یہ شور وشر
ہونا جو ہے سب اس کے بہانے ہیں سربسر
اسباب ظاہری ہیں نہ ان پر کرو نظر
کیا جانے کیا ہے پردۂ قدرت میں جلوہ گر
خاص اُس کی مصلحت کوئی پہچانتا نہیں
منظور کیا اُسے ہے؟ کوئی جانتا نہیں

('انتخاب منظومات (حصہ اول)' ص 47، مطبوعہ اترپردیش اردو اکادمی لکھنؤ)

ڈاکٹر عبدالحق کی رائے ہے:

''شاعر کا سب سے بڑا کام یہ ہے کہ وہ تخیل کو گدگداتا اور اُبھارتا ہے اور اس میں خیال، جذبہ، عمل سب کچھ آجاتا ہے۔ حضرات! یہ کام ہماری اردو کے تین شاعروں نے انجام دیا۔ حالی، چکبست اور اقبال۔ ان کے کلام میں خلوص، درد اور جوش پایا جاتا ہے۔ ان تینوں نے ملک اور قوم کی وہ ضروری اور اعلیٰ خدمات انجام دی ہیں جو کسی طرح ممکن نہ تھیں۔ یورپی نقاد کہتے ہیں کہ شاعری کا ماحصل لطف وحظ ہے۔

وہ یہ کہہ سکتے ہیں کہ انھیں فارغ البالی حاصل ہے۔ سامانِ عیش وآرام مہیا ہے۔ تمدن کی بہت سی اعلیٰ منزلیں طے کر چکے ہیں۔ لیکن ہم یہ کس منہ سے کہہ سکتے ہیں؟ ہمیں صرف لطف حاصل کرنا ہی مقصود نہیں بلکہ ہمیں سکوت وجمود کو بھی توڑنا ہے۔ غفلت وکاہلی کو مٹانا ہے۔ دلوں میں احساس وحرکت پیدا کرنی ہے۔ اور سچ پوچھیے تو مردوں کو زندہ کرنا ہے۔ ہمیں ایسے ہی شاعروں کی ضرورت تھی جیسے حالی، چکبست، اور اقبال۔''

('ادبی مطالعے، ایچ ایم عثمانی' ص 131، ڈاکٹر عبدالحق)

'رامائن کا ایک سین' نظم کے ذریعے چکبست ہمارے سامنے جو رول ماڈل پیش کرتے ہیں وہ انسانیت اور دردمندی کے جذبے سے لبریز ہے۔ رام کی شخصیت میں ایک فرماں بردار بیٹے کا کردار مکمل طور پر موجود ہے نہ کہ ایودھیا کے راج کمار کا۔ چونکہ رام حقیقت میں تو راج کمار ہی ہیں لیکن اپنی اس شناخت کو توڑ کر جب بن باس کے لیے وہ قدم بڑھا دیتے ہیں تو نہ صرف عام آدمی کے دل کے بہت قریب ہو جاتے ہیں بلکہ عوام کا آدرش اور عقیدہ بھی بن جاتے ہیں۔

آخر میں چکبست کے تعلق سے رام لعل نابھوی کا یہ بیان اور بات ختم کہ:

''چکبست ہندوؤں اور مسلمانوں دونوں کو انگریز کی چکی میں پستے دیکھ رہے تھے۔ اس لیے ہندو مسلم اتحاد کے زبردست حامی تھے اور آزادی کی تحریک کے علمبردار۔ اُن کا کردار خالص ہندوستانی تھا۔ صلح پسندی، توازن اور اعتدال اُن کے مزاج کے خاص جوہر تھے۔ ہندوستان کی مٹی کی سوندھی سوندھی خوشبو اُن کی رگ رگ میں بسی ہوئی تھی۔ بیداریٔ وطن کے ترانوں میں اُنھیں روحانی سُرور ملتا تھا۔ وہ اپنے پیغامات میں رنگا رنگ جلوے اور اپنے دل کی گرمی اور اپنے سینے کا گداز بھر دیتے تھے۔''

(مونوگراف چکبست'' از رام لعل نابھوی، ص 19 مطبوعہ ترقی اردو بیورو، نئی دہلی)

■

Dr. Ehasan Hasan
Asst. Professor, Dept of Urdu
Faculty of Arts, BHU
Varanasi- 221005
Mob.:9935352141

ماحولیاتی تحفظ اور ادب اطفال

زاہد ندیم احسن

ماحول اپنے آپ میں ایک مکمل اکائی کی حیثیت رکھتا ہے۔جس میں نامیاتی اور غیر نامیاتی اجزا تشکیل پاتے ہیں۔ یہی وہ خصوصیت ہے جو ماحولیاتی نظام قائم کرنے میں معاون ہے۔ ماحولیات یا ماحولیاتی نظام کرہ ارض کے کسی بھی حصے میں پائے جانے والے نامیہ اور غیر نامیہ عناصر کے باہمی تعلقات کے مجموعے کو کہتے ہیں۔ اس طرح ہم یہ کہہ سکتے ہیں کہ ماحول ایک حیاتیاتی نظام ہے۔

ماحول ان سبھی جسمانی، کیمیائی اور حیاتیاتی عناصر کا مستحکم ڈھانچا ہے، جو کسی بھی ذی روح، ماحول اور زندگی میں پیش آنے والی سبھی چیزوں پر اثر انداز ہوتا ہے۔ عمومی طور پر دیکھا جائے تو یہ واضح ہو جاتا ہے کہ ہماری زندگی کو متاثر کرنے والی تمام نامیاتی اور غیر نامیاتی اشیاء اور ان کے افعال و اعمال سے وقوع پزیر ہونے والے حادثات و واقعات کے مجموعے کو ماحول کہتے ہیں۔ اس سے تمام جاندار متاثر بھی ہوتے ہیں اور اپنے عمل سے اس کو متاثر بھی کرتے رہتے ہیں۔ لب لباب یہ ہے کہ ماحولیات میں مذکورہ تمام عناصر شامل ہیں جن کے اثرات بالواسطہ یا بلا واسطہ طور پر حیات انسانی پر پڑتے ہیں۔ بایں طور مفید اور مضر دونوں صورتوں میں اثر انداز ہوتے ہیں۔

فی زمانہ اس بات کی ضرورت اور اہمیت دو چند ہو جاتی ہے کہ علم ماحولیات سے متعلق تمام چیزوں کی معلومات کے ساتھ ان کے تمام عوامل کی تعلیم پر بھی زور دیا جائے، تاکہ ان مسائل کی تدبیر کی جا سکے۔ لہٰذا ضروری ہے کہ اس جدید معاشرے کو ماحولیات کے درپیش مسائل سے آگاہ کیا جائے۔ چونکہ آج کے اس مشینی دور میں پوری دنیا اس انجام کو پہنچ چکی ہے جس میں فضائی آلودگی اور زمینی آلودگی ہمارے لیے نہ صرف ایک مسئلہ ہے بلکہ ایک چیلنج ہے اور پوری دنیا خطرناک مسائل سے دو چار ہے۔ اس لیے یہ ضروری ہے کہ ماحول سے جڑے تمام مسائل پر سنجیدگی سے غور وخوض کیا جائے اور نسل انسانی کے تحفظ کی کیا تدبیر ممکن ہو سکتی ہے اس کو عام کیا جائے، تاکہ اس کے برے اور ہولناک انجام سے عوام واقف ہو سکیں۔

اب ایک نظر ان مسائل پر بھی ڈال لیں جو مسائل، ماحول اور ہمیں درپیش ہیں اور کس طرح سے زندگی پر اثر انداز ہوتے ہیں۔ آلودگی : زراعت، تجارتی اور رہائشی تپش، صنعتیں، حمل ونقل، زمینی اور فضائی آلودگی میں اہم رول ادا کرتی ہیں، فضا میں، کاربن مونو آکسائڈ، سلفر ڈائی آکسائڈ، کلورو فلورو کاربن، اور موٹر گاڑیوں اور فیکٹریوں سے نکلنے والے نائٹروجن آکسائڈ سے فضائی آلودگی پیدا ہوتی ہے جو سانس کے ساتھ پھیپڑے میں پہنچ کر طرح طرح کی بیماری پیدا کرتی ہے۔ آلودگی کی وجہ سے بہت سے جاندار کی قسمیں ختم ہو رہی ہیں یا ختم ہونے کے دہانے پر ہیں۔ صوتی آلودگی ماحولیاتی آلودگی کی ایک قسم ہے کچھ آوازیں جو ناگوار ہوتی ہیں جس سے نقصان پہنچتا ہے اور سننے والے پر ان کے برے اثرات پڑتے ہیں صوتی آلودگی کے زمرے میں آتی ہیں صوتی آلودگی سے سماعت پر اثر پڑتا ہے، کان کا درد، چڑچڑاپن جیسی حالت ہوتی ہے اور اگر یہ بہت دنوں تک رہ جائے تو بلڈ پریشر ہو جائے گا۔ صوتی آلودگی کے ذرائع سڑک پر چلنے والی گاڑیوں سے نکلنے والی آوازیں ہوائی جہاز اور جیٹ کی آواز نئے شہروں کی پلاننگ کاروباری علاقوں میں ناقابل برداشت آواز صنعتی شور ہیں۔ اس کا تدارک یہ ہے کہ گاڑیوں کی رفتار کم کی جائے ہارن کے استعمال پر پابندی کی جائے۔ رہائشی علاقوں اور بھیڑ بھاڑ والے علاقوں میں بڑی بڑی گاڑیوں کا جانا ختم کیا جائے۔

یہ درست ہے کہ تعلیم کے ذریعے سے ماحول کی معلومات سماجی زندگی کے فروغ کا اہم ذریعہ ہے۔ اس کا بنیادی مقصد انسانوں کے اندر، جسمانی، ذہنی، سماجی، تہذیبی، اور روحانی پختگی لانا ہے۔ اس طرح کے تعلیمی نظریات کو استحکام بخشنے کے لیے فطرت کے ذریعے بنائے گئے اس ماحولیاتی نظام کا علم ہونا بہت ضروری ہے۔ ماحول کا علم حاصل کرنا ہندوستانی تہذیب وثقافت کی روایت کا اہم حصہ ہے اور اس کی روایت ابتدا سے ہی رہی ہے۔ طبعیاتی اور معاشیاتی دور میں حالات کچھ الگ ہوتے جا رہے ہیں۔ ایک طرف جہاں سائنس اور تکنیک کے مختلف شعبوں میں نئی نئی ایجادات ہو رہی ہیں۔ تو دوسری طرف (Human Environment) انسانی ماحول بھی بری طرح سے متاثر ہو رہا ہے۔ نئی نسل کو ماحولیات میں ہونے والی تبدیلی اور بگاڑ کا شعور تعلیم کے ذریعے سے پیدا کرنا بہت ضروری ہے۔ ماحولیات اور تعلیم کے مابین جو رشتہ ہے اس کو جان کر بھی انسان اپنے اندر بیداری لا سکتا ہے۔ طالب علموں کو ماحول اور ماحولیات کی تعلیم عام فہم اور آسان زبان میں دینا چاہیے ابتدا میں یہ تعلیم بالکل سطحی اور تعارفی انداز سے دینا چاہیے۔ آگے چل کر اس کے تکنیکی پہلوؤں پر غور کرنا چاہیے۔ تعلیمی سطح پر ماحولیات کی معلومات انسانی بقا کے لیے بہت ضروری ہے۔

UNESCO نے ماحولیاتی تعلیم اور اس کے مقاصد کی اہمیت پر زور دیتے ہوئے یہ بات کہی ہے:

''ماحولیاتی تعلیم ایک ایسا لائحہ عمل ہے جس سے طلبا مختلف مسائل کو اور اہم قدروں کو سمجھ سکتے ہیں۔ اس سے وہ اپنے اندر ایسی صفات کو فروغ دیں گے جس سے وہ یہ سمجھ سکیں کہ انسان کا اپنے ماحول اپنی ثقافت اور آس پاس کی چیز سے گہرا تعلق ہے۔ یہ ایسی تعلیم ہے جو ان کے رویے اور طرز عمل میں ماحولیاتی اہمیت کا احساس اجاگر کرے۔''

مذکورہ بالا اقتباس کی روشنی میں دیکھا جائے اور ان پر غور کیا جائے تو یہ نتیجہ نکلتا ہے کہ ماحولیات کی تعلیم زیادہ کارآمد اسکول کی وجہ سے ہے اس کی خاص وجہ یہ ہے کہ جب نئی نسل کو اس کی تعلیم سے بہرور کیا جائے گا اور اس کی اہمیت کو زندگی کے افادی پہلوؤں سے مربوط کیا جائے گا تو ہمارے بچے نہ صرف اس کی اہمیت اور افادیت کو محسوس کریں گے بلکہ اسے اپنی زندگی میں اتار کر حیات کے ہر موڑ پر مقدم رکھیں گے۔

چونکہ بچے کسی بھی قوم کے معمار اور خشت اول ہوتے ہیں اس لیے یہ ضروری ہے کہ ماحولیات کی تعلیم اسکولی سطح سے ہی دی جائے کیونکہ اس کی تعلیم ابتدا ہی سے دی جائے گی تو ایک عمر تک پہنچ کے پختہ ہو جائیں گے جس کا ایک بہتر نتیجہ سامنے آئے گا۔ نفسیات کی نظر سے یہ درست ہے کہ کسی بھی چیز کو سکھانے کے لیے اس میں دلچسپی پیدا کی جائے خاص طور سے اگر بچوں کو کچھ سکھانا ہے یا کسی کام کے لیے عمل پیرا کرنا ہے تو اس کے لیے Subject Stimulus,Motivation اور Drive ان چار چیزوں کا ہونا بہت ضروری ہے کہانیاں مذکورہ تمام چیزوں کے لیے بہتر ہے۔ اسی کے پیش نظر بہت سے لوگوں نے ایسی کہانیاں لکھی ہیں جس میں ماحولیاتی قدروں کی افادیت اور اہمیت پر زور ملتا ہے۔

اس حوالے سے میرے پیش نظر بچوں کے لیے لکھی گئیں کچھ کہانیاں ہیں جو ماحولیات اور اس کے مسائل سے سروکار رکھتی ہیں:

بھنورا، سیدہ فرحت کی کہانی ہے اس کہانی میں ماحول میں پائی جانے والی فطری چیزوں میں چھیڑ چھاڑ سے کیا نتیجہ نکلتا ہے ان باتوں کو کہانی کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ کہانی کا سیاق یہ ہے کہ چھوٹی بچی جس کا نام کنول ہے پانی میں کھیلنے کی وجہ سے اسے سردی ہوگئی ہے وہ گھر میں لیٹی لیٹی اکتاہٹ محسوس کرتی ہے تو اپنے گھر کے باغ میں چلی جاتی ہے۔ وہاں وہ پھول پر منڈراتے ہوئے بھنورے کو دیکھتی ہے۔ وہیں اسے نیند آجاتی ہے۔ پھر خواب میں وہی بھنورا آتا ہے اور اسے کہانی سناتا ہے۔ خواب کے ذریعے سے کہانی آگے بڑھتی ہے۔

''ہاں سنو! بھنورے نے جواب دیا۔ میں ایک دیس کا راجہ تھا۔ یہاں سے بہت دور دیس کا۔ مجھے سونے چاندی ہیرے موتی سے بڑا پیار تھا۔ میرا محل سونے کا تھا۔ اس میں چاندی کے دروازے تھے میں سونے چاندی کے برتنوں میں کھاتا پیتا تھا۔ ایک دن میں نے اپنے باغ میں ٹہلتے ہوئے سوچا۔ یہ پھول، پتے، ہری ہری گھاس سب کچھ سوکھ کر کوڑے کا ڈھیر بن جاتے ہیں۔ اور ہاں مجھے

ماحولیاتی تعلیم ایک ایسا لائحہ عمل ہے جس سے طلبا مختلف مسائل کو اور اہم قدروں کو سمجھ سکتے ہیں. اس سے وہ اپنے اندر ایسی صفات کو فروغ دیں گے جس سے وہ یہ سمجھ سکیں کہ انسان کا اپنے ماحول اپنی ثقافت اور آس پاس کی چیز سے گہرا تعلق ہے .یہ ایسی تعلیم ہے جو ان کے رویے اورطرز عمل میں ماحولیاتی اہمیت کا احساس اجاگر کرے.

چڑیوں کی چوں چوں، کبوتروں کی غٹرغوں کا شور بھی اچھا نہیں لگتا تھا۔ بس میں نے ایک دم سے حکم دیا۔ یہ سارے باغ اجاڑ دیے جائیں۔ پھول پتے نوچ کر پھینک دیے جائیں۔ چڑیوں کو مار دیا جائے۔ باغ میں سونے چاندی کے پھولوں کے پودے لگائے جائیں ان میں سونے چاندی کی گھنٹیاں باندھی جائیں۔''

''بس میرا حکم ہونے کی دیر تھی تمام باغ اجڑ گئے۔ چڑیاں مرگئیں تتلیاں بھاگ گئیں اور جگہ جگہ سونے چاندی کی گھنٹیاں لگادی گئیں۔ مگر اس کے بعد کیا ہوا یہ مت پوچھو! کیا ہوا کنول نے حیرت سے پوچھا۔''

یہ کہانی چونکہ بچوں میں دلچسپی پیدا کرنے کے لیے لکھی گئی ہے اس لیے اس کی بنت میں کہانی کے تمام خصائل موجود ہیں اور ساتھ میں پیغام بھی موجود ہے کہ اپنے آس پاس کے ہرے بھرے ماحول کو ختم کرنے سے کیا کیا نقصانات ہو سکتے ہیں اس کہانی میں کہانی نویس نے یہی پیغام دینے کی کوشش کی ہے۔ اگر ہم اپنے آس پاس موجود ہرے بھرے باغ کو نقصان پہنچا دیں تو ماحول آلودہ ہو جائے گا اور آس پاس کے رہنے والے تمام جاندار پر مہلک اور مضر اثرات مرتب ہوں گے۔

کان کی خراش، فرحت قمر کی کہانی ہے اس میں انھوں نے صوتی آلودگی سے سماج میں کیا نقصان پہنچ سکتے ہیں اس کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ کہانی کچھ اس طرح شروع ہوتی ہے کہ رضوانہ اور خالد کے ابو امی شادی میں گئے ہوئے ہیں گھر اکیلا ہے، یہ دونوں بھائی بہن اپنے گھر میں اور دوستوں کو بلا لیتے ہیں سبھی دوست مل کر ہنگامہ شروع کرتے ہیں تیز تیز آواز نکالتے ہیں وہیں پڑوس میں رہنے والے رضوی صاحب کی طبیعت خراب ہے، انھیں ان کی آواز ناگوار گزرتی ہے، وہ اپنے کمرے سے نکل کر بچوں کے پاس آتے ہیں اور ان کو شور کے نقصانات بڑے ہی پیار سے سمجھاتے ہیں۔ اقتباس دیکھیں:

''جی ہاں'' رضوی صاحب نے فوراً کہا۔ جب کوئی خواہ مخواہ شور کرتا ہے تو اسی طرح پڑوسیوں کو بھی برا لگتا ہے۔ اصل میں لوگ زیادہ تر آوازیں خواہ مخواہ ہی پیدا کرتے ہیں۔ زور زور سے بولتے ہیں زور زور سے ریڈیو اور ٹی وی چلاتے ہیں لاؤڈ اسپیکر کا استعمال کرتے ہیں اور خواہ مخوہ چلاتے ہیں۔ اسی خواہ مخواہ کی آوازیں تو شور ہیں اور ہماری صحت پر برا اثر ڈالتی ہیں''

تو سنو'' جس طرح سے گرمی کو تھرمامیٹر کی ڈگری کی اکائی سے ناپا جاتا ہے یا فاصلوں کو میٹر اور کیلو میٹر سے اسی طرح شور کو ڈسی بل کی اکائی سے ناپا جاتا ہے۔ اب جیسے سڑک کے ٹریفک سے 90 ڈیسی بل شور پیدا ہوتا ہے، بڑے پریس میں یہ شور 100 ڈیسی بل ہو جاتا ہے اور جب کوئی جیٹ جہاز اڑان بھرتا ہے تو 120 ڈیسی بل شور پیدا کرتا ہے انسان کے کان 140 ڈیسی بل تک شور برداشت کر سکتے ہیں۔ اگر شور اس سے زیادہ بڑھ جائے تو آدمی کے کان پھٹ سکتے ہیں۔ اسی لیے بے کار کی پر شور باتوں کو سمع خراشی کہا جاتا ہے جس کا مطلب ہے کان کی خراش۔''

مذکورہ بالا اقتباس میں کہانی کار نے بے حد عمدگی سے بچوں کو زیادہ شور اور ہنگامے کے نقصانات سے باخبر کرنے کی کوشش کی ہے اور یہ بھی بتانے کی کوشش کی ہے کہ اس طرح کا ماحول نہیں پیدا کرنا چاہیے جو پاس پڑوس کے لوگوں کو ناگوار خاطر گزرے اور جس کی وجہ سے دل آزاری ہو کیوں کہ یہ چیزیں بھی ہمارے ماحول کو مکدر کرتی ہیں۔

''مچھلی بنا ننھیالا۔ نہیں نہیں'' سریکھا پانند یکر کی کہانی ہے اس کہانی میں پانی کی آلودگی اور اس سے ہونے والے نقصانات کو کہانی کے ذریعے پیش کیا گیا ہے۔ کہانی کا سیاق یہ ہے کہ دنو کے اسکول کی چھٹی ہوئی ہے اور گھر کے لوگوں نے اس کے ننھال جانے کا ارادہ کر رکھا ہے یہ سن کر دنو بہت خوش ہے کہ ننھیال میں اسے موج مستی کرنے کا اور دوستوں کے ساتھ گھومنے پھرنے کا موقع ملے گا اور ساتھ میں ماما کے ساتھ ندی پر مچھلی پکڑنے کا مزہ لگ، مگر جب وہ اپنے ننھیال پہنچتا ہے تو سارا مزہ خراب ہو جاتا ہے مچھلیوں کی بیماری پھیلی ہوئی ہے جسے کھا کر لوگ بیمار پڑ رہے ہیں۔ جس مقصد سے دنو وہاں گیا اسی پر پابندی لگ جاتی ہے۔ اس کہانی میں اس کے اسباب کا پتا کچھ اس طرح سے چلتا ہے۔ اقتباس دیکھیں۔

'' آؤ بابو میں دکھاتا ہوں'' کہہ کر بوڑھا بابا اسے تھوڑی دور لے گیا۔ وہاں بڑے بڑے کئی بھگونوں میں کئی رنگوں کا پانی ابل رہا تھا۔ دو لوگ ناریل کے ریشے

اس میں ڈال کر ڈنڈوں سے ہلاتے اور اوپر نیچے کر کے، باہر نکال کر سوکھنے کے لیے پھیلا دیتے اب ان میں سے کسی کا رنگ ہلکا لال کسی کا نیلا اور کسی کا ہرا ہو گیا تھا۔

دنو نے پوچھا'' یہ جو بچا ہوا پانی یا رنگ آپ نے پھینکا تھا وہ کہاں جاتا ہے'' ڈھلان ہے نہ تھوڑی سی۔ بہہ کر جاتا ہوگا ندی میں۔ بابا نے بتایا۔ ندی میں'' دنو نے پوچھا۔ ہاں اور کہاں جائے گا۔ دو فرلانگ پر تو ہے جھواری، اسی سے تو پانی لاتے ہیں! ابھی یہاں نل کہاں لگے ہیں۔ بابا نے بتایا۔'' اب سمجھ گیا کہہ کر دنو ماما کے پاس بھاگا آیا۔

ماما مچھلیاں کیوں بیمار ہوتی ہیں اور کھانے والے کیوں بیمار پڑتے ہیں میں سمجھ گیا۔ آؤ میں بتاتا ہوں دنو ماما کا ہاتھ پکڑ کر کھینچتے ہوئے بولا۔ یہ دیکھو ماما یہ رنگ کا گندا پانی۔ یہ لوگ یہاں پھینک رہے ہیں وہ بہہ کر ندی میں جا رہا ہے اسی سے ندی کی مچھلیاں بیمار پڑ رہی ہیں اور انھیں کھا کر سارو رڈے کے لوگ بیمار ہوئے ہیں۔ دنو جلدی جلدی بولا۔

پر ڈاکٹر بابو رنگ کے پانی میں گندا کچھ نہیں ہوتا رنگ پھینکنے والوں میں سے ایک آدمی بولا۔

دیکھو یہ سوکھا رنگ جو تم لوگ بناتے ہو ماما نے پوری بات ایک دم سمجھتے ہوئے کہا... اس میں کچھ کیمیائی چیزیں پڑی ہوتی ہیں۔ اور اسے کچھ اور پکا کرنے کے لیے سوڈا، تیزاب اور کچھ کیمیائی چیزیں ملاتے ہو۔ دیکھو تم خود بھی تو اسے ہاتھ سے نہیں ڈنڈے سے چلاتے ہو اور ڈنڈے سے ہی ریشے کو پھیلاتے ہو'' ماما نے سمجھاتے ہوئے کہا۔'' ہاں بابو ہاتھ سے چلائیں گے تو ہاتھ جل نہ جائیں گے۔ رنگ والا بولا۔'' اگر تمہارا ہاتھ جل سکتا ہے تو' جب یہ رنگ بہہ کر ندی کے پانی میں جاتا ہے' تو وہاں کی مچھلیوں پر بھی اثر ضرور ڈالتا ہوگا! اسی سے ندی کا پانی بھی گندہ ہو رہا ہے اور تمہارے یہاں اور گاؤں کے لوگ بھی بیمار پڑ رہے ہیں۔ دنو نے سمجھاتے ہوئے کہا۔''

کارخانوں میں تو سرکار اس کے لیے بندو بست کرتی ہے۔ تم لوگوں کو بھی کچھ کرنا ہوگا۔ تمہاری بھلائی اسی میں ہے۔ کیوں بابا آپ سمجھائیں گے اپنے سب ساتھیوں کو؟ ماما نے پوچھا۔

کیوں نہیں ڈاکٹر بابو! ہم بیمار تھوڑی ہی پڑنا چھاہتے ہیں''

مذکورہ کہانی سے یہ بات ظاہر ہوتی ہے کہ کس طرح سے کیمیکل اور دیگر فضلات کے پانی میں ملنے سے پانی آلودہ ہو جاتا ہے۔ اور اس کے اثرات کس طرح پانی میں رہنے والے جاندار اور اس علاقے میں رہنے والے لوگوں پر پڑتے ہیں۔

نیم کا پیڑ طلعت عزیز کی کہانی ہے جس میں انھوں نے فضائی آلودگی اور دیگر ماحولیاتی نقصان کو سمجھانے کی کوشش کی ہے۔ کہانی کا سیاق کچھ اس طرح ہے کہ ایک گھر کے آنگن میں نیم کا پیڑ تھا جسے کٹوا دیا گیا ہے بچے اسے دیکھ کر اداس ہیں پھر اس کے چچا چچی اور بھائی بہن شہر سے آتے ہیں تو باتوں باتوں میں پیڑ کٹنے کے کیا نقصان ہیں اسے بتایا گیا ہے۔

ابا بہت خوشی خوشی گاؤں میں ہونے والی تبدیلیوں کا ذکر کر رہے تھے۔ لیکن بڑے چچا اس سے زیادہ خوش نہیں تھے۔ اسلم بھائی کا کہنا تھا کہ اس گاؤں کا نقشہ ہی بدلتا جا رہا ہے، یہ تو بالکل شہر ہوتا جا رہا ہے۔

یہ تو اچھی ہی بات ہے نا۔ ہم گاؤں والوں کو بھی ترقی کرنی چاہیے۔ ابا نے کہا۔ لیکن یہ سوچو اس ترقی کے لیے تم کیا کھو رہے ہو؟ بڑے چچا بولے۔ یہ کھلا آسمان یہ پاک صاف تازہ ہوا۔ یہ چڑیاں، یہ جانور، ندی کا شفاف میٹھا پانی۔ کیا یہ سب ایسے ہی رہیں گے؟ کیوں اس کو کیا ہوگا؟ ہمارے پاس ندی بھی رہے گی اور آسمان بھی۔ ابا نے کہا۔

ماسٹر جی نے کچھ رک کر جواب دیا۔ اصل میں خود انسان نے ہی اب ماحول کے اس تال میل کو کچھ بگاڑ دیا ہے۔ مثال کے طور پر اس نے اپنی ضرورت کے لیے دھڑا دھڑ پیڑ کاٹ کر جنگل صاف کر دیے۔

پیڑ کٹنے سے سب سے پہلا نقصان تو یہی ہے کہ ہوا گندی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بارش کا پیڑوں کے ساتھ بھی کافی گہرا رشتہ ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ سمندر سے پانی بھر کر ہوا بھاری ہو جاتی ہے تو وہ ایسے علاقوں کی طرف چلتی ہے جہاں کی ہوا سورج کی گرمی سے گرم ہو کر ہلکی ہو جاتی اور اوپر اٹھنے لگتی ہے۔ سمندر سے آنے والی بھاری ہوا اس جگہ کو بھرنے آتی ہے جو ہلکی ہوا نے خالی کی تھی۔ اب اگر اس علاقے میں پہاڑ ہوں تو ہوا ان سے ٹکرا کر بارش کرتی ہے۔ میدانی علاقے میں پہاڑ تو ہوتے نہیں یہاں پیڑ ہی اس ہوا کو بارش دینے میں مدد دیتے ہیں۔ اگر پیڑ نہ ہوں تو یہ ہوا آندھی کی شکل میں اس علاقے سے تیزی سے نکل جاتی ہے''

ہاں ایک اور رشتہ بھی ہے پیڑوں سے پانی کا۔ پیڑ بارش کے پانی کو اپنی جڑوں کی وجہ سے زمین میں بہت گہرا نہیں رسنے دیتے۔ اگر پیڑ نہ ہوں تو اس علاقے کے کنویں اور تالاب سوکھ جائیں۔ اور پھر یہ پیڑ زمین کے پانی کو سورج کی روشنی سے بچا کر اسے ابخارات یا بھاپ بن کر اڑنے سے روکتے ہیں۔ ایک اور بہت اہم کام بھی یہ پیڑ کرتے ہیں جسے تم نے اپنی کتابوں میں بھی پڑھا ہوگا''

کیا؟ دونوں نے ایک ساتھ پوچھا

پیڑ کٹنے سے سب سے پہلا نقصان تو یہی ہے کہ ہوا گندی ہوتی ہے۔ لیکن اس کے علاوہ بارش کا پیڑوں کے ساتھ بھی کافی گہرا رشتہ ہے۔ ہوتا یہ ہے کہ سمندر سے پانی بھر کر ہوا بھاری ہو جاتی ہے تو وہ ایسے علاقوں کی طرف چلتی ہے جہاں کی ہوا سورج کی گرمی سے گرم ہو کر ہلکی ہو جاتی اور اوپر اٹھنے لگتی ہے۔ سمندر سے آنے والی بھاری ہوا اس جگہ کو بھرنے آتی ہے جو ہلکی ہوا نے خالی کی تھی۔ اب اگر اس علاقے میں پہاڑ ہوں تو ہوا ان سے ٹکرا کر بارش کرتی ہے۔

وہ یہ کہ جب بارش کا پانی تیزی سے بہتا ہے تو پیڑوں کی جڑیں زرخیز مٹی کو پانی کے ساتھ بہہ جانے سے روک لیتی ہے ہیں اگر یہ پیڑ نہ ہوں تو یہ مٹی بہہ کر دریا میں چلی جائے اور دریا سے سمندر کی تہہ میں جا کر بیٹھ جائیں اس سے اس علاقے کی زمین فصلیں اگانے کے قابل ہی نہ بچے۔ اور تو اور اگر پہاڑ پر جمی برف کے پگھلنے کے بعد تیزی سے بہتے پانی کو اگر یہ پیڑ کم نہ کریں تو یہ پانی میدانی علاقوں میں باڑھ بن کر تباہی مچائے گا۔

مذکورہ تمام کہانیاں اس طور پر اہم ہیں کہ وہ ماحول کے توازن اور تناسب سے تعلق رکھتی ہیں اور بچوں کو ماحول کی آلودگی اور اس کے مسائل کو سمجھانے کی غرض سے لکھی گئیں ہیں جب کہ کہانیوں کو پڑھنے کے بعد یہ احساس نہیں ہوتا کہ یہ پوری طرح سے مقصدی کہانیاں بن کر رہ گئیں ہیں اس میں کہانی کی تمام خوبی موجود ہے اور ساتھ ساتھ ہر جگہ کہانی کی آمد کا بھی احساس ہوتا ہے جو ان تمام کہانیوں کو دلچسپ بنانے میں کلیدی کردار ادا کرتا ہے خاص بات یہ ہے کہ یہ کہانیاں بچوں کے لیے بچوں کی زبان میں ہی لکھی گئی ہیں اور بچوں کی ذہنی استطاعت کو پیش نظر رکھ کر لکھی گئی ہیں جس کی وجہ سے ان کی معنویت دو چند ہو جاتی ہے اور اس کی افادیت میں چار چاند لگ گیا ہے اگر اس طرح کی کہانیوں کو اسکولی نصاب کا حصہ بنایا جائے تو یہ بعید نہیں کہ ہماری نئی نسل ایک اہم علم سے بہرہ مند ہو سکے گی بلکہ ماحولیاتی بگاڑ کے خاتمے کے لیے معاون بھی ثابت ہوگی پھر اس عالمی خطرے سے بچنا ہمارے لیے بے حد آسان ہوگا۔

■

Dr. Zahid Nadeem Ahsan
Dept of Urdu, Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

نقد مثنوی کاشف الحقائق کے آئینے میں

سلمی محمد رفیق

امداد امام اثر کے مطابق شاعری رضائے الٰہی کی صحیح نقل ہے جو الفاظ با معنی کے ذریعے وجود میں آتی ہے۔ اگر تجزیہ کیا جائے تو ان کا یہ تصور شعری کہیں نہ کہیں افلاطونی تصور شاعری سے جا ملتا ہے کہ دنیا ایک حقیقی عالم مثال کی ایک نقل ہے۔ امداد امام اثر کے نزدیک دنیا کی دو حیثیت ہے۔ ایک عالم خارج جس میں مادہ شامل ہے اور دوسرا عالم باطن جس میں مادہ نہیں بلکہ امور قلبیہ داخل ہیں۔ اسی تقسیم کے مطابق انھوں نے شاعری کو بھی دو قسموں میں تقسیم کیا ہے۔ ایک Objective اور دوسرا Subjective۔ انھوں نے شعرا کی بھی تقسیم اسی تصور کے تحت کی ہے۔ ان کے خیال میں کچھ شعرا عالم خارج کو بیان کرنے اور ان کو شعری پیکر میں ڈھالنے پر مکمل دسترس رکھتے ہیں مثلاً نظیر اکبر آبادی عالم خارج کو بہتر انداز میں پیش کرنے پر قدرت رکھتے ہیں اور میر تقی میر عالم باطن کے اظہار پر قدرت کاملہ رکھتے ہیں۔ ان کے علاوہ کچھ شعرا ایسے بھی ہیں جو دونوں تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہیں اور وہی اصل میں عظیم شاعر کہلاتے ہیں۔ امداد امام اثر اس قسم کے شعرا میں میر انیس کو شامل کرتے ہیں۔ انھوں نے میر انیس کو 'ہومرس' سے مرجح بتایا ہے اور یہ بات بھی غور طلب ہے کہ ان کے نزدیک ہومرس کا مرتبہ ورجل، فردوسی اور ملٹن جیسے عظیم تخلیق کاروں سے بھی بڑھا ہوا ہے۔ اسی طرح امداد امام اثر نے واضح طور پر شاعری کو اعلی اخلاق کی تربیت کا ذریعہ بتایا ہے۔ اصل میں امداد امام اثر جس سرزمیں یا جس دور کے پروردہ ہیں وہاں اخلاق اور تہذیبی وراثت کی پاسبانی بہت اہمیت کی حامل اور فرض عین کا درجہ رکھتی تھی۔ ظاہر ہے شاعر ہو یا نقاد، مصنف ہو یا مبصر سب اپنے عہد اور اس کے مزاج سے کسی نہ کسی حد تک شعوری یا غیر شعوری طور پر متاثر ہوتے ہیں۔ تنقید کے میدان میں امداد امام اثر بھی اپنے پیش رو یعنی الطاف حسین حالی اور شبلی نعمانی وغیرہ سے متاثر نظر آتے ہیں۔ الطاف حسین حالی کے مطابق جس طرح شاعری سے نفسیاتی جذبات مشتعل ہوتے ہیں اسی طرح شاعری سے روحانی اطمینان بھی حاصل ہوتا ہے۔ 'مقدمہ شعر و شاعری' کا ہر قاری واضح طور پر حالی کا 'مذہبی ذہن' محسوس کر سکتا ہے۔ امداد امام اثر اور حالی میں البتہ یہ فرق ضرور ہے کہ حالی شاعری کو براہ راست اخلاق کی تربیت یا تلقین کا ذریعہ نہیں قرار دیتے ہیں جبکہ امداد امام اثر واضح طور پر شاعری کو اخلاق آموزی کا ذریعہ مانتے ہیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ وہ میر انیس کو سب سے بڑا شاعر مانتے ہیں کیونکہ ان کا کمال جس صنف میں عروج کو پہنچا اس کا موضوع ہی سراسر اخلاقی ہے۔ امداد امام اثر کا شاید یہ عقیدہ ہی ہے جس کے سبب میر انیس کے متعلق ان کی تحریر پڑھ کر ہر قاری اس بات کو محسوس کیے بنا نہیں رہ سکتا۔

جہاں تک صنف مثنوی کا تعلق ہے تو اس کے متعلق امداد امام اثر کا خیال ہے کہ اس میں ہمہ گیری اور وسعت ہے اور اسی وسعت کا ذکر الطاف حسین حالی نے بھی کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ اس صنف شاعری میں شاعر اپنا کمال دکھا سکتا ہے۔ یہ بات بھی غور طلب ہے کہ دنیا کی بڑی بڑی منظوم تصانیف اسی صنف میں پیش کی گئی ہیں۔ ہومر، ورجل، ملٹن، فردوسی، بالمیکی، ویاس وغیرہ نے اسی صنف میں دنیا کو شاہکار عطا کیے ہیں۔ امداد امام اثر کو اس بات کا شدید احساس ہے کہ اردو میں کوئی ایسی مثنوی نہیں لکھی گئی جو مذکورہ بالا شعرا کے مقابل پیش کی جا سکے۔ ان کے مطابق میر انیس ملکی تقاضے کے سبب اس صنف کی طرف توجہ نہیں کر سکے ورنہ وہ ضرور اس صنف میں ایسا شاہکار تخلیق کرتے جو دنیا کے سامنے پیش کیا جا سکے۔ ان کا بیان ملاحظہ ہو:

''اگر مرثیہ نگاری کے لیے یہ صنف شعرا میں مروج ہوتی تو حضرت بھی کوئی نہ کوئی تصنیف ایلیڈ، پیراڈائس لاسٹ،

شاہنامہ، رامائن اور مہابھارت کے رنگ کی چھوڑ جاتے۔''
(کاشف الحقائق، امداد امام اثر، قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، نئی دلی، 1982، ص 560)

امداد امام اثر نے اپنی ضخیم کتاب ''کاشف الحقائق'' میں 112 صفحات میں صنف مثنوی پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔ مثنوی کے فن اور بالخصوص اس کے مضامین کو فارسی و اردو کی مثنویوں کی مثالوں کے ذریعے واضح کرنے کی بھرپور سعی کی ہے۔ انھوں نے دنیا کے اہم ترین Epics کا بھی ذکر کیا ہے اور بعض پر قدرے تفصیل سے گفتگو بھی کی ہے۔ کسی حد تک تقابل اور موازنہ بھی پیش کیا ہے۔ انھوں نے مثنویوں کی تقسیم ان کے مضامین کے اعتبار سے کی ہے۔ مثلاً رزمی مضامین کے لیے انگریزی میں پیراڈائس لاسٹ، یونانی میں ایلیڈ، لاطینی میں اینیڈ اور سنسکرت میں رامائن ومہابھارت وغیرہ۔

امداد امام اثر کے مطابق مثنوی نگاری میں صرف وہ شاعر کمال حاصل کرسکتا ہے جس کے اندر نہ صرف امور ذہنیہ بلکہ امور خارجیہ کو قلم بند کرنے کی بھرپور صلاحیت ہو۔ ایسا شاعر جو صرف امور داخلیہ کو بیان کرنے پر قدرت رکھتا ہو یا اس کے برخلاف محض امور خارجی کی پیش کش میں مہارت رکھتا ہو وہ مثنوی نگاری کا حق ادا نہیں کرسکتا ہے اور اس طرح وہ کوئی قابل قدر کارنامہ پیش نہیں کرسکتا ہے۔ وہ مثنوی نگاری کے لیے شاعر کو اس بات کا بھی مکلف بناتے ہیں کہ اس کو معاملات عالم کا حتی المقدور علم بھی ہو۔ ساتھ ہی اس کو مصور عالم بھی ہونا چاہیے۔ ان تمام خصوصیات کا حامل شاعر ہی مثنوی نگاری کا حق ادا کرسکتا ہے۔

کاشف الحقائق میں انھوں نے جن مثنوی نگاروں کا ذکر کیا ہے وہ ہیں میر تقی میر، مومن خان مومن، میر حسن، دیا شنکر نسیم اور محمد رفیع سودا۔ ان کا کہنا ہے کہ ہر زبان میں انھیں شعرا نے بہترین مثنویاں لکھی ہیں جو داخلی اور خارجی دونوں امور کو ضبط مضمون میں لانے کی قدرت رکھتے تھے۔ یہی وجہ ہے کہ وہ میر تقی میر کو غزل کے میدان کا شہسوار اور سلطان المتغزلین تو مانتے ہیں کیوں کہ ان کو داخلی بندش پر قدرت حاصل تھی لیکن ان کی مثنویوں کو زیادہ قدر کی نگاہ سے نہیں دیکھتے ہیں۔ ان کا کہنا ہے کہ وہ داخلی رنگ لیے ہوئے ہیں۔ اسی طرح وہ مومن کی تمام مثنویوں کے بارے میں کہتے ہیں کہ وہ بھی داخلی رنگ کی حامل ہیں۔ جیسا کہ اہل ادب سے یہ امر پوشیدہ نہیں ہے کہ میر اور مومن دونوں بنیادی طور پر غزل کے شاعر ہیں اور یہی رنگ ان کی مثنویوں میں بھی نمایاں ہے۔ البتہ ان کی مثنویوں میں وہی فرق ہے جو ان کی غزلوں میں ہے۔ مومن خان مومن کی مثنویاں وقت انگیز ہیں۔ مجرد داخلی شاعری کرنے والا کبھی اعلی مثنوی تخلیق نہیں کرسکتا ہے اسی بنا پر میر و مومن اعلی غزل گو ضرور ہیں مگر اچھے مثنوی نگار نہیں۔ میر کی مثنوی نگاری کے متعلق وہ لکھتے ہیں:

''میر لاریب سلطان المتغزلین تھے۔ مگر حضرت کی مثنوی نگاری سے ظاہر ہوتا ہے کہ جو درجہ غزل سرائی میں حاصل ہے وہ مثنوی نگاری میں نہیں ہے۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ آپ کو صرف مضامین داخلی کی بندش کی بڑی قابلیت حاصل تھی لیکن مثنوی نگاری کی وہی شاعر داد دے سکتا ہے جو مضامین خارجی کی بندش پر بھی پوری قدرت رکھتا ہے۔ یہ قدرت آپ کو بھی حاصل نہ تھی۔ اس لیے آپ کی مثنویاں تمام تر داخلی پہلو کی شاعری سے خبر دیتی ہیں...''
(کاشف الحقائق، ص 580)

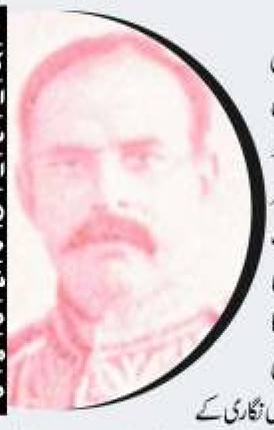

امداد امام اثر کے مطابق مثنوی نگاری میں صرف وہ شاعر کمال حاصل کر سکتا ہے جس کے اندر نہ صرف امور ذہنیہ بلکہ امور خارجیہ کو قلم بند کرنے کی بھر پور صلاحیت ہو۔ ایسا شاعر جو صرف امور داخلیہ کو بیان کرنے پر قدرت رکھتا ہویا اس کے بر خلاف محض امور خارجی کی پیش کش میں مہارت رکھتا ہو وہ مثنوی نگاری کا حق ادا نہیں کر سکتا ہے اور اس طرح وہ کوئی قابل قدر کارنامہ پیش نہیں کر سکتا ہے۔ وہ مثنوی نگاری کے لیے شاعر کو اس بات کا بھی مکلف بناتے ہیں کہ اس کو معاملات عالم کا حتی المقدور علم بھی ہو۔ ساتھ ہی اس کو مصور عالم بھی ہونا چاہیے۔ ان تمام خصوصیات کا حامل شاعر ہی مثنوی نگاری کا حق ادا کر سکتا ہے۔

امداد امام اثر نے میر حسن دہلوی کی مثنوی 'سحر البیان' پر نہایت مبسوط اور تفصیلی گفتگو کی ہے۔ انھوں نے مثنوی کے باقی شعرا کے سلسلے میں ایک دو صفحات یا چند مثالوں پر اکتفا کیا ہے گویا بر سبیل تذکرہ لیکن میر حسن کی مثنوی پر ستر صفحات پر مشتمل تبصرہ ہے۔ میر حسن کی مثنوی پر ان کو شاعری کا خاتمہ نظر آتا ہے۔ ان کی تحریر پڑھ کر ہر قاری با آسانی ان کی پسندیدگی کو محسوس کرسکتا ہے۔ بلاشبہ میر حسن کی مثنوی نہایت اہم اور قابل قدر سرمایہ ہے۔ اس کی تہذیبی، اخلاقی، تمدنی حیثیت مسلم ہے۔ امداد امام اثر کا یہاں تک کہنا ہے کہ اس کی مجموعی خوبیوں کی حامل کوئی مثنوی فارسی میں بھی نہیں ملتی ہے۔ ان کا یہ بیان البتہ اہل علم و دانش کے نزدیک قابل بحث ہوسکتا ہے۔ انھوں نے اس مثنوی کی نو خوبیوں کی نشاندہی کی ہے

جو حسب ذیل ہیں: (1) فطری زبان (2) قصے کا تناسب (3) تشبیہات و استعارات کے استعمال کا مذاق صحیح (4) مبالغے کا سچی شاعری کے منافی نہ ہونا (5) ملک کے رسم و رواج کا صحت کے ساتھ بیان کرنا (6) معاملات خارجی کا بیان بطرز تصویر (7) امور ذہنیہ اور واردات قلبیہ کا پرتاثیری کے ساتھ قلمبند کرنا (8) قصے کا اخلاقی و تمدنی حیثیت کا متحمل ہونا (9) امور ذہنیہ اور معاملات خارجیہ کے بیانات کے فطری اسلوب کا حامل ہونا۔

مذکورہ بالا نکات ہی ان کی تنقیدی بصیرت کو واضح کرنے کے لیے کافی ہیں۔ ان کی تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ ظاہر ہے امداد امام اثر نے انھیں خطوط پر مثنوی کی تنقید کی بنیاد رکھی ہے اور اپنی بیش بہا آرا سے اردو تنقید میں اہم اضافے کیے ہیں۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ امداد امام اثر شاعری کو اخلاقی تربیت سے آزاد نہیں رکھتے ہیں اس بنا پر جہاں وہ اس مثنوی کی تعریف کرتے نہیں تھکتے وہیں بے نظیر اور بدر منیر کے وصل کے بیان کو ہدف تنقید بھی بنایا ہے۔ ان کا بیان ملاحظہ ہو:

''اس مثنوی کی داستانوں میں صرف نا مطبوع داستان یہی ہے۔ کاش میر حسن اس داستان کو داخل مثنوی نہ کیے ہوتے یا اس داستان میں اس طرح کے بے باکانہ وصل کے پہلو کو رقم نہ کرتے۔ اس داستان کے مضامین کوئی روحانی جلوہ نہیں رکھتے... یہ داستان مثنوی زہر عشق وغیرہ کا اخلاقی انداز رکھتی ہے... خوب ہوتا اگر میر حسن اس داستان میں انتظار وصل کو دکھاتے اور محبت کی پختگی کی تدریجی حالتوں کو بیان کرتے۔'' (کاشف الحقائق، ص 624)

امداد امام اثر کے مذکورہ بالا خیال پر اگر غور کیا جائے تو ہم جیسے ناقص العلم طلبا کے ذہن میں یہ سوال ضرور پیدا ہوتا ہے کہ اگر میر حسن اس قصے کو شامل مثنوی نہ کرتے تو کیا آج کے قاری کو اس وقت کے شہزادوں کے عشق اور کیفیت وصل کا اندازہ ہوتا، اور کیا وصل قبل از نکاح جو حقیقتاً اس دور کی عشرت پسندانہ طرز زندگی میں موجود تھا،

اس کو اخلاقی تربیت کے باعث یا تو غلط بیانی کر کے بدل دیا جاتا یا کم از کم اس پر پردہ ڈال دیا جاتا کہ وہ اخفا میں رہے۔ ایسا کرنا ادبی تخلیقات میں کس حد تک درست ہے؟

امداد امام اثر نے بڑی عرق ریزی اور دقت نظری سے مثنوی 'سحرالبیان' کا تجزیہ پیش کیا ہے اور پر مغز تبصرہ کیا ہے۔ ان کا خیال ہے کہ جس نے سحرالبیان سے لطف نہیں اٹھایا گویا وہ شاعری کے لطف ہی سے بے بہرہ رہا۔

دیا شنکر نسیم کی 'گلزار نسیم' کا ذکر انھوں نے تین صفحات میں کیا ہے۔ وہ اس کے اختصار اور زبان و بندش کی چستی کے معترف ہیں لیکن تناسب کے سلسلے میں غیر مطمئن نظر آتے ہیں۔ ان کے خیال میں سلسلہ کلام میں وہ تناسب نا پید ہے جو میر حسن کی مثنوی میں بھر پور ملتا ہے۔ تناسب ہی شاعری کا اصل حسن ہے۔ ''آوارہ ہونا بکاولی کا تاج الملوک کلچیں کی تلاش میں'' کے تحت جو اشعار ہیں ان کے متعلق امداد امام اثر کا بیان ملاحظہ ہو:

''شاعری کے اعتبار سے یہ اشعار اعلیٰ درجہ کے داخلی یا خارجی مضامین کی کوئی خوبی نہیں رکھتے۔ حکمت و فلسفہ سے تو ان کا لگاؤ ہی نہیں اور اخلاقی تعلیم کی بھی ان کو ہوا نہیں لگی ہے۔ فطری شاعری کے نمونے یہ اشعار ہرگز نہیں مانے جاسکتے ہیں۔ ان کی جو خوبیاں ہیں وہ مصنوعی انداز کی ہیں۔'' (ایضاً، ص 661)

امداد امام اثر نے صنف مثنوی کو مختلف مضامین کے تحت تقسیم کیا ہے۔

(1) رزمی مضامین: اس قسم کے مضامین کے سلسلے میں ان کا ماننا ہے کہ رزمی مثنوی کے لیے ضروری ہے کہ جو قصہ منظوم کیا جائے وہ اخلاقی، مذہبی اور تمدنی لحاظ سے ایسا ہو جو کسی خاص قوم کے اغراض سے متعلق ہو۔ اردو میں کوئی مثنوی اس معیار کو پوری نہیں اترتی۔ عربی میں یہ صنف موجود ہی نہیں ہے اور فارسی میں وہ شاہنامہ کو اس قبیل میں شامل کرتے ہیں۔ انگریزی میں پیراڈائیس لاسٹ، یونانی میں ایلیڈ اور اوڈیسی، لاطینی میں اینیڈ اور سنسکرت میں رامائن و مہابھارت اس معیار پر پوری اترتی ہیں۔ ان کے خیال میں اہل اردو نے اگر فارسی کے بجائے سنسکرت سے استفادہ کیا ہوتا تو اردو میں بھی شاہکار رزمی مثنویاں وجود میں آتیں، یا میر انیس نے اس صنف کی طرف توجہ کی ہوتی تو آج اردو کے ذخیرہ مثنوی میں شاہکار ہوتا۔ ان کی یہ رائے اس بنا پر ہے کہ سنسکرت میں ڈرامے کی روایت بہت مستحکم ہے اور مثنوی میں وہ ڈرامے کی خصوصیات کا پایا جانا احسن گردانتے ہیں اور اس کی بھر پور حمایت کرتے ہیں۔

(2) بزمی مضامین: اس ضمن میں انھوں نے فارسی میں یوسف زلیخا، لیلیٰ مجنوں، شکارنامے، ساقی نامے وغیرہ شامل کیے ہیں۔ انگریزی میں لارڈ بائرن، سر والٹر اسکاٹ، الیگزینڈر پوپ اور مور وغیرہ کی مثنویوں کو شامل کرتے ہیں۔

(3) حکمت آموز مثنویاں: امداد امام اثر کے مطابق اس زمرے میں آنے والی مثنویاں بکار آمد قسم میں شامل ہوتی ہیں۔ انھوں نے یہ بھی اشارہ کیا ہے کہ انگریزی میں اس قسم کی شاعری ڈائیڈ یکٹیک شاعری ہے (Didactic Poetry) جدید دور کے مشہور امریکی شاعر ایڈگر ایلن پو (Edagar Allan Poe) نے اس قسم کی شاعری کو غیر اہم بتایا ہے۔

(4) تصوف آمیز مثنویاں: اس میں انھوں نے مولانا روم کی مثنوی کو سب سے مقدم رکھا ہے اور بہتر بتایا ہے۔ ایران اور ہندوستان دونوں میں تصوف آمیز مثنویاں بڑی تعداد میں لکھی گئی ہیں لیکن اس سلسلے میں فارسی ادب میں تصوف آمیز مثنویوں کا جو ذخیرہ موجود ہے وہ اردو ادب میں نہیں ملتا۔ مولانا روم کی مثنوی سے بہت سی مثالیں بھی پیش کی ہیں اور قابل قدر تجزیہ بھی لیکن اس سلسلے میں اردو ادب سے کسی مثنوی کی مثال شامل مضمون نہیں ہے۔

(5) متفرق مضامین کی مثنویاں: اس قسم میں قصص اور حکایات پر مشتمل مثنویاں ہیں۔ غالب کی مثنوی آم کی تعریف بطور مثال پیش کی ہے اس کے علاوہ سودا کی کئی مثنویاں جو ہجو پر مشتمل ہیں۔ انھوں نے صرف مثالیں پیش کرنے پر اکتفا نہیں کیا ہے بلکہ ان پر قابل قدر تنقیدی نکات بھی ملتے ہیں جس سے ان کی تنقیدی بصیرت کی کیفیت کا اندازہ ہوتا ہے۔

بلا شبہ امداد امام اثر اردو ادب کے اہم تنقید نگار ہیں۔ ان کی تنقید نگاری کی مختلف جہات ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی تنقیدی بصیرت کے مختلف گوشوں پر مختلف پہلوؤں سے نظر کی جائے اور اس سے خاطر خواہ استفادہ کیا جائے۔ اس مضمون میں بہت تفصیل کی گنجائش نہیں ہے۔ لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ امداد امام اثر اپنے دور کے تنقید نگاروں میں ممتاز مقام کے مستحق ہیں۔

صنف مثنوی کے فن اور موضوع سے متعلق نہایت اختصار کے ساتھ ان کی آرا ملاحظہ ہو:

''واضح ہو کہ رزمی اور بزمی مثنویوں کا کمال یہ ہے کہ ان کی بندش مضامین اس درجہ کی سلجھی ہوئی ہو کہ قریب قریب ڈرامے کا لطف پیدا کر سکے۔ لاریب وہی مثنوی ڈرامے کا لطف پیدا کر سکتی ہے جو فطری مضامین اور فطری ترکیبوں پر مشتمل ہوگی... المختصر رزمی اور بزمی مثنویوں کو اس قدر نیچرل ہونا چاہیے کہ اگر ان کے مضامین میں ڈراما کی شکل میں بندش پائیں تو اس صنف شاعری میں آسانی اور لطافت کے ساتھ در آسکیں۔ حکمت آموز اور تصوف آموز مثنویوں کے لیے یہ امر درکار ہے کہ مسلم اور منقح مسائل حکمت و تصوف سے ان کا کوئی مضمون خلاف نہ ہو۔ اور دلیل و استدلال میں جھول واقع نہ ہو۔ ان قسموں کی مثنویوں میں بحد امکان شاعر کو مبالغہ پردازی سے تمام تر احتیاط لازم ہے۔ علاوہ اس کے طریقہ بیان ایسا ہو کہ سامع کے دل پر حسب مراد اثر پیدا کر سکے۔ متفرق مضامین کی مثنویوں کو بھی فطری بیانات سے خالی ہونا نہیں چاہیے۔ علاوہ اس کے ان کے مضامین کو مفید عام ہونا ضروری ہے۔ فحش گوئی اور ہذیان سرائی کو مثنوی نگاری سے کوئی تعلق نہیں ہے۔'' (ایضاً، ص 562)

بلا شبہ امداد امام اثر اردو ادب کے اہم تنقید نگار ہیں-ان کی تنقید نگاری کی مختلف جہات ہیں- ضرورت اس بات کی ہے کہ ان کی تنقیدی بصیرت کے مختلف گوشوں پر مختلف پہلوؤں سے نظر کی جائے اور اس سے خاطر خواہ استفادہ کیا جائے- اس مضمون میں بہت تفصیل کی گنجائش نہیں ہے-لیکن اتنا ضرور کہا جاسکتا ہے کہ امداد امام اثر اپنے دور کے تنقید نگاروں میں ممتاز مقام کے مستحق ہیں-

مذکورہ بیان کو سامنے رکھتے ہوئے ہم بخوبی کہہ سکتے ہیں کہ امداد امام اثر مثنوی میں داخلی اور خارجی دونوں امور کی کارفرمائی چاہتے ہیں۔ مزید برآنکہ وہ مثنوی کا رشتہ کہیں نہ کہیں ڈرامے کی صنف سے جوڑتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ نیچرل ہونا اور مبالغے سے پرہیز کی بات کسی طرح حالی سے مختلف نظر نہیں آتی۔ حالی، شبلی، محمد حسین آزاد اور عبدالرحمٰن بجنوری، کس کے نزدیک طریقہ بیان کا ایسا ہونا جو سامع کے دل پر اثر پیدا کرے اور مضمون کا مفید ہونا، شرط نہیں ٹھہرتا۔ پھر کیا یہ ناانصافی یا کم از کم کوتاہ بینی نہیں ہے کہ امداد امام اثر جیسا تنقید نگار آج تک اپنا اصل مقام اور صحیح قدر و منزلت سے محروم رہا۔ امداد امام اثر کو از سر نو پڑھنے اور سمجھنے کی ضرورت ہے۔ ان کی بیش بہا خدمات کو فراموش کر کے ہم نہ صرف اپنا بلکہ اردو ادب کا ایک بڑا نقصان کرانے کے ذمے دار ٹھہرائے جائیں گے۔ وہ اردو تنقید کا ایک اہم ستون اور روشن ستارہ ہیں۔

■

Dr. Salma Mohammed Rafiq
Dept. of Urdu
Jamia Millia Islamia
New Delhi - 110025

ماہنامہ معارف اور تحقیقات سلیمانی

اطہر حسین

سید سلیمان ندوی(1884-1953) کا شمار ممتاز علمی وادبی شخصیات میں ہوتا ہے۔انھوں نے علم وتحقیق کے مختلف موضوعات پر کتابیں تصنیف کیں۔تاریخ وسیرت کے علاوہ ادب وتحقیق کے موضوعات کا بھی انھوں نے احاطہ کیا۔ان کی گراں قدر علمی وتحقیقی خدمات کا ایک زاویہ ماہنامہ معارف بھی ہے،جس کا خاکہ علامہ شبلی نعمانی نے تیار کیا تھا۔مگر اس میں رنگ علامہ سید سلیمان ندوی نے بھرا۔معارف کا آغاز اس طرح ہوا کہ سو برس سے زائد کا عرصہ گذر جانے کے باوجود نہ صرف یہ مسلسل شائع ہورہا ہے بلکہ اس کے تمام شمارے محفوظ اور استفادہ کے لیے آن لائن موجود بھی ہیں۔ جولائی 1916 میں سید سلیمان ندوی نے اسے جاری کیا۔ 1953 تک انھوں نے ماہ نامہ معارف کی ادارت فرمائی۔واضح رہے کہ معارف بنیادی طور پر علمی اور تحقیقی رسالہ ہے۔

معارف کے علمی وادبی مضامین ومقالات کی طرح شذرات کو بھی اہمیت حاصل ہے۔ شذرات دراصل معارف کا اداریہ ہے۔جس کو اپنے اسلوب تحریر کی بنا پر غیر معمولی شہرت حاصل ہے۔ڈاکٹر اجمل ایوب اصلاحی شذرات کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مقالات کا حصہ معارف کی جان ہے اور شذرات اس کا دیباچہ اور دریچہ،لیکن کئی پہلوؤں سے شذرات کو خاص اہمیت حاصل ہے۔یہ عین ممکن ہے کہ کسی شمارے کے مقالات اتنے دقیق ہوں کہ بہت سے قارئین کے لیے اس میں دلچسپی کا سامان نہ ہو مگر شذرات،معارف کے سارے ناظرین پڑھتے ہیں،بلکہ سچ تو یہ ہے کہ سب سے پہلے شذرات ہی پڑھتے ہیں۔اداریہ کے لیے شذرات کا لفظ اس سے قبل 'الندوہ' میں استعمال کیا گیا تھا اور قیاس یہ ہے کہ یہ بھی علامہ شبلی کی ایجاد ہے اور اسے ان اولیات میں شمار کیا جانا چاہیے۔شذرات سونے کے چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں کو کہتے ہیں جو سونے کی کان سے چنے جاتے ہیں۔تاریخ پر ابن العباد حنبلی (ف: 1089ھ) کی کتاب 'شذرات الذہب فی تاریخ من ذہب' مشہور ہے۔اداریے میں مختلف موضوعات پر جو علاحدہ علاحدہ ٹکڑے لکھے جاتے ہیں ان کے لیے علامہ شبلی نے اس بلیغ لفظ کا انتخاب کیا تھا،پھر تو یہ ایسا عام ہوا کہ بہت سے لوگ اسے اداریے کا ہم معنی سمجھنے لگے۔علامہ شبلی نے الندوہ میں جو شذرات لکھے وہ تو شذرات الذہب تھے ہی،ان کے جانشینوں نے معارف میں جو اداریے لکھے وہ بھی علم وادب کا شاہکار تھے۔''[1]

شذرات معارف میں مدیران معارف کی نجی زندگی کے بعض گوشوں،علمی اسفار،علمی وادبی تحریکوں،انجمنوں اور اداروں کی سرگرمیوں کا احاطہ، معروف ادیبوں،شاعروں سے متعلق معلومات اور عربی،فارسی کے ساتھ ساتھ عالمی،ملکی اور مقامی سطح پر موجود اردو مطبوعات اور مخطوطات کے نادر ذخائر کی نشاندہی،قدیم ونایاب کتب کے علاوہ جدید مطبوعات کے تذکرے سب کچھ ہوتا ہے اور یہ معارف کے قارئین کے لیے معلومات کا ایک اہم خزانہ ہوتا تھا۔سید سلیمان ندوی نے تقریبا 37 سال تک معارف کے شذرات تحریر کیے جس میں ان تمام گوشوں کا انھوں نے احاطہ کیا۔ان کے شذرات تین جلدوں میں مدون ہوچکے ہیں۔مولانا عبد الماجد دریابادی شذرات سلیمانی کے حوالے سے لکھتے ہیں:

''صاحب معارف کی شذرات نگاری ایک خصوصی وامتیازی شان نگارش رکھتی ہے،بے لاگ لیکن نہ درشت نہ کرخت،عمیق لیکن نہ ادق نہ مغلق،رنگین لیکن نہ پر تکلف نہ ثقیل،سلیس لیکن نہ سطحی نہ عامیانہ،شگفتہ لیکن نہ تاویلانہ نہ خطیبانہ،جاندار لیکن نہ گرما گرم نہ پرخروش،صالح لیکن نہ خشک نہ مولویانہ،سلیمانی ادب وانشا کا اردو تاریخ ادب وانشا میں جو ایک خاص مقام ہے...اس کی اصل بنیاد ہی معارف کے ادارتی صفحات سے پڑی اور معارف کے شذرات نے بہتوں کے لیے ایک نئی راہ کھول دی۔''[2]

عبد الماجد دریابادی نے بجا طور پر نشاندہی کی ہے کہ شذرات معارف نے بہتوں کے لیے نئی راہ کھول دی ہے۔سید صاحب نے جس طرح قدیم متون کی بازیافت، شعرا وادبا کے احوال،نادر ونایاب قلمی وغیر مطبوعہ تحریریں، ملک وبیرون ملک کے کتب خانوں اور لائبریریوں میں موجود نایاب/کم یاب مخطوطوت کا تعارف بطور خاص پیش کرتے تھے۔اس سے جہاں کتابوں کے تئیں ان کی دلچسپی کا اندازہ ہوتا ہے وہیں معارف کے قارئین کو کتابوں سے باخبری بھی ہوتی تھی چونکہ اس زمانے میں رسل و رسائل اور ٹکنالوجی کی اتنی آسانی اور سہولت نہیں تھی اس لیے معارف کی یہ کوشش قدر کی نگاہ سے دیکھی گئی اور اسے کتاب اور علم دوستی سے تعبیر کیا گیا۔یہاں اردو ادب سے متعلق سید سلیمان ندوی اور ماہنامہ معارف کی بعض اہم تحقیقات کا تعارف پیش نظر ہے۔

میر اثر صوفی شاعر کے طور پر مشہور خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی اور صاحب دیوان شاعر تھے۔انھوں نے اردو کی مختلف شعری اصناف میں طبع آزمائی کی۔ان کے

دیوان میں غزلیں، رباعیات اور دو مثنویاں شامل ہیں۔ میر اثر کی مثنوی 'خواب وخیال' کو اردو ادب میں غیر معمولی اہمیت حاصل ہے۔ایک مدت تک یہ مثنوی کم یاب تھی۔ پہلی بار سید سلیمان ندوی نے 1917 میں معارف کے شذرات میں اس کی اطلاع دی۔وہ لکھتے ہیں:

''حضرت خواجہ میر درد کے چھوٹے بھائی میر اثر دہلوی اپنے زمانے کے مشہور شاعر تھے۔تصوف کو بے تکلف سہل ورواں اردو غزلوں میں ادا کرنا انھیں دونوں بھائیوں پر ختم تھا۔ان کی مثنوی 'خواب وخیال' اردو زبان کا ایک انمول سرمایہ ہے۔سال تصنیف 1125ھ ہے۔یہ مثنوی کم یاب ہے۔شمس العلما محمد حسین آزاد 'آب حیات' میں ایک دو فقرے سے زیادہ اس پر نہ لکھ سکے۔شاید یہ مثنوی انھیں ہاتھ نہ آئی۔مولانا حالی بھی مقدمہ دیوان میں اپنا نہ دیکھا ظاہر کرتے ہیں۔ ہم اپنے دوست مولوی بشیر الحق صاحب سب انسپکٹر سون برسا کے ممنون ہیں کہ ان کی وساطت سے یہ مثنوی مستعار ہمیں ہاتھ آسکی۔''[3]

یہ مثنوی انجمن ترقی اردو سے 1926 میں شائع ہوئی جسے مولوی عبدالحق نے مرتب کیا تھا۔مرتب نے اس پر ایک تفصیلی مقدمہ بھی لکھا مگر اس میں معارف کا ذکر نہیں کیا گیا۔مقدمہ میں خواب وخیال کے مخطوطوں کے بارے میں مولوی صاحب لکھتے ہیں:

''ان کے دیوان کی طرح ان کی مثنوی بھی بہت کم یاب ہے۔مجھے ایک مدت سے اس کی تلاش تھی اتفاق سے ایک نسخہ میرے برادر معظم شیخ ضیاء الدین نے مجھے بھیجا جو انھیں کہیں سے مل گیا تھا۔میں اس کی اصلاح وترتیب میں مصروف تھا کہ مولوی نجیب اشرف ندوی نے اطلاع دی کہ انھیں ایک نسخہ انجمن اصلاح دسنہ بہار کے کتب خانے میں دستیاب ہوا ہے۔جب انھیں یہ معلوم ہوا کہ میں انجمن کی طرف سے اسے شائع کرنے والا ہوں تو کمال عنایت سے وہ نسخہ میرے پاس بھیج دیا جس سے مجھے اپنے نسخے کی تصحیح میں بہت مدد ملی۔''[4]

> **اردو ادب کے مختلف گوشوں کی تفتیش و تلاش، نادر و نایاب کتب کی بازیافت اوران ذخیروں کی حفاظت کے حوالے سے معارف کی فکر مندی دیدنی ہے۔ علم دوستی کایہ رویہ اول تاآخر نمایاں ہے۔ نادر کتب سے دلچسپی دیکھ بہت سے قارئین بھی اپنے خطوط میںمعارف کو معلومات فراہم کرتے ہیں۔اردو نثر کی ایک اہم کتاب 'گربہ نامہ' (بلی نامہ)جس کے مصنف فقیر غلام علی آزاد ہیں۔**

مرزا محمد رفیع سودا (1712-1781) ایک قادرالکلام شاعر تھے۔انھوں نے غزل، رباعی، قصیدہ شہر آشوب، مرثیہ، ہجویات اور مدحیات غرض یہ کہ انھوں نے مختلف اصناف سخن میں طبع آزمائی کی مگر ان کی وجہ شہرت ان کے قصائد ہیں۔سودا کے قلمی ومطبوعہ دیوان کے سیکڑوں نسخے ہندوستان اور بیرون ملک میں موجود ہیں۔ڈاکٹر ہاجرہ ولی الحق نے دیوان سودا کو 1985 میں چھبیس نسخوں کی مدد سے مرتب کیا ہے اور ان تمام نسخوں کی اطلاع دی ہے جو ہندوستان اور ہندوستان سے باہر موجود ہیں۔ایسے ہی ایک اہم نسخے کی اطلاع سید سلیمان ندوی نے اگست 1922 کے شذرات میں دی ہے۔یہ نسخہ مختلف حیثیتوں سے اہم ہے۔سید سلیمان ندوی کتب خانہ آصفیہ میں موجود سودا کے قلمی دیوان کی اطلاع دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا حبیب الرحمٰن خاں شیروانی صدرالصدور دولت آصفیہ حیدآباد دکن کے کتب خانے میں سودا کے دیوان کا ایک نادر نسخہ بہم پہنچا ہے، علاوہ خوش خطی اور دیگر اوصاف ندرت کے ایک خاص بات اس میں یہ ہے کہ نسخہ عین اس وقت پایہ تکمیل کو پہنچ رہا تھا جب نادر شاہ اپنی قہار فوجیں لیے ہوئے دلی کے دروازے پر کھڑا تھا۔کاتب نے کتاب کے آخر میں لکھا ہے کہ یہ سطریں جس وقت لکھی جارہی ہیں نادر شاہ کی فوجیں شہر میں داخل ہورہی ہیں۔کیا یہ علمی یک سوئی کی عجیب وغریب مثال نہیں کہ جب شہر اضطراب اور بے چینی کی کروٹیں لے رہا تھا، ایک سوداز دۂ علم دیوان سودا کی کتابت میں مصروف تھا، یہ ذوق فن ہر بوالہوس کو کہاں نصیب۔''[5]

سودا کا ایک قدیم قلمی دیوان جو کم یاب تھا۔اگست 1922 کے شذرات میں سید صاحب نے اس نسخے کے دریافت کی اطلاع دی اور اس کا مختصر تعارف بھی لکھا یہی نسخہ ڈاکٹر ہاجرہ ولی الحق نے 1985 میں اپنے مقدمہ کے ساتھ شائع کیا۔

اردو ادب کے مختلف گوشوں کی تفتیش وتلاش، نادر ونایاب کتب کی بازیافت اور ان ذخیروں کی حفاظت کے حوالے سے معارف کی فکرمندی دیدنی ہے۔علم دوستی کا یہ رویہ اول تا آخر نمایاں ہے۔نادر کتب سے دلچسپی دیکھ بہت سے قارئین بھی اپنے خطوط میں معارف کو معلومات فراہم کرتے ہیں۔اردو نثر کی ایک اہم کتاب 'گربہ نامہ' (بلی نامہ) جس کے مصنف فقیر غلام علی آزاد ہیں۔سید صاحب شذرات میں لکھتے ہیں:

''ڈھاکہ سے ایک مخدوم نے جن کے کتب خانے کے بعض نوادر درحقیقت جواہرات میں تلنے کے لائق ہیں، ان میں سے ہمارے پاس 'گربہ نامہ' (بلی نامہ) ایک قصہ کی چندورقہ کتاب اس تمہیدی خط کے ساتھ بھیجی ہے، کہ مجھے یقین ہے کہ دارالمصنفین کے قبضے میں اگرچہ ایک بڑا کتب خانہ ہے لیکن شاید گربہ نامہ اس میں موجود نہ ہو اس لیے بازار سے دو پیسے کی خرید کر بھیجتا ہوں۔یہ اردو نثر میں گربہ مسکین کی مختصر سوانح عمری ہے۔زبان پرانی ہے مگر رواں۔قدیم اردو کے دستور کے مطابق حرف اضافت کی تقدیم وتاخیر ہے۔جابجا آیات قرآنی، احادیث، فارسی اساتذہ کے اشعار اور ہندی دوہے ہیں۔خیالات ومضامین سے مولویت جھلکتی ہے۔آخر میں مصنف نے اپنا نام فقیر غلام علی آزاد بتایا ہے۔اس سے مراد اگر میر غلام علی آزاد بلگرامی ہیں جیسا کہ قرائن کی شہادت ہے تو اس نظریے میں اب غور کرنا پڑے گا کہ اردو نثر کی سب سے پہلی کتاب فضلی کی 'دہ مجلس' ہے، جیسا کہ مولوی محمد حسین آزاد مرحوم کا دعوی ہے یا میر غلام علی آزاد کا چند ورقہ رسالہ ہے۔یہ دونوں بزرگ ایک ہی زمانے میں تھے۔''[6]

ڈھاکہ سے حکیم مولوی حبیب الرحمٰن خاں سید سلیمان ندوی کے نام ایک خط میں اردو لغت ومحاورات کی دو نادر کتب کی اطلاع دیتے ہیں جو کہ دریائے لطافت سے پہلے لکھی گئی۔اس خط سے نہ صرف یہ کہ اردو کی دو قدیم کتابوں کے متعلق واقفیت ہوتی ہے بلکہ محمد حسین آزاد کا نظریہ بھی باطل قرار پاتا ہے کہ انشاء اللہ خاں انشاء کی دریائے لطافت (1802) اردو قواعد کی پہلی کتاب ہے۔معارف جولائی 1917 کے شذرات میں اردو کی دو نادر کتب کی بازیافت کا ذکر کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''امپیریل لائبریری کلکتہ میں شمس البیان، اردو لغت ومحاورات میں ایک کتاب ہے جو دریائے لطافت سے پندرہ برس پہلے لکھی گئی ہے۔مجھ کو یاد آتا ہے کہ اس موضوع پر ندوہ کے کتب خانے میں بھی ایک کتاب موجود ہے۔ابھی حال میں ایک ناقص الطرفین رسالہ ہمارے دوست کے ہاتھ لگا ہے جس کا نام 'صرف اردو' ہے، رسالہ منظوم ہے اور پرانی زبان میں ہے، شیدا کوئی بزرگ ہیں، وہ اس کے مصنف ہیں۔لارڈ منٹو اور ڈاکٹر ہنٹر کی اس میں بڑی تعریف کی ہے۔سال تصنیف 1221ھ ہے۔دریائے لطافت سے ایک سال پہلے تصنیف پایا ہے، ازراہ عنایت یہ رسالہ ہمارے مطالعے کے لیے بھیجا ہے۔''[7]

'شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان' جس کے

مصنف مرزا محمد اسماعیل جان طپش ہیں۔ مرزا طپش دہلی کے رہنے والے تھے۔ عروض و بلاغت اور فن شعر کے ماہر تھے۔ فن شاعری خواجہ میر درد سے سیکھی تھی۔ خاندانی سپاہی تھے اس لیے فنون سپہ گری سے بھی واقفیت تھی۔ مرزا ایک اچھے شاعر بھی تھے بیاض طپش میں موجود ہندی کلام سے آپ کا تخلص 'سدا خیر' ثابت ہوتا ہے۔ 'شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان' مرزا طپش نے 1207ھ میں قیام مرشدآباد/ ڈھاکہ کے زمانے میں لکھی تھی۔ یہ کتاب چھوٹے سائز کے 96 صفحات پر مشتمل پتھر کے چھاپے پر مرشدآباد سے 1265ھ میں شائع ہوئی تھی۔[8]

اس کے علاوہ قصہ یوسف ذلیخا، بہار دانش، کلیات طپش، بیاض طپش وغیرہ مرزا طپش کی اہم کتابیں ہیں۔ 'شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان' کو عابد رضا بیدار نے خدابخش لائبریری پٹنہ سے 1977 میں شائع کیا۔ عابد رضا بیدار کتاب کی تدوین کے متعلق لکھتے ہیں:

''اب اس کتاب کے مطبوعہ نسخے بھی نایاب ہیں۔ ڈھاکہ کے حکیم حبیب الرحمٰن مرحوم کو اس کا ایک نسخہ ملا تھا۔ ایک نسخہ ڈاکٹر عندلیب شادانی کے پاس بھی تھا۔ جنھوں نے قاضی عبدالودود کی فرمائش پر ایک قلمی نسخہ کی مدد سے اس کا ایک ایڈیشن بھی تیار کیا تھا پھر خدا جانے اس کا کیا ہوا۔ رضا لائبریری رامپور میں بھی ایک نسخہ موجود ہے۔ ایک مخطوطہ بھی رضا میں محفوظ ہے لیکن یہ مطبوعہ نسخہ کے بعد کا ہے۔ ایک نسخہ ایشیاٹک سوسائٹی کلکتہ میں محفوظ ہے۔ ایشیاٹک سوسائٹی کے قلمی نسخہ اور رامپور کے مطبوعہ نسخہ کی نقل خدابخش کے لیے حاصل کی گئی ہیں اور ان کی بنیاد پر ایک نسبتہ بہتر نسخہ پیش کیا جارہا ہے۔''[9]

شذرات کے مطالعے سے سیکڑوں مخطوطات اور قدیم و جدید مطبوعات کے بارے میں معلومات ہوتی ہے۔ فروغ کتب معارف کا ایک مستقل موضوع رہا ہے۔ مدیران معارف کی ہمیشہ سے یہ کوشش رہی ہے کہ کسی قدیم و جدید مطبوعہ و غیر مطبوعہ کتاب کی اطلاع پہنچے تو بلا تاخیر اسے قارئین معارف تک پہنچا دیں۔ پٹنہ کے کتب خانے میں موجود ایک منظوم قلمی نسخے کا تعارف دسمبر کے شذرات میں سید سلیمان ندوی کراتے ہوئے لکھتے ہیں:

''پٹنہ کے کتب خانہ مشرقی میں اردو نظم کی ایک قدیم کتاب ہے، محمد امان قادری گورکھپور مصنف کا نام ہے۔ سال تصنیف 1170ھ ہے یعنی اس کی تصنیف پر 167 برس گذر چکے ہیں۔ حنفی فقہ کے مسائل اس میں منظوم ہوئے ہیں، سات ابواب پر عبادات و معاملات وغیرہ کے عنوانات سے اشعار ہیں۔ اس نظم کی خاص خصوصیت یہ ہے کہ بحر ایسی اختیار کی گئی ہے جو ہندی رامائن سے ماخوذ ہے۔ جس سے معلوم ہوتا ہے کہ اردو شاعری پر ہندی نے کس حد تک اثر کیا تھا۔''[10]

شذرات معارف سے سید سلیمان ندوی کے متعدد اسفار کا پتا چلتا ہے جن میں سفر لاہور، حیدرآباد، دہلی، لکھنؤ، بھوپال، ممبئی، میسور اور مدراس وغیرہ قابل ذکر ہیں۔ مذکورہ اسفار سے صرف احوال سفر ہی نہیں بلکہ نہایت کارآمد معلومات اور فکر انگیز نکات زیر بحث آتے ہیں۔ ان میں تاریخی، جغرافیائی معلومات، سیاسی و سماجی حقائق، علمی و ادبی اداروں کا تذکرہ، قدیم کتب خانوں، اشاعتی اداروں، معروف شخصیات سے ملاقات کی دلچسپ روداد ہے۔ سید سلیمان ندوی کا معمول تھا کہ جس شہر کا بھی سفر کرتے وہاں اداروں اور کتب خانوں کا ضرور معائنہ کرتے تھے اور وہاں موجود کتابوں اور شخصیات کا احوال قارئین معارف تک ضرور پہنچاتے تھے۔ اکتوبر 1937 کے سفر مدراس میں سید صاحب مدراس یونی ورسٹی کے شعبہ تحقیقات علمیہ بھی گئے۔ وہاں موجود دیوان بیدار کے دو نسخوں کا احوال بیان کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مولانا محوی عربی، فارسی کے خوش مذاق عالم اور اردو کے اچھے شاعر ہیں۔ انھوں نے چھ سات برس کے اندر کئی کتابوں کا ترجمہ اور تصحیح کی ہے... دلی کے ایک شاعر میر محمد بیدار کا دیوان مقدمے اور تصحیح کے ساتھ شائع کیا ہے۔ بیدار کا یہ دیوان 1935 میں چھپ کر شائع ہو چکا ہے۔ اب کیا عجیب بات ہے کہ اس کے دو برس بعد 1937 میں ہندوستانی اکیڈمی الہ آباد نے اسی دیوان کے کسی دوسرے قلمی نسخے کو غیر مطبوعہ سمجھ کر جناب جلیل احمد صاحب قدوائی کے مقدمے اور تصحیح کے ساتھ شائع کیا ہے۔ اگر ہمارے علمی اداروں میں آپس میں علمی روابط ہوں تو اس قسم کی محنت اور سرمائے کی بربادی سے ہم محفوظ رہیں۔''[11]

سید سلیمان ندوی نے ملک کے اس حصے کو (مدراس) ہندستان کا پچھواڑا کہا ہے۔ معارف مئی 1939 میں سید سلیمان ندوی کا ایک تحقیقی مقالہ 'بعض پرانے لفظوں کی نئی تحقیق' کے عنوان سے شائع ہوا۔ اس مضمون میں انھوں نے اردو زبان میں رائج بہت سے قدیم الفاظ کی تحقیق، ان کی اصل اور وجہ تسمیہ بیان کی ہے۔ انھوں نے الفاظ کی مفصل تاریخ کے ساتھ ساتھ لفظ کی اصل زبان اور کس طرح ہندوستان پہنچا اور یہاں کن معنوں میں مستعمل ہوا، ان تمام باتوں کو نہایت علمی انداز میں پیش کیا ہے۔ اس ذیل میں انھوں نے ناشتہ نہاری، سلفہ، قاب، رکابی، جہاز، سرخی، نستعلیق، تماشا، احدی، قورمہ، شوربہ، کباب، راز، مستری، خراد اور ساہول وغیرہ الفاظ کی تحقیق کی ہے اور ان الفاظ کی منتقلی کے جو اسباب بتائے ہیں دیکھنے کے لائق ہیں۔ سید سلیمان ندوی لفظ خراد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''بڑھیوں کی بول چال میں ایک لفظ 'خراد' اور 'خرادنا' ہے، میز کرسی یا پلنگ وغیرہ کے پایوں کو چھیل کر کہیں موٹا، کہیں پتلا کہیں گاؤدم وغیرہ مختلف شکلیں دیتے ہیں، یہ خالص عربی لفظ 'خرط' ہے، عربی میں اس کے معنی اس طرح چھیلنے کے ہیں کہ اس کی اوپری پرت اتر جائے، اس سے 'خراط' بنا، یعنی وہ آلہ جس سے لکڑی کو اس طرح چھیلا جائے۔ وہ خراط ہمارے یہاں خراد ہوا اور اس سے خراد پر چڑھنا محاورہ اور خرادنا مصدر بنا، یہ لفظ اس حقیقت کا پتہ دیتا ہے کہ لکڑی کی یہ صنعت کاری مسلمانوں کے ذریعے ہندوستان میں آئی اور پھیلی۔''[12]

سید سلیمان ندوی نے معارف اکتوبر 1922 کے شمارے میں 'اوراق پارینہ' کے عنوان کے تحت ایک قدیم نصابی کتاب 'مجمع گنج' کا تعارف کرایا ہے۔ سید صاحب کو یہ کتاب دسنہ بہار کے ایک کتب خانے کی ردی کتابوں میں ملی۔ نادر مخطوطات اور مطبوعات کے حوالے سے معارف کے صفحات پر یہ اولین تحریر ہے۔ 1845 میں یہ کتاب کمپنی کے عہد میں کلکتہ اسکول بکس سوسائٹی میں چھپی۔ یہ کتاب کمپنی کے قائم کردہ ابتدائی اسکول میں پڑھائی جاتی تھی اور طلبہ کو بطور انعام بھی دی جاتی تھی۔

کتاب کا یہ نسخہ 1855 میں دسنہ بہار کے حاجی وزیرالدین کو گیا اسکول کے مشرقی صیغے کی طرف انعام میں ملی تھی۔ یہ چھوٹی تقطیع کے 217 صفحات میں ہے اور اس میں 28 مضامین اور عنوانات ہیں۔ اس میں ہندوستان میں پیدا ہونے والی نیل، روئی، افیون، ململ اور ریشم کے کپڑے، گنا، تنباکو اور ہندوستان کی تجارت کے علاوہ اس وقت کے ہندوستان کے احوال کا تذکرہ ہے۔ انگلستان کے گزشتہ عہد جہالت پر بھی ایک باب شامل ہے۔ کتاب کا اہم باب اسکندریہ کے مشہور کتب خانہ کے جلائے جانے کے متعلق ہے جس کا ملزم مسلمانوں کو ٹھہرایا گیا ہے۔ کتاب میں مسلمانوں کو یہ مشورہ دیا گیا ہے کہ وہ یورپ کے علوم و فنون کو اپنی زبان میں منتقل کریں۔ کتاب کے عنوان کے نیچے درج عبارت سے کتاب کے لکھے جانے کے مقصد کا علم ہوتا ہے:-

''عقل کو روشن کرنے والی تعلیموں کا اور دانائی سکھانے والی... کا اس میں اکثر ملکوں کی بستی، شہر اور ادیبوں کے احوال کا بیان ہے۔ ہندوستانی لڑکوں کے لیے انگریزی سے زبان اردو میں ترجمہ کیا گیا ہے۔''[13]

سید سلیمان ندوی کتاب کے مقصد کی وضاحت کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''مقصد یہ ہے کہ ہندوستانی طلبہ کو جدید معلومات سے روشناس کیا جائے، اس لیے جو باتیں اس وقت نئی معلوم ہوتی تھیں اس کا ذکر ہے۔ (2) چونکہ ہندوستان میں اس وقت تک مسلمان طاقتور عنصر تھے، اس لیے یہ دکھانے کی کوشش کی گئی ہے کہ مسلمانوں اور عیسائی بادشاہوں کے درمیان تعلقات، جنگ وصلح بہت پرانے ہیں۔ جنگ صلیبی کا ایک باب ہے، فتح اندلس کا ذکر ہے، سلطان روم کا بیان ہے۔ (3) اس وقت تک انگریز زیادہ عقلمند یا متکبر نہیں ہوئے تھے اس لیے پہلے اپنی واپنے ملک اور اپنے براعظم یورپ کی جہالت کا ذکر کرکے پھر اپنی عقلمندی اور دانشوری اور ترقی کا ذکر کیا ہے۔ چنانچہ انگلستان کے گذشتہ عہد جہالت پر بھی ایک باب ہے۔''[14]

مجمع گنج سے تاریخ ادب کا کوئی بڑا مسئلہ وابستہ نہیں مگر معارف کے ابتدائی تحقیقی رجحانات کے حوالے سے اس کی اہمیت سے انکار نہیں کیا جاسکتا۔ واضح رہے کہ انگریزوں کی آمد کے بعد تراجم کی روایت کو فروغ ملا۔ اس نوع کی بہت سی نصابی کتب مرتب کی گئیں۔ مرزا غالب کی انشائے غالب بھی نصابی ضرورت کے تحت مرتب کی گئی تھی نیز ایک کتاب 'جواہر منظوم' (اشاعت : 1867) بھی ہے۔ یہ انگریزی نظموں کا منظوم اردو ترجمہ ہے۔ گارساں دتاسی کے خطبے میں اس کتاب کا ذکر ہے۔[15]

اردو زبان کی پیدائش کے متعلق سید سلیمان ندوی کے نظریے سے ہر شخص بخوبی واقف ہے۔ سید صاحب نے سرزمین سندھ کو اردو کا مولد قرار دیا ہے۔ اس کے ثبوت میں انھوں نے متعدد شواہد پیش کیے ہیں۔ معارف جولائی 1933 میں سید صاحب کا ایک مضمون 'اردو کیوں کر پیدا ہوئی' شائع ہوا۔ سید سلیمان ندوی کا یہی مضمون نقوش سلیمانی میں شامل ہے۔ تحقیقی نوعیت سے یہ مضمون بہت اہم ہے۔ اردو زبان کن کن مراحل سے گزری کن کن راجاؤں نے اس کی پرورش کی اور کس طرح ایک زبان کی شکل اختیار کی غرض یہ کہ انھوں اردو زبان کی مفصل تاریخ بیان کی ہے اور اسی مضمون میں اردو زبان کے سندھ میں پیدا ہونے کا نظریہ بھی پیش کیا ہے۔ اردو کی پیدائش کے سلسلے میں سید سلیمان ندوی لکھتے ہیں:

''مسلمان سب سے پہلے سندھ میں پہنچے ہیں اس لیے قرین قیاس یہی ہے کہ جس کو ہم آج اردو کہتے ہیں اس کا ہیولی اسی وادی سندھ میں تیار ہوا ہوگا۔''[16]

معارف میں غالبیات کا ایک بڑا خزانہ ہے۔ حیات غالب، کلام غالب، تلامذہ غالب اور غالب پر لکھی گئی کتابوں کے حوالے سے سیکڑوں تحقیقی وتنقیدی مضامین، تبصرے اور شذرات شامل ہیں۔ اس میں سے ایک نسخہ حمیدیہ کی دریافت ہے۔ نسخہ حمیدیہ غالب کا وہ قلمی دیوان ہے جس میں غالب کا مکمل اردو کلام ہے۔ یہ نسخہ غالب نے 1821 میں مکمل کیا تھا جب ان کی عمر صرف 24 سال تھی۔ اس کے کاتب حافظ معین احمد تھے۔ کتب خانے حمیدیہ بھوپال میں اس کی بازیافت ہوئی اس لیے اس کتب خانہ کی طرف منسوب ہے۔ غالب کا یہ قلمی دیوان گمنام تھا سب سے پہلے سید سلیمان ندوی نے مولانا عبد السلام ندوی کے توسط سے ادبی دنیا کو باخبر کیا۔ وہ شذرات معارف میں اس کی خبر دیتے ہوئے لکھتے ہیں:

''ہمارے دوست مولانا عبدالسلام ندوی شعر الہند کی خاطر آج کل کتب خانوں کی خاک چھان رہے ہیں، اسی سلسلے میں وہ بھوپال بھی پہنچے ہیں۔ وہاں کے کتب خانہ حمیدیہ میں انھیں ایک انمول جواہر ملا یعنی مرزا غالب کا اصلی مکمل اردو دیوان بلا خذف وانتخاب جو موجودہ دیوان سے ضخامت میں دونا ہے، نہایت عمدہ مطلا نسخہ ہے۔ کسی خوش مزاج کے ہاتھ وہ پڑا تھا، اس نے ان غزلوں کا مطبوعہ غزلوں سے مقابلہ کرکے اختلاف نسخ بھی لکھ دیا ہے۔''[17]

اس تحقیق کو معارف میں غالب تحقیق کا نکتہ آغاز کہا جاسکتا ہے۔ نسخہ حمیدیہ کی اس خبر کے بعد بہت سے لوگوں نے اس کو بھوپال آکر دیکھا ان میں سید ہاشمی فرید آبادی، امتیاز علی عرشی، جبکہ استفادہ کرنے والوں میں عبد الرحمٰن بجنوری، پروفیسر حمید خان اور ڈاکٹر عبد اللطیف شامل ہیں۔ نسخہ حمیدیہ کی بحث وتحقیق کا یہ سلسلہ 1918 سے 2017 تک رہا۔ جنوری 1944 کے بعد اس نسخے کی کوئی اطلاع نہیں ملتی۔ پروفیسر ظفر احمد صدیقی کے مطابق 2015 میں شہاب ستار اور مہر افشاں فاروقی کی کوشش سے دوبارہ اس کی بازیافت ہوئی (18) جسے عبدالرحمٰن بجنوری کے انتقال کے بعد مفتی انوار الحق نے عبدالرحمٰن بجنوری کی تقریظ کے ساتھ شائع کیا مگر انھوں نے معارف کا ذکر کہیں نہیں کیا ہے، جبکہ معارف ہی نے سب سے پہلے اس کے بازیافت کی اطلاع دی تھی۔ نسخہ حمیدیہ کی اشاعت کے بعد عبد القوی دسنوی، ابومحمد سحر، گیان چند جین، جگن ناتھ آزاد اور دیگر لوگوں نے اس پر لکھا جس سے غالبیات میں نئے مباحث کا آغاز ہوا، جس کا سہرا معارف کے سر ہے۔

ان معروضات سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ اردو تحقیق کے کارواں کو سمت ورفتار دینے میں سید صاحب کی

اردو زبان کی پیدائش کے متعلق سید سلیمان ندوی کے نظریے سے ہر شخص بخوبی واقف ہے۔ سید صاحب نے سرزمین سندھ کو اردو کا مولد قرار دیا ہے۔ اس کے ثبوت میں انہوں نے متعدد شواہد پیش کیے ہیں۔ معارف جولائی 1933 میں سید صاحب کا ایک مضمون 'اردو کیوں کر پیدا ہوئی' شائع ہوا۔

ان تحریروں کا اہم کردار ہے۔ بے شمار کتابیں اور تحقیقی مقالات میں شذرات سلیمانی کی بازگشت کو بآسانی محسوس کیا جاسکتا ہے۔ شذرات معارف کے اس پہلو پر کم ہی روشنی ڈالی گئی ہے۔

حوالے وحواشی:

1. ماہنامہ معارف، مئی 2017، ص 354
2. سید سلیمان ندوی، شذرات سلیمانی، حصہ اول، دارالمصنفین اعظم گڑھ 2012 ص 4
3. ماہنامہ معارف، شذرات اپریل 1917
4. مولوی عبدالحق، مقدمہ خواب وخیال، انجمن ترقی اردو 1926 ص ج
5. ماہنامہ معارف، شذرات اگست 1922
6. ماہنامہ معارف، شذرات اپریل 1919
7. ماہنامہ معارف، شذرات جولائی 1917
8. عابد رضا بیدار، شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان، خدا بخش لائبریری، 1977 ص 7
9. عابد رضا بیدار، شمس البیان فی مصطلحات الہندوستان، خدا بخش لائبریری، 1977 ص 7
10. ماہنامہ معارف، شذرات، دسمبر 1918
11. ماہنامہ معارف، شذرات دسمبر 1937
12. ماہنامہ معارف مئی 1939، ص 331
13. ماہنامہ معارف اکتوبر 1922
14. ماہنامہ معارف، اکتوبر 1922 ص 311
15. عمیر منظر، رشید حسن خاں کلام غالب کے شارح، غالب انسٹی ٹیوٹ نئی دہلی۔ 2019 ص 69
16. سید سلیمان ندوی، نقوش سلیمانی، 1967 ص 250
17. ماہنامہ معارف شذرات، ستمبر 1918
18. ماہنامہ معارف مئی 2017

■

Athar Husain
504/122 Shabab, Market Nadwa
Nadwa Road, Daliganj
Lucknow - 226020 (UP)
Mob.:8074378735
Email.: atharhusainmanuu@gmail.com

مشتاق احمد آئی پٹیل

ورچوئل تدریس میں گوگل کلاس روم کا استعمال

ٹکنالوجی ہماری زندگی کے مختلف شعبوں پر اثر انداز ہو رہی ہے۔ تعلیم کے میدان میں اس کے گہرے اثرات دیکھنے کو ملتے ہیں۔ ایک طرف جہاں گوگل ہمیں دنیا بھر کی معلومات یکجا کر کے فراہم کرتا ہے اور اسے ہم عام طور پر ایک سرچ انجن کے طور پر جانتے ہیں، وہیں اس کے اندر بہت سے اپلیکیشن بھی ملتے ہیں، جن کا استعمال ہم اپنے روزمرہ کے مختلف کاموں کے لیے کرتے ہیں۔ ان میں 'یوٹیوب، گوگل پلے، گوگل میپ، جی میل، گوگل ڈرائیو، گوگل پلس' وغیرہ بہت ہی کارآمد ایپس ہیں، جن کا استعمال ہر خاص و عام کرتا ہے۔ ان کے علاوہ گوگل مزید ایپس فراہم کرتا ہے، جن کی لمبی فہرست ہے، ان میں سے ایک گوگل کلاس روم بھی ہے، جو معلم کا دوست مانا جاسکتا ہے۔ جیسے کے نام سے ظاہر ہے، اس کا استعمال ایک 'مجازی کلاس روم' کے طور پر کیا جاسکتا ہے لیکن ہمیں اس پر یہ تشویش ضرور ہوتی ہے کہ اگر یہ مجازی ہے، تو کیا اکتساب واقعی ہوتا ہے؟ اور اگر ہوتا ہے تو کیا یہ بھروسہ مند اکتساب ہے؟

تدریس واکتساب کا انتظام وانصرام

اگر اسکول و کلاس کو ایک جاندار شئے تصور کریں تو اس کے اندر واقع ہونے والے تدریس، اکتساب، تعین قدر اور ان تمام کا انتظام وانصرام بدن میں دوڑتے خون کی طرح ہے، جو اسکول کو زندہ رکھنے کے لیے ضروری ہے۔ جہاں تعلیم گود سے گور تک یعنی زندگی بھر چلنے والا عمل ہے وہیں تدریس مخصوص مقاصد کے تئیں ارادتاً حاصل کیے جانے والے نشانات ہیں۔ اس کے بخوبی حصول کے لیے کلاس کا انتظام وانصرام (Management) ہونا ضروری ہے۔ کلاس مینجمنٹ وہ عمل ہے جس کے ذریعے اس بات کو یقینی بنایا جاتا ہے کہ طلبا کو کلاس روم کے اسباق آسانی سے فراہم کیے جائیں۔ یہ تمام سرگرمیاں مجازی طور پر آن لائن نظام کے ذریعے بھی انجام دے سکتے ہیں، اگر اس طرح کے کلاس روم اساتذہ کے لیے دستیاب ہوں۔

عام کلاس روم کا تصور

تدریس کے دوران استعمال ہونے والا کلاس روم ایک مخصوص اصطلاح کا درجہ رکھتا ہے۔ یہ ایک ایسی جگہ ہے جہاں اساتذہ، طلبہ اپنے نصاب سے متعلقہ مواد پر بحث و مباحثہ کرتے ہیں۔ ان کی تدریس و اکتساب کو کارگر بنانے کے لیے مختلف وسائل کا استعمال کرتے ہیں، اور انھیں، کتاب، اشکال، آن لائن پروگرام یا تجربات کی روشنی میں سکھاتے ہیں۔ جب تدریس واکتساب کا عمل پورا ہوجائے تو اس کا تیقن کرنے کے لیے اساتذہ طلبہ کا تعین قدر کرتے ہیں، جس کے لیے مختلف قسم کے سوالات جیسے معروضی یا مختصر جوابی سوالات کا استعمال بھی کرتے ہیں۔ ان تمام سہولیات اور افعال کی انجام دہی کے لیے ایک مفت ایپ جو ہمیں دستیاب ہے وہ گوگل کلاس روم ہے۔

گوگل کلاس روم کیا ہے؟

سب سے پہلے ہمارے ذہنوں میں یہ سوال ابھرتا ہے کہ یہ گوگل کلاس روم ایپ کیا ہے؟ انٹرنیٹ اور گوگل پر موجود مواد کا جائزہ لیا جائے تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ یہ بہت ہی کارآمد ایپ ہے، جو اسکول، اساتذہ اور طلبہ کے لیے کارآمد ہے۔

Google کلاس روم اسکولوں کے لیے ایک مخلوط اکتساب فراہم کرنے والا پلیٹ فارم ہے جس کا مقصد بنا کاغذ کے استعمال کے تفویضات کی تخلیق، تقسیم اور گریڈنگ کو آسان بنانا ہے۔ Google کلاس روم ایک مفت اپلیکیشن ہے جس کے تحت بغیر کاغذی نگہداشت کے طالب علموں اور اساتذہ کو اسائنمنٹس پر مذاکرات، تعاون اور تنظیم کرنے کی سہولت دستیاب ہے۔

اس کے لیے سب سے پہلے ایک عام کلاس روم کا موازنہ گوگل کلاس روم ایپ سے کیا جائے، تو پتہ چلتا ہے کہ ایک کلاس روم میں معلم، متعلم، ہوتے ہیں اور تدریس واکتساب کے لیے ضروری وسائل موجود ہوتے ہیں اور تعلیم کے مقصد کے حصول کے لیے پہلے سے طے شدہ مقاصد کے جائزہ لینے کے لیے جانچ وتعین قدر کیا جاتا ہے۔ اس طرح تعلیم کے حصول کو یقینی بنایا جاتا ہے۔ اس

> Google کلاس روم اسکولوں کے لیے ایک مخلوط اکتساب فراہم کرنے والا پلیٹ فارم ہے جس کا مقصد بنا کاغذ کے استعمال کے تفویضات کی تخلیق، تقسیم اور گریڈنگ کو آسان بنانا ہے۔ Google کلاس روم ایک مفت اپلیکیشن ہے جس کے تحت بغیر کاغذی نگہداشت کے طالب علموں اور اساتذہ کو اسائنمنٹس پر مذاکرات، تعاون اور تنظیم کرنے کی سہولت دستیاب ہے۔

تمام عمل میں طلبہ کا ریکارڈ، ان کی ترقی کا ریکارڈ اور ان کے اکتسابی وسائل کی فراہمی، اور فریقین کے درمیان باہمی ربط کو فراہم کرنا شامل ہے۔ مزیدار بات یہ ہے کہ گوگل کلاس روم میں یہ تمام سہولیات موجود ہیں۔ تدریس واکتساب کے لیے نہ ہمیں کوئی کمرہ جماعت کی ضرورت ہوتی ہے، اور نہ کچھ خرچ کرنے کی۔ معلم و متعلم دونوں ایک دوسرے سے ایک پلیٹ فارم پر جڑے رہتے ہیں اور اس کے لیے بھی انھیں کوئی سافٹ ویئر خریدنے کی ضرورت نہیں ہوتی ہے، کیونکہ گوگل کلاس روم ہر گوگل کے استعمال کنندہ کے لیے مفت اور آسانی سے دستیاب ہے۔

گوگل کلاس روم کیسے شروع کیا جاسکتا ہے؟

گوگل کلاس روم استعمال کرنے کے لیے صرف گوگل آئی ڈی ہونا ضروری ہے۔ سب سے پہلے ہم اپنی گوگل آئی ڈی کا استعمال کر کے اپنے اکاؤنٹ میں داخل ہو سکتے ہیں۔ پھر اسکے بعد اپلی کیشن کے ذریعے گوگل کلاس روم کو مزید آپشن کے ذریعے جوڑ سکتے ہیں۔ اگر آپ استاد ہیں اور پہلی بار اس کا استعمال کر رہے ہیں تو اپنی کلاس یا درجہ کا اندراج کر سکتے ہیں۔ ایک بار اگر معلم اپنی کلاس کا اندراج کرلیتا ہے تو کئی آپشن کھل جاتے ہیں۔ یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ کی کلاس اعلیٰ سطح کے طلبہ کی ہی ہو، صرف یہ ضروری ہے کہ ان طلبہ کے پاس اپنا ای میل آئی ڈی ہو جس کے ذریعے آپ ان کو یہاں مدعو کر سکتے ہیں۔

گوگل کلاس روم کے اہم اجزا

اب جب آپ اپنی کلاس یعنی کلاس کے صفحے میں داخل ہوتے ہیں تو نظر آنے والے آپشنس کے ذریعے آپ مندرجہ ذیل کام کر سکتے ہیں۔

عنوان بنانا – Add Topic اس لنک کے ذریعے آپ اپنے کلاس اور مضمون سے متعلق تمام اسباق کے عنوانات اس میں شامل کر سکتے ہیں، اس سے معلم کو اپنے مواد مضمون کو ڈیجیٹلا ئیز ڈ کرنے کا موقع ملتا ہے۔ یہ اس سلسلے کی پہلی کڑی ہے، اگر اس میں کوئی غلطی ہو جائے اور ترمیم کی ضرورت ہو تو آپ اس عنوان کو بدل بھی سکتے ہیں یا غیر ضروری عنوان کو ڈیلیٹ کرنے کی سہولت بھی ہے۔ یہاں پر عنوانات داخل کرنے کی کوئی قید نہیں ہے، یعنی ایک استاد اپنے مضمون سے متعلق دس سے پندرہ یا اس سے زائد عنوانات کو بھی شامل بحث کر سکتا ہے۔

اعلان کرنا – Create Announcement یہ ایک دوسرا اہم مرحلہ ہے، اور جس طرح ایک معلم موضوع تدریس کا کمرہ جماعت میں اعلان کرتا ہے اسی طرح یہاں پر وہ اپنے طلبہ کے لیے اعلان کرتا ہے۔ یہ اعلان اوپر طے کیے گئے کسی بھی عنوان سے متعلق ہوسکتا ہے، اور جس طرح استاد اپنے طلبہ میں سے کسی ایک، چند یا تمام سے مخاطب ہوتا ہے، اسی طرح یہاں بھی اپنے طلبہ کو ایڈریس کرسکتا ہے۔ عام کلاس روم میں وہ اعلان کر کے اپنے تدریسی مواد کو پیش کرتا ہے، جو آواز، پریزینٹیشن، اشکال یا لکھاوٹ کی شکل میں ہوتا ہے، اسی طرح یہاں پر وہ ان تمام شکلوں میں یہ مواد پیش کرسکتا ہے۔ اسکے لیے اساتذہ اپنے کمپیوٹر کے مواد کو گوگل ڈرائیو کے ذریعے اپ لوڈ کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ وہ اپنے گوگل ڈرائیو پر رکھا ہوا مواد بھی سیدھے اپ لوڈ کر سکتے ہیں۔ ایک عام کمرہ جماعت میں پڑھانے والا استاد اپنے مواد جیسے سائنس کے تجربات کو طلبہ کے سامنے کر کے پیش کرتا ہے، جسے ڈیمانسٹریشن کہا جاتا ہے۔ اب اگر دیکھا جائے کہ کیا اس طرح کی سہولت ہمیں گوگل کلاس روم میں دستیاب ہے تو اس کی گنجائش یہاں پر نظر آتی ہے۔ ایک معلم دو طرح سے مواد کو یہاں پر جوڑ سکتا ہے، جس کا فائدہ طلبہ کی تدریس میں موثر ثابت ہوگا، کیونکہ یہ ان کی سماعت ہی نہیں، بلکہ بصارت کو بھی متاثر کرتا ہے۔ اب مضمون سے متعلق متن یا آڈیو، ویڈیو مواد کو جوڑنے کے لیے استاد 'یو ٹیوب' میں موجود مواد کو سرچ کرنے کی گنجائش موجود ہے اور ساتھ ہی ساتھ کسی مخصوص لنک کے URL کو جوڑنے کی سہولت ہے۔ اس کے علاوہ بھی اگر ایک استاد اپنے طلبہ کے ساتھ کوئی کتاب، یا ٹیکسٹ، پی ڈی ایف، آڈیو، ویڈیو، ملٹی میڈیا کا لنک جوڑنا چاہے تو اس کی سہولت بھی مہیا ہے۔ یعنی کل ملا کر ایک معلم نہ صرف یہ کہ طلبہ کی تدریس میں اپنی مہارت کا بلکہ بیرونی وسائل کے استعمال کی سہولت بھی رکھتا ہے۔

اسائنمنٹ دینا – Create Assignment

ایک معلم تدریس کے بعد طلبہ کو گھر کے کام تفویض کرتا ہے، اس طرح کی سہولت یہاں پر بھی موجود ہے۔ ایک معلم اپنے اسائنمنٹ کے لنک سے اس کو ایڈ کرسکتا ہے، اس کو کوئی نام دینا ہوگا، اور اس سے متعلق ضروری ہدایات اگر دی جائیں، تو طلبہ کے لیے کارآمد ہوں گی۔ چونکہ ایک موضوع کو مختلف پریڈس میں پڑھایا جاتا ہے تو ہر پریڈ کے لیے بھی اسائنمنٹ دینے کی گنجائش یہاں موجود ہے۔ معلم اپنے طلبہ کو تفویضات ایک معینہ وقت میں جمع کرنے کو کہتا ہے، اور یہاں اگر اس طرح کی کوئی وقت متعین کیا جائے تو طلبہ اس وقت تک ہی اپنے اسائنمنٹ داخل کر سکتے ہیں۔ ان تفویضات کو مکمل کرنے کے لیے معلم اگر کوئی حوالہ جاتی مواد دینا چاہے تو اس کو بھی ویب سائٹس کے مواد، آڈیو، ویڈیو، لنک، ملٹی میڈیا کے ذریعے فراہم کرنے کی گنجائش موجود ہے۔ استاد کے ذریعہ تیار کردہ مواد کو اپنے گوگل ڈرائیو کی مدد سے جوڑ کر بھی فراہم کیا جاسکتا ہے۔ Flipped Learning کا طریقہ کار ہے جو کہ تدریس واکتساب کے ایک اہم طریقہ کے طور پر مشہور ہے۔

سوال بنانا – Create Question استاد اپنے طلبہ سے تدریس کے دوران مختلف سوالات بھی کرتا ہے، یہ سوالات مخصوص طلبہ سے بھی ہوتے ہیں اور تمام سے بھی۔ اگر گوگل کلاس روم کا ذکر کیا جائے تو ان سوالات کو بنانے کی گنجائش موجود ہے، اور اس کے لیے ضروری ہدایات بھی دی جاسکتی ہیں، تاکہ طلبہ کو انھیں حل کرنے میں مشاورت ملے۔ تفویضات کی طرح مواد کے ادخال کی میعاد بھی دی جاسکتی ہے اور معاون وسائل کی فراہمی بھی ممکن ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ سوالات مختصر ہونگے یا کثیر جوابی ہوں گے، استاد اس کو بھی طے کرسکتا ہے۔ اب چونکہ اس طرح کے سوالات میں طلبہ کی نشوونما ممکن ہے اس لیے طلبہ ان کو آپس میں شیئر بھی کر سکتے ہیں اور

> **اگر آپ استاد ہیں اور پہلی بار اس کا استعمال کررہے ہیں تو اپنی کلاس یا درجہ کا اندراج کرسکتے ہیں. ایک بار اگر معلم اپنی کلاس کا اندراج کرلیتا ہے تو کئی آپشن کھل جاتے ہیں. یہ ضروری نہیں ہے کہ آپ کی کلاس اعلیٰ سطح کے طلبہ کی ہی ہو. صرف یہ ضروری ہے کہ ان طلبہ کے پاس اپنا ای میل آئی ڈی ہو جس کے ذریعے آپ ان کو یہاں مدعو کرسکتے ہیں.**

ضرورت پڑنے پر ان کی تصحیح بھی ممکن ہے۔ استاد ان سوالات کو پہلے سے تیار کر کے رکھ سکتے ہیں اور پہلے سے طے شدہ وقت پر پوسٹ بھی کر سکتے ہیں یا ان کو ڈرافٹ بنا کر رکھ کر ترمیم بھی کر سکتے ہیں۔ اگر ان سوالات کو بعد میں موزوں نہ پایا جائے تو ان کو ڈیلیٹ بھی کیا جا سکتا ہے۔

پوسٹ کا دوبارہ استعمال – Reuse Post چونکہ ٹیچر مختلف جماعتوں اور مختلف مضامین کو پڑھا رہے ہوتے ہیں، اور ان مضامین میں پڑھائے گئے چندہ مواد دوسرے کلاس کے لیے بھی کارآمد ہوتے ہیں تو، معلم کے لیے گوگل کلاس روم میں اس مواد کے دوبارہ استعمال کی گنجائش بھی موجود ہے۔ اس میں نہ صرف دوسری جماعت کے اعلانات، بلکہ سوالات اور دوسری چیزیں بھی جوڑ سکتے ہیں۔

طلبہ

ایک کلاس روم کا تصور اسی وقت تکمیل پاتا ہے، جب اس میں طلبہ موجود ہوں۔ گوگل کلاس روم میں اساتذہ کے لیے اس کی گنجائش موجود ہے کہ وہ اپنے طلبہ کا انتخاب کریں اور ان کا ایک گروپ بنا کر پڑھائیں۔

طلبہ کو مدعو کرنا – Invite Students اس لنک کے ذریعے آپ اپنے طلبہ کو مدعو کر سکتے ہیں۔ گوگل کے ایڈریس بک میں موجود طلبہ کو ایڈ کر کے کر سکتے ہیں۔ ان کے علاوہ آپ اپنے جاننے والے طلبہ کو بھی راست طور پر ایڈ کر سکتے ہیں، جن کے ای میل ایڈریس آپ کے پاس موجود ہیں۔ ویسے تو طلبہ کو داخل کرنے کی کوئی حد نہیں بتلائی گئی ہے، لیکن ایک کلاس روم ٹیچر کی ضروریات کے مطابق انھیں ایڈ کیا جا سکتا ہے۔ اگر وہ استاد کے دعوت نامے کو اپنے ای میل سے ایکسیپٹ کرتے ہیں تو وہ یہاں ممبر بن جاتے ہیں اور اس کلاس روم میں ملنے والی تدریس و اکتساب کا حصہ بن جاتے ہیں۔ اسکے علاوہ استاد انکے ساتھ انفرادی اور اجتماعی طور پر ای میل کے ذریعے اور مواد پر کمینٹ Comment کے ذریعے رابطے میں رہ سکتے ہیں۔ معلم کو یہ گنجائش ہے کہ وہ صرف اساتذہ کو ہی مواد پر کمینٹ کی سہولت دیں یا طلبہ کو بھی اس کی سہولت دستیاب ہو۔ اس کے علاوہ معلم کو اپنے طلبہ کو Mute کرنے، ای میل کرنے یا ڈیلیٹ کرنے کی سہولت ہے، یعنی استاد نارمل کلاس روم کی طرح اس کلاس روم کا بھی نظم کر سکتا ہے اور روزمرہ کی سرگرمیوں کو قابو میں رکھ سکتا ہے۔

گوگل کلاس روم کا نظم

دوسرے عام کلاسس کی طرح معلم ایک کمرہ جماعت

> **گوگل کلاس روم کو ویب براوزر، iOS، انڈرائیڈ، کروم پر چلنے والے مختلف ڈیوائیزز پر استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کے استعمال کے لیے انٹرنیٹ ضروری ہے۔ یہ آف لائن استعمال نہیں کیا جاسکتا۔ چونکہ یہ مواد مختلف براوزرس پر آسانی کے ساتھ کھل سکتا ہے، اس لیے اساتذہ و طلبہ دونوں اسے موبائل، ڈسک ٹاپ یا لیپ ٹاپ پر استعمال کر سکتے ہیں۔**

کو اکیلا پڑھا سکتا ہے، یا مختلف اساتذہ کے ساتھ مل کر ایک مضمون یا مختلف مضامین پڑھا سکتا ہے۔ اس طرح اگر دوسرے اساتذہ کو جوڑا جائے تو دوسرے استاد کو بھی کلاس کے نظم کی وہ تمام سہولیات دی جا سکتی ہیں، جو پہلے معلم کو دستیاب ہیں، یعنی وہ کسی مخصوص مضمون کو پڑھا سکتے ہیں، اس کے سوالات تیار کر سکتے ہیں ہے اور طلبہ کا نظم بھی ممکن ہے۔ اس طرح طلبہ کو ایک ہی پلیٹ فارم پر مختلف ماہرین کی امداد مل جاتی ہے۔ استاد کو مدعو کرنے کی یہ سہولت Invite Teacher کے طور پر About کلاس روم لنک میں موجود ہے۔ About لنک کے ذریعے آپ اپنی تدریس کا مواد جوڑ سکتے ہیں، جو اوپر ذکر کیے گئے مواد کی طرح ملٹی میڈیا مواد ہوگا۔ جس طرح آپ اپنے کلاس کا نام اور روم نمبر ٹائم ٹیبل میں اندراج کرتے ہیں، یہ بھی یہاں داخل کرنے کی سہولت ہے۔ ساتھ ہی ساتھ یہ غور طلب بات ہے کہ آپ کا داخل کیا گیا نیا مواد ہر بار اوپر کی جانب آتا ہے اور پرانا مواد اسکرین کے نچلے حصے میں چلا جاتا ہے، اس طرح سے طلبہ update رہ سکتے ہیں۔

کلاس روم کیلنڈر Classroom Calendar–

اس کے ذریعے معلم اپنی کلاس کے کیلنڈر کی نگرانی کر سکتے ہیں۔ جس کی وجہ سے انھیں طلبہ کی پیش رفت کا اندازہ لگانے میں مدد ملتی ہے۔ یہ صرف ایک کلاس کا ہی نہیں بلکہ معلم کے ذریعہ ہینڈل Handle کی جانے والی تمام کلاسس کا بھی اندازہ قائم کرنے میں مدد دیتا ہے۔ معلم اپنی کلاس کے کیلنڈر کو اپنے ذاتی گوگل کیلنڈر سے بھی جوڑ سکتے ہیں تا کہ سالانہ منصوبہ بندی کی جا سکے اور تمام اساتذہ کے ساتھ مل کر کلاس کا نظم کیا جائے۔ اس طرح جنرل ہالی ڈیز، امتحانات کے شیڈیولز کی تیاری ممکن ہے۔

کلاس ڈرائیو فولڈر – Class Drive Folder

استاد کے ذریعے کی جانے والی تمام تر سرگرمیوں کا ریکارڈ cloud system کے ذریعے گوگل ڈرائیو پر رکھا جا سکتا ہے۔ جس کی وجہ سے استاد کا تیار کردہ تمام مواد طلبہ کے لیے 24x7 دستیاب ہوگا۔

گوگل کلاس روم کو کس طرح حاصل کیا جا سکتا ہے؟

گوگل کلاس روم کو ویب براوزر، iOS، انڈرائیڈ، کروم پر چلنے والے مختلف ڈیوائیزز پر استعمال کر سکتے ہیں۔ اس کے استعمال کے لیے انٹرنیٹ ضروری ہے۔ یہ آف لائن استعمال نہیں کیا جا سکتا۔ چونکہ یہ مواد مختلف براوزرس پر آسانی کے ساتھ کھل سکتا ہے، اس لیے اساتذہ و طلبہ دونوں اسے موبائل، ڈسک ٹاپ یا لیپ ٹاپ پر استعمال کر سکتے ہیں۔ اساتذہ اور طلبہ اپنے کردار کے مطابق دوسرے مطالعات کے دوران حاصل شدہ مواد کو گوگل کلاس روم میں شیئر بھی کر سکتے ہیں جیسے واٹس ایپ پر حاصل شدہ نصاب پر مبنی ویڈیو کو اس کلاس میں شیئر کیا جا سکتا ہے۔

نتائج

کل ملا کر ہمیں لگتا ہے کہ ترقی کے اس دور میں جہاں تکنالوجی کا بول بالا ہے، اساتذہ کو اس طرح کے پلیٹ فارم کے استعمال کی اشد ضرورت ہے۔ اس سے اساتذہ اپنے طلبہ سے 24x7 جڑے رہ سکتے ہیں۔ نہ صرف یہ کہ اس طرح کے پلیٹ فارم کے استعمال سے اساتذہ کو ڈیجیٹل مواد کی تیاری میں کام کرنے کا موقع ملے گا، بلکہ وہ نئے دور کے تعلیمی نظام یعنی MOOCs کی طرف بھی اپنے قدم بڑھائیں گے۔ حالانکہ موجودہ وقت میں اس پلیٹ فارم کا استعمال محدود طور پر کیا جا رہا ہے، اس لیے یہ بڑے پیمانے پر ہمیں دستیاب نہیں ہے اور اسے MOOCs کے طور پر دیکھا نہیں جا رہا۔ اساتذہ اگر اس کے استعمال سے بخوبی واقف ہو جائیں تو MOOCs کے پلیٹ فارم جیسے MOODLES اور SWAYAM کے استعمال کے مواقع تلاش کر سکتے ہیں۔ یہاں پر اس بات کا ذکر خاصا اہم ہے کہ اس سہولت کے استعمال میں ہم صرف انگریزی زبان تک ہی محدود نہ ہونگے، بلکہ اردو جاننے والے اساتذہ انگریزی کے ساتھ ساتھ وقت ضرورت اردو مواد کا بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ موجودہ کووڈ–19 وبائی بیماری کے دور میں جہاں ہمیں طلبہ کے ساتھ ربط رکھتے ہوئے تعلیم کو جاری رکھنے کی ضرورت ہے تو اس تکنیک کا استعمال نہ صرف سودمند بلکہ اشد ضروری ہے۔

■

Prof. Mushtaq Ahmed I. Patel
Prof. in Education, MANUU
Gachibowli
Hyderabad- 500032 (Telangana)

عصر جدید کے طلبا میں اضطراب
مسائل اور حل

محمد اطہر حسین

عصر جدید میں طلبا کے سامنے چیلنجز کی بہتات ہے۔ ہر روز ان کے سامنے نت نئے مسائل درپیش ہوتے ہیں۔ تعلیمی مسائل، اکتسابی مشکلات، روزگار سے متعلق مسائل وغیرہ۔ متذکرہ بالا سارے مسائل طالب علم کو ذہنی اذیت میں مبتلا کرتے ہیں جس کا براہ راست اثر طلبا کی تعلیمی کارکردگی پر ہوتا ہے اور ان کی اکتسابی حصولیابیوں میں کمی آنے لگتی ہے۔ اور یہ ساری مشکلات طلبا کے اندر بے چینی اور غیر سکونی کا ماحول پیدا کرتی ہیں اور ان کے ذہنی خلفشار کو ہوا دیتی ہیں۔ طلبا کی اسی بے چینی اور بے سکونی کو اصطلاح عام میں 'اضطراب' کے نام سے جانا جاتا ہے۔ جو درحقیقت تعلیمی، سیاسی، سماجی، گھریلو ماحول سے ممتزج ہو کر طلبا کو ذہنی اذیت کا مریض بنا دیتی ہے۔

اس میں کوئی شک نہیں کہ کسی بھی ملک کی بہتر ترقی اور اس کا سنہرا مستقبل طلبا کے ہاتھوں میں ہوا کرتا ہے۔ ہمارے ملک میں بھی طلبا کا ملکی جدوجہد میں بڑا حصہ ہے اور زریں کردار ادا کیا ہے خواہ وہ سیاسی لڑائی ہو یا سماجی جدوجہد، معاشی تنگی کا حل ہو یا تعلیمی بیداری کا مسئلہ ہو۔ اور یہ صرف ہمارے ملک کی خاصیت نہیں بلکہ عالمی سطح پر مختلف ممالک کے طلبا و طالبات نے ملکی سرگرمیوں میں حصہ لے کر اس میں اپنی ذمے داریاں نبھائی ہیں۔ انیسویں صدی میں روس، جرمنی اور فرانس کے طلبا کا وہاں کی ملکی سیاسی سرگرمیوں میں حصہ ناقابل فراموش ہے۔

دور حاضر میں تعلیمی ادارے اضطرابی عوامل سے خالی نہیں ہیں۔ ان میں نظم و ضبط کی کمی ہے۔ کہیں کہیں تعلیمی سہولیات کا بھی فقدان ہے۔ اس سے طلبا کے اندر منفی رجحانات بڑھ رہے ہیں۔ توڑ پھوڑ کرنا، سرکاری املاک کو نقصان پہنچانا، بسوں کو نذر آتش کرنا، اساتذہ کے ساتھ بدزبانی و بدتمیزی، بات بات پر احتجاج کرنا اور بھوک ہڑتال کرنا جس سے تعلیمی ادارے کی ساکھ بدنام ہو۔ امتحان کا بائیکاٹ کرنا، ناجائز حقوق کا طلبگار ہونا وغیرہ۔ کوٹھاری کمیشن نے اپنی سفارشات میں کہا ہے کہ طلبا کے ذریعے اس طرح کے پرتشدد واقعات میں لگاتار اضافہ ہو رہا ہے۔ اور ان سارے واقعات کا ظہور اعلی تعلیمی اداروں میں زیادہ ہے۔ اور ہر بیتے دن کے ساتھ حالات بد سے بدتر ہوتے جا رہے ہیں اور اس طرح کے کاموں کو کرنے میں طلبا کا رجحان بڑھتا ہی جا رہا ہے۔

اثرات: موجودہ دور میں طلبا میں پائے جانے والے 'اضطراب' کے اثرات کے نتائج نہایت مہلک ثابت ہو رہے ہیں۔ طلبا کی تعلیمی و اکتسابی کارکردگی پوری طرح سے متاثر ہوئی ہے۔ ان کے اندر بدنظمی، بے صبری، بدلحاظی، بے مروتی، بدگوئی، تشدد، نفرت کا رجحان لگاتار بڑھ رہا ہے جس سے ملک کے سنہرے مستقبل اور ایک قابل رشک معاشرے کی تشکیل کی امیدوں کو شدید دھچکا پہنچا ہے۔

طلبا میں بڑھتے اضطراب نے جہاں ایک طرف سماجی ڈھانچے کو نقصان پہنچایا اور سماج میں ایک طرح کی ناامیدی اور تعلیمی اداروں کی منفی تصویر پیش کی وہیں دوسری طرف طالب علم اور معلم کے جذباتی اور قابل تکریم رشتے پر بھی کاری ضرب لگائی ہے۔ اس اضطراب نے معلم و متعلم دونوں کے میٹھے رشتے میں بھی زہر گھول دیا۔ اس رشتے کی مٹھاس باقی نہ رہی۔ طلبا کی بے جا بدگوئیوں نے اس میں کڑواہٹ پیدا کر دی۔ اس کے علاوہ سماجی، معاشی، سیاسی ماحول میں بھی اس اضطراب کا اثر براہ راست دکھائی پڑتا ہے۔

عوامل: طلبا میں بڑھتے اضطرابی ماحول کے پس پردہ بے شمار وجوہات کی شمولیت ہے۔ اس طوفان کے لگاتار اضافے میں سماجی، معاشی، سیاسی و دیگر عوامل کا بھی دخل ہے، ان کے اسباب کا تفصیل سے جائزہ لینا ناگزیر ہے۔

سماجی عوامل: سماج کی حیثیت ہمارے درمیان اس درخت کے مثل ہے جس کے سایہ تلے ہماری نسلیں پروان چڑھتی ہیں۔ اسی ماحول سے متاثر ہو کر بچوں کی نشو و نما اور ان کی تعلیم و تربیت کا راستہ ہموار ہوتا ہے۔ اس لیے بچوں کی بہتر تربیت سازی اور ان کے سنہرے مستقبل کے لیے سماج کا بہتر، منظم، تعلیم یافتہ، بغض و حسد سے پاک ہونا بے حد ضروری ہے۔ ایک ایسا معاشرہ، جہاں مظلوموں کو ان کا حق دیا جاتا ہو، بچوں میں انسانی اقدار پیدا کرنے کے ساتھ ساتھ ان کی بہتر خیال سازی کرتا ہے۔ اور ان کے بہتر مستقبل کا ضامن بھی ہوتا ہے۔

لیکن عصر جدید میں آپسی رنجش، بغض و حسد، کنبہ پروری، مظلوم کشی ہمارے سماج کے وہ عناصر ہیں جس سے طلبا لگاتار متاثر ہو رہے ہیں۔ وہ ایک ایسے سماج کا حصہ ہیں جہاں بدزبانی و بدلحاظی عام ہے۔ اور سماج کی یہ باتیں طلبا کے خیالات کا حصہ بن کر ان کے اعمال میں شامل ہو جاتی ہیں۔ اور یہ ان کے ذہنی اضطراب میں اضافے کا باعث ہے۔

معاشی عوامل: جن عوامل نے طلبا کے اضطراب میں اپنا اہم کردار ادا کیا ہے ان میں معاشی عوامل کا بڑا حصہ ہے۔ روزگار کی فکر اور بے روزگاری نے جہاں طلبا کے ذہنی اضطراب میں اضافہ کیا وہیں ان کے تعلیمی رجحان میں کمی کا باعث بھی بنا۔ گھریلو معاشی حالات کی تنگی بھی طلبا کی ذہنی روش کو بے سمت کرنے میں اہم کردار نبھا رہی ہے۔

مشکل منتقلی: کسی نئے ماحول میں کسی بھی طالب علم کو خود کو سیٹ کرنے اور وہاں کی فضا سے خود کو ہم آہنگ کرنے میں بڑی مشکلات کا سامنا ہوتا ہے۔ کیونکہ سابقہ تعلیمی نظام سے ایک دوسرے نظام میں خود کو منتقل کرنا اور وہاں کے رنگ میں خود کو رنگنا بڑا کٹھن مرحلہ ہوتا ہے۔ اور بسا اوقات یہ چیزیں طلبا کو 'تناؤ' کا شکار بنا دیتی ہیں۔ وہ خود میں سمٹ کر رہ جاتے ہیں۔ وہ نئی چیزوں کو قبول کرنے کے لیے تیار نہیں ہوتے۔ اور نتیجہ یہ ہوتا ہے کہ ان کی مکمل شخصیت اس تناؤ کا شکار ہو جاتی ہے وہ تعلیمی کارکردگی پر توجہ نہیں دے پاتے اور نا ہی ان کی اخلاقی و تعلیمی نشو و نما ہو پاتی ہے۔ ایسے طلبا اکثر اساتذہ کی نظروں سے بچے رہنا چاہتے ہیں اور یہی تعلیمی و اخلاقی بحران ان کو غلط سمت دکھانے میں معاون ہوتے ہیں۔ اور فیصلے کے طور پر وہ غلط راستوں پر گامزن ہو جاتے ہیں۔

تناؤ: طلبا جب اپنا ماضی چھوڑ کر کسی بھی نئے ماحول میں آتے ہیں تو ان کی سابقہ زندگی ان پر پوری طرح حاوی

ہوتی ہے۔ وہ زندگی کے ہر شعبے میں اپنے پرانے ڈھرے پر قائم رہنا چاہتے ہیں۔ دوسرے الفاظ میں یہ کہنا بالکل بجا ہے کہ وہ نئے ماحول کے چیلنجز سے نا آشنا ہوتے ہیں یا آشنا ہو کر بھی تغافل برتتے ہیں۔ ایسے میں نئی جگہ کے قوانین، طور طریقے، تدریسی حکمت عملیاں اور نصاب وغیرہ کا بوجھ دن بہ دن ان کو بڑھتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ اور یہ ساری چیزیں اس کے ذہنی اشتعال کو ہوا دیتی ہیں۔ ان کا یہ اندرونی اشتعال متواتر بڑھتا رہتا ہے اور بالآخر ذہنی اضطراب کی صورت اختیار کر لیتی ہے۔

غیر یقینی صورت حال: غیر یقینی صورت حال کسی سمت یا تحریک کے بغیر کسی اہم چیز کا احساس خاص طور پر جب طالب علم کے تمام دوستوں کو محسوس ہو کہ جیسے انہیں اپنی ہی پڑی ہے یقینی طور پر اضطراب کا باعث ہے۔ یہ بھی بات یقینی ہے کہ پریشانی انجانے میں پروان چڑھتی ہے۔ اور جب طلبا غیر یقینی صورت حال کا شکار ہوتے ہیں تو یہ ان کے سر چڑھ کے بولتا ہے۔ انھیں معلوم نہیں ہوتا ہے کہ کل کو ان کا مستقبل کیا ہوگا۔ انھیں ملازمت ملے گی بھی یا نہیں۔ یوں ہی اگزامز کے دنوں میں وہ اپنی تیاریوں اور نتیجے کو لے کر بھی غیر یقینی صورت حال سے دوچار ہوتے ہیں۔ اور یہ یقیناً ان کے ذہنی اضطراب میں بڑھوتری کا باعث ہے۔

طریقۂ زندگی میں تبدیلی: ایک انسان پیدائش کے بعد جس ماحول میں رہ کر اپنی زندگی گذارتا ہے وہ اسی کا عادی ہوتا ہے۔ اس کے طور طریقوں کو اپنا لیتا ہے۔ اس کے آداب و تہذیب کے رنگ اس میں گھل جاتے ہیں۔ اس کا کھانا پینا، اٹھنا بیٹھنا، سونا جاگنا، لکھنا پڑھنا اس کے طرز معاشرت کی گواہی دیتی ہیں۔ لیکن یہی طالب علم جب اپنے سماج کو چھوڑ کر ایک نئی دنیا میں پہنچتا ہے تو وہاں کا رنگ ڈھنگ الگ ہوتا ہے۔ وہاں کے طور طریقے بالکل نئے اور نرالے ہوتے ہیں۔ باقاعدگی سے نیند کا نظام الاوقات، صحت مند خوراک اور باقاعدگی سے ورزش میں افسردگی کی علامات کو کم کیا گیا ہے۔ لیکن کالج کی زندگی میں دیر رات تک بیدار رہنا اور کیفے کے کھانے کی وجہ سے صحت میں کمی اور اضطراب میں بڑھوتری دونوں قسم کا نقصان ہوتا ہے۔

دیگر عوامل: بیان کردہ عوامل کے علاوہ طلبا میں نظم و ضبط کی کمی، اساتذہ اور طلبا کے آپسی رشتے کی کڑواہٹ، تعلیمی اداروں کا حد سے زیادہ خرچیلہ ہونا، بڑھتی ہوئی بے مروتی و بدلحاظی بھی اضطرابی ماحول کو مسلسل سازگار کر رہے ہیں۔

عام طور پر یہ بھی دیکھا جاتا ہے کہ تعلیمی اداروں میں طلبا کے ساتھ معاشی زیادتیاں بھی ہوتی ہیں۔ اسٹاف تعاون نہیں کرتا ہے، بعض مواضعات میں کمیشن خوری بھی عروج پر ہے۔ تعلیمی نظام میں طلبا کی سہولیات کی طرف دھیان نہ دینا بھی ان کے ذہنی اضطراب کو ہوا دے رہا ہے۔

اعلی تعلیمی اداروں میں بھی طلبا کے فلاح و بہبود کے لیے بنی کمیٹیاں اور یونین بھی اپنے اختیارات کا غلط استعمال کر کے ذہنی اضطراب کو فروغ دے رہے ہیں۔

حل: طلبا میں بڑھتا اضطراب ایک حل طلب مسئلہ ہے۔ اس کو روکنے کے لیے فوری اقدامات کی ضرورت ہے۔ حالانکہ مختلف تعلیمی کمیٹیوں اور کمیشنوں نے طلبا میں ذہنی بے چینی کو کم کرنے کے لیے بہت سی مفید سفارشات پیش کی ہیں۔

ڈاکٹر رادھا کرشنن کمیشن کے مطابق اعلی تعلیمی اداروں میں طلبا کی صحت کا ہر حال میں خیال رکھا جانا چاہیے۔ اس کے لیے انھیں صحت مند غذا دی جائے اور وقتاً فوقتاً ان کی صحت کی جانچ ہو۔ ساتھ ہی جسمانی تعلیم بھی دی جائے تاکہ وہ ذہنی اذیتوں سے دوچار ہونے سے بچ سکیں۔

ان کی سفارشات میں طلبا یونین کی کارگزاری کو تیز کرنے اور یونیورسٹی افسران کی بے جا مداخلت کو روکنے کی تجویز بھی شامل ہے۔

کوٹھاری کمیشن کی سفارشات میں تعلیمی معیار میں قابل قدر اصلاح اور طلبا کو ہوسٹل سہولت کی فراہمی پر زور دیا گیا ہے۔ ساتھ ہی انہوں نے طلبا کو صحیح سمت کی جانب رہنمائی کی سفارش بھی کی ہے۔

ڈاکٹر تری گونا سین کمیٹی نے اپنی سفارشات میں بہت سی اہم چیزوں کو شامل کیا ہے۔ مثلاً تعلیم کو روزگار سے جوڑنا، قابل اور ہنرمند اساتذہ کی تقرری، نظم و ضبط کی پابندی، وغیرہ۔

اس کے علاوہ طلبا میں ذہنی اضطراب کو کم کرنے کے لیے سماج کو پاک صاف، منظم، تعلیم یافتہ بنانا بے حد ضروری ہے۔ معاشی تنگی کو کم کرنے اور طلبا کے سروں سے ان کے تعلیمی خرچ کا بوجھ ہٹانا اضطراب کو کم کرنے کی جانب ایک شاندار قدم ثابت ہو سکتا ہے۔

مزید برآں تعلیمی اداروں کی بدنظمیوں پر نکیل کسنا اور طلبا کی سہولیات سے لیس کرنا بھی اضطرابی ماحول کو کم کرنے میں مددگار ثابت ہو سکتا ہے۔

آج کے زمانے میں ذہنی اذیت کے فروغ میں سب سے بڑا کردار ایک تعلیم یافتہ شخص کی بے روزگاری کا ہے، جس سے معاشی تنگی پیدا ہوتی ہے۔ اس سمت اقدامات کیے جانے کی فوری ضرورت ہے تاکہ تعلیم کی تکمیل کے بعد طلبا مختلف میدان میں اپنی قابلیت اور صلاحیت کا مظاہرہ کر سکیں۔ اور ذہنی اضطراب پر قدغن لگایا جا سکے۔

متذکرہ بالا نکات کے علاوہ والدین، معلم، اسکول انتظامیہ اور ذرائع ابلاغ کا کردار بھی طلبا میں اضطرابی ماحول کے خاتمے میں ناقابل فراموش ہے۔

والدین سے بہتر شاید ہی کوئی دوسرا شخص اولاد کو جانتا ہو۔ وہ اس کی تمام خوبیوں خامیوں سے واقف ہوتے ہیں۔ وہ اس کے اندرونی و بیرونی تمام طرح کی خاصیتوں سے آشنا ہوتے ہیں۔ ایسے میں والدین طلبا کے اضطراب کو کم کرنے یا اس کو مکمل ختم کرنے کے بہترین محرک بن سکتے ہیں۔ گھر کے اضافی بوجھ اور مالی مسائل کا تذکرہ بچوں کے سامنے ان کے منفی خیالات کو ہوا دیتا ہے۔ بچوں کی بہتر نشوونما بھی ان کے ذہن سے منفی رجحانات کو ختم کر دیتی ہے۔

طلبا کی زندگی میں معلم کی حیثیت اس سایہ دار درخت کی مانند ہے جس کے سائے میں وہ اپنی تمام تھکان اور مصیبتوں سے چھٹکارا پا لیتا ہے۔ وہ اس کے زیر سایہ اپنی زندگی گذارتا ہے اور اسی کا اثر قبول کرتا ہے۔ طلبا کے اضطراب میں کمی لانے کا کردار اس سے زیادہ بہتر انداز میں کوئی نہیں ادا کر سکتا۔ طلبا کے ساتھ ہمدردی، شفقت، محبت، رہنمائی کے ذریعے ان کو بہترین مستقبل کی امید دلا کر ان کو سنہرے راستوں کا مسافر بنا سکتا ہے۔ اور بلا شبہ ان اقدامات سے ان کے ذہنی اضطراب کو پھلنے پھولنے کا موقع نا مل سکے گا۔

یوں ہی اعلی تعلیمی اداروں میں انتظامیہ بھی اس موذی مرض کو بڑھنے سے روکنے میں اہم کردار ادا کر سکتا ہے۔ لیکن اس کے لیے ضروری یہ ہے کہ اندرون کالج ماحول کو خوش نما بنایا جائے۔ طلبا کے لیے سازگار مواقع فراہم کیے جائیں۔ ان کی ضروریات کا خیال رکھا جائے۔ ڈر کا ماحول ختم ہو۔ غیر یقینی صورت حال بھی انجام کو پہنچے۔

عصر حاضر میں طلبا کا اضطراب یہ ذی شعور اور ذی فہم لوگوں کے لیے اب ایک چیلنج کی صورت اختیار کر چکا ہے۔ لہٰذا اس کے خاتمے کے لیے ذرائع ابلاغ نے اپنی کوششیں شروع کر دی ہیں۔ اب اخبارات کے ذریعے تحریریں شائع کی جا رہی ہیں۔ ٹی۔وی چینلوں پر بحث و مباحثے بھی جاری ہیں۔ ماہرین کے ذریعے طلبا کو کیریئر (Career) کے بارے میں معلومات فراہم کی جاتی ہیں جس سے ان کا ذہنی دباؤ کم ہو اور اس بات سے انکار نہیں کیا جا سکتا ہے کہ ذرائع ابلاغ کی یہ کوششیں اب نتیجوں میں تبدیل ہونے لگی ہیں۔

■

Dr. Md Athar Hussain
Asst Prof. Dept of Education and Training
Maulana Azad National Urdu University
Gachibowli
Hyderabad- 500032 (Telangana)
Mob.:9849253580

راشد جمال فاروقی

زندگی میں مرے حصے کی دھنک آجائے

(دشت زاد کے حوالے سے سہیل اختر کی غزلوں کا مطالعہ)

برتولت بریخت کی ایک کہانی کا کردار 'اے گے' صرف 'نہیں' کہنا جانتا ہے۔ اندھیر گردی کے زمانے میں ایک شخص حاکم وقت کا فرمان لے کر اس کے گھر آیا جس میں لکھا تھا کہ یہ شخص جس کے گھر پہنچے گا وہ گھر اس کا ہوگا۔ اس گھر کا مالک اس کا غلام ہوگا۔ اس شخص نے 'اے گے' سے پوچھا کہ کیا تم میری خاطر تواضع کروگے۔ 'اے گے' نے جواب تو کچھ نہیں دیا لیکن سات برسوں تک اس کی خدمت میں لگا رہا۔ جب وہ شخص مرگیا تو 'اے گے' نے چیتھڑوں میں لپیٹ کر اس کی لاش کو ٹھکانے لگا دیا۔ گھر کی پتائی کی اور گہری سانس چھوڑتے ہوئے سات سال قبل سنے ہوئے سوال کا کہ ''کیا تم میری خاطر تواضع کروگے؟'' جواب دیا ''نہیں!''

کئی مقامات پر 'نہیں' کہنا ناگزیر ہوتا ہے لیکن اس قدر تاخیر سے نہیں کہنا کچھ سودمند نہیں ہے۔ جرأت انکار کے لیے کلیجہ چاہیے۔ ''نہیں'' محض ایک لفظ نہیں ہے احتجاج ہے، ردعمل ہے، بغاوت ہے، احتجاج ردعمل اور بغاوت بروقت ہونے چاہئیں۔

سہیل اختر کی غزلوں میں یہ احتجاج، ردعمل اور بغاوت کے عناصر وافر مقدار میں موجود ہیں تو اس کی وجہ بھی ظاہر ہے۔ IIT جیسے عظیم ادارے سے فارغ التحصیل سائنسی اور منطقی ذہن کی کشادگی زندگی کی بدصورتی، بے ترتیبی ناانصافی اور حماقت پر احتجاج بھی کرے گی اور 'نہیں' بھی بار بار کہنے پر مجبور ہوگی۔ لیکن یہ 'نہیں' ناک بھوں چڑھانے والے کسی چڑچڑے بدمزاج بوڑھے کھوسٹ کی زبان سے ادا نہیں ہوتی بلکہ ایک بے حد باخبر۔ دانشور کی اس سوچ کی غماز ہے جس کے پس منظر میں خوشگوار تبدیلیوں کی حسرت ہے۔ شہریار کے نقشے کے مطابق بھی تو یہ زمین ہمیشہ کم ہی رہی جب کہ شہریار محض ایک شاعر تھے۔ سہیل اختر شاعر ہونے کے علاوہ Civil Enginer بھی تھے جو دن رات نقشوں سے گھرا رہتا تھا کہ حالات پہلے سے بہتر ہوں۔ دنیا میں امن و امان، خوبصورتی، انصاف اور آسودگی کی فضا قائم ہوسکے اس بہتری کے لیے اس تعمیر کے لیے تخریب ضروری ہو تو وہ بھی سہی۔

یہ توڑ پھوڑ ضروری ہے کوئی شوق نہیں
نئے سرے سے جو تعمیر چاہتے ہیں ہم

اس کی فراست اور نیت پر آپ اور ہم اعتبار کرسکتے ہیں کہ اس کے پاس دنیا کے لیے ایک کارگر اور سودمند لائحہ عمل موجود ہے۔

میں بتا سکوں ہوں کہ یہ دنیا کیسے تعمیر کی گئی ہوگی

لہجے میں اس درجہ اعتماد اور ذمے داری بغیر پختگی کے ممکن بھی نہیں ہے۔ سہیل اختر کی سوچ کا کینوس کائنات کی وسعتوں کا حامل ہے لہٰذا وہ غم و غصے شکوہ و شکایت سے بھرپور ہے تو بجا ہے کہ ہر قدم پر ناانصافی، تنگ نظری، نظرانداز کیے جانے کی سازش زہرآلود موسم کا مستقل طور پر ٹھہر جانا۔ ریاکاروں کی جنت اور سادہ لوح بندوں کے جہنم کا ادراک سہیل اختر کو بے چین کیے رہتا ہے۔ پھر اس کے پاس بروقت 'نہیں' کہنے کا حوصلہ بھی ہے۔ وہ کوئی 'اے گے' نہیں ہے جس کے لہجے کی ترشی میں ہر باوضع انسان اپنا دکھ محسوس کرے گا۔

کروں کیا کہ یہ میرے اندر کا موسم
نہیں اب کبھی معتدل ہونے والا

ہم خیر بے ہنر تھے سو توقیر کچھ نہ تھی
مسندنشین جو ہوئے کس فن میں طاق تھے

اہل دنیا پہ کسی طرح مرا فن نہ کھلا
عیب میرا مری پہچان ہوجاتا ہے

مصلحت کا یہ تقاضا ہے لچک پیدا کروں
دیکھیے ریڑھ کی ہڈی مری کیا ٹھانتی ہے

تھا رحمت سخن جو پہلے علاقہ
وہ دہشت پور ہوتا جارہا ہے

جب اچانک ہی ہر اک فیصلہ ہوتا ہے یہاں
مجھ کو بھی کوئی علاقہ نہیں تیاری سے

بگڑنے لگا سارا ہی نظم اندر
میں باہر سے اتنا سدھارا گیا ہوں

اپنی کچھ فکر کرو مجھ سے بچو دور رہو
اب مرے پاس خیالات بھی ہتھیار سے ہیں

تھے ہم بھی راستہ ہموار کرنے والوں میں
سو ہم بھی راہ سے اب سے ہٹائے جائیں گے

مری کشتی کبھی غرقاب کی تھی
ابھی تک میں مسند سے خفا ہوں

مرے حق میں جب آوازیں نہیں تھی
تمھارے پاس بھی آنکھیں نہیں تھیں

کچھ ایسی ہے نہیں عادت نظرانداز ہونے کی
کوئی بھولے سے بھی ہو مہرباں اچھا نہیں لگتا

یہ نا آسودگی، بے اطمینانی، الجھن اور بے رنگیت آخر وہاں جا پہنچتی ہے جہاں مسئلہ یہ نہیں کہ دین و دنیا دونوں سے بے زار انسان پہلے کے سدھارے بلکہ پہلے کے پھونک دیا جائے۔ یہ سوچ رہا ہے۔ ایسے ابلتے ہوئے لاوے جس دل دماغ میں جگہ بنالیں وہاں کا موسم اب بھی معتدل نہیں ہوگا اور ہر سوچنے والا ذہن اسی غیر معتدل موسم کا شکار ہوکر رہتا ہے۔ باہر کی لیپاپوتی کے نتیجے میں اندر سے انسان بڑا کریہہ اور خبیث ہو چلا ہے۔ اس کے خیالات ہتھیار بن چکے ہیں اسے حبس اور جمود کا یہ ماحول گوارا نہیں وہ کسی طوفان کا منتظر تو ہے ہی بساط بھر کوشش میں بھی لگا ہوا ہے کہ کسی طرح کچھ اچھی تبدیلی در آئے۔ سہیل اختر کے لیے کسی قسم کے حالات Taken for grandted نہیں وہ اپنے اردگرد کا احتساب بھی کرتا ہے۔ حالات کو بہتر بنانے کا نسخہ بھی تلاش کرتا ہے۔ اپنا تجزیہ بھی کرتا ہے۔ اپنے محاسن و معائب پر بھی ایمانداری سے غور کرتا ہے۔ اعتراف ضروری ہو تو اسے گریز نہیں۔ بغاوت ناگزیر ہو تو وہ اپنے اشعار کو تلوار بنا لیتا ہے۔ یہی اس کی غزلوں کا حسن ہے کہ وہ تقلیدی موضوعات اور روایتی شاعری کے حبس زدہ کھنڈر میں نئی سوچ کی کھڑکی کھولے بیٹھا ہے۔ خود اس کی ذات بھی جن اشعار میں ہویدا ہوئی ہے وہ اشعار بھی ہماری جدید تر غزل کا سرمایہ ہیں۔

شکایت گردی ہم کر رہے تھے
گر تھوڑے سے تو دھندلے تھے ہم بھی

میں بھی سب چبھتے سوالوں کے جواب
دے تو سکتا تھا مگر جانے دیا

رہ گیا جب میں اکیلا تو خیال آیا سہیل
اپنی دیواروں میں در بھی تو بنانا تھا مجھے

خاکساری کا نکالا گیا مطلب ہی غلط
کچھ بھی ہو جاتا، جھکا سر تو اٹھانا تھا مجھے

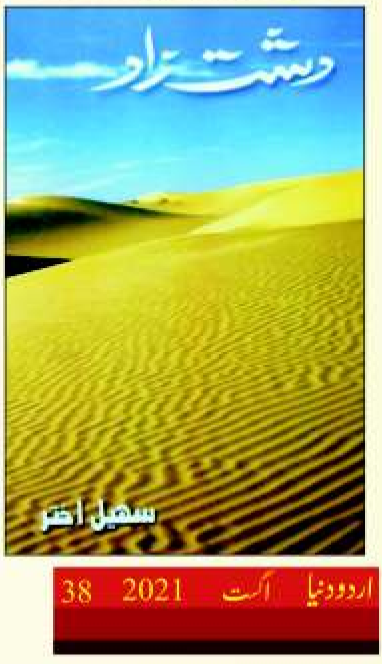

بھولنے کی وہ اداکاری مری
دوستوں کو خود مکر جانے دیا

ہم نے بھی سیکھ لیا ہکلانا
یعنی اب اہل زباں ہیں ہم بھی

خوشی تو ہے کہ سب کے مختلف ہوں
مگر غم بھی ہے مجھ سا دوسرا ئیں

وہاں سے کر دیا رخصت جہاں لگتا تھا دل اپنا
وہاں رکھا گیا ہم کو جہاں اچھا نہیں لگتا

میری آوارگی سے گھبرا کر
مڑ گیا میرا راستہ مجھ میں

بناتی ہے وہی مجھ کو مکمل
جو میری ذات میں ہے اک کمی کی

اپنی تخلیق سے ہوا محدود
وائے میں واقف حدود نہ تھا

رہائی کا یہی مفہوم ہے ہمارے لیے
پسند کی کوئی زنجیر چاہتے ہیں ہم

ایک ماہر نفسیات کے طور پر اس نے اپنی ذات کی سخت گرہیں کھولی ہیں۔ اسے گردی کی شکایت کرتے ہوئے خود کو دھندلا مان لینے میں تامل نہیں۔ اسے دیر سے ہی خیال تو آیا کہ اس کی تنہائی اس لیے بھی ہے کہ دیواروں میں در نہیں بنائے گئے تھے اسے مختلف ہونے کا زعم بھی خوش نہیں کرسکتا کہ یکتا ہونے کا قلق آدبوچتا ہے اسے اپنی ذات میں موجود کمی کا علم ہے لیکن یہی اس کی شناخت بھی ہے۔ وہ اپنی پسند کی زنجیر میں بندھ کر رہائی کا لطف لینے کو تیار ہے۔ آپ ملاحظہ فرمائیں کہ ہماری جدید تر غزل میں ایسے بہترین اشعار کہنے والے کتنے لوگ ہیں۔ 'دشت زاد' میں میری پسند کے اشعار تعداد کے لحاظ سے بہت زیادہ ہیں۔ چند اشعار بلا تبصرہ درج ہیں آپ ان سے بھی محظوظ ہوں اور سہیل اختر کی شاعرانہ صلاحیتوں کو سلام کریں۔

اترنے والا ہو راتوں میں جیسے چھت سے کوئی
دھڑکتا رہتا ہے زینہ مرا نہیں سوتا

مجھ تک بھی نگاہوں کی رسد کاش پہنچتی
کیا میں ہی فقط خیمہ منظر سے الگ ہوں

بہت گھمسان کی جنگیں ہوئی ہیں
جسے جو چاہیے تھا مل گیا کیا

جنگلوں سے یہ گزرتی ہوئی سنسان سڑک
اور کچھ لوگ مرے ساتھ پراسرار سے ہیں

ایک پراسرار سی حویلی میں
آجکل میرا آنا جانا ہے

ایسے حالات تھے گھر والے دعا مانگتے تھے
جیسے دفتر نہیں مقتل سے گھر آنا تھا مجھے

ایک پراسرار فضا، پراسرار حویلی، پراسرار سفر، مشکوک ہمسفر جیسے منظر ہمارے روزمرہ کا حصہ ہیں لیکن انھیں شعری پیراہن عطا کرکے سہیل اختر نے کمال کیا ہے۔

مرے اسلوب میں مانوسیت کی چاشنی کم ہے
کہ میں نے اجنبی الفاظ کو بھی نظم کر ڈالا

سہیل اختر نے نامانوس موضوعات کو جس بے ساختگی اور مہارت سے برتا ہے اس کی وجہ سے ان کے اسلوب میں چاشنی کی کمی نہیں بلکہ فطری ذائقہ گھل گیا ہے۔ سہیل اختر کی غزلیں سرسری مطالعے کے لیے نہیں ہیں۔ وہ توجہ کا اصرار کرتی ہیں اور داد کی مستحق ہیں۔ ایک سچے اور باخبر شاعر کے ذہن میں کیا کیا خیالات کھلبلی مچاتے ہیں وہ ان محسوسات کو کس طرح اور کس پیرائے میں بیان کرتا ہے۔ اس کی نظر سطح سے بہت اندر پہنچ کر گوہر آبدار لے کر ابھرتی ہے اور وہ کس طرح انسان کی فطری جبلتوں (Instincts) کو زبان عطا کرتا ہے۔ اس کے اندر کا فنکار اپنے لہو کو پانی کرکے جس طرح غزل کا حق ادا کرتا ہے لیکن جائز تعریف سننے کو بھی ترستا ہے کہ اردو دنیا کے مراکز سے بہت دور اڑیسہ کی اجنبی فضاؤں میں اردو کے اس عاشق کی آواز نقارخانے میں کون سنتا ہے۔ آج بانس پر چڑھا کر قد میں اضافے کیے جارہے ہیں تو ایک قدآور شخص کے اس حق سے اسے محروم نہیں کیا جانا چاہیے کہ وہ جس بلندی سے ہمیں پکار رہا ہے اس سے تو انکار نہ کیا جائے۔ بے جا تعریف بھی نہیں تو اس کا حق تو اسے ملنا ہی چاہیے کیا اسے اس کے حصے کی دھنک دینے میں کوئی قباحت ہے؟

ساری رنگینی دنیا تو نہیں چاہتا میں
زندگی میں مرے حصے کی دھنک آجائے

■

Rashid Jamal Farooqui
C-6, FF Floor, Flat No.: 2, Thokar No.:8
Gali No.: 3, Shaheen Bagh, Jamia Nagar
New Delhi - 110025
Mob.:9868768655

نارائن پائمیدار

پروقار افسانہ نگار آنجہانی رتن سنگھ

آزادی کے بعد جن معتبر افسانہ نگاروں نے پریم چند کی روایت کو آگے بڑھایا ہے اور دیہی زندگی کی تصویر کشی کی ہے ان میں خواجہ احمد عباس، قاضی عبد الستار، بلونت سنگھ، سریندر پرکاش، جوگندر پال، غیاث احمد گدی، اقبال متین وغیرہ کے ساتھ ایک اہم نام رتن سنگھ کا بھی ہے۔ پریم چند کی طرح ان کے افسانوں میں بھی حقیقت نگاری بام عروج پر ہے۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں نت نئے موضوعات کو شامل کرنے کی کوشش کی ہے۔

پروفیسر محمد حسن اپنی تصنیف 'جدید اردو ادب' میں لکھتے ہیں:

''رتن سنگھ نے جنس و رومان کے پٹے پٹائے موضوعات سے دامن بچا کر انوکھے اور تازہ موضوعات کو لیا اور براہ راست اور سادہ اسلوب میں پوری نزاکت اور حسن کاری کے ساتھ ان لطیف تاثرات کو بیان کیا۔''

(جدید اردو ادب: 1947 کے بعد اردو کا تنقیدی تجزیہ از محمد حسن، ایڈیشن 2011 مکتبہ جامعہ لمیٹڈ، نئی دہلی، ص نمبر 35)

رتن سنگھ کو دیہی زندگی سے بڑی انسیت تھی' آپ بیتی' میں انھوں نے اپنے گاؤں کو ایک مکمل کائنات قرار دیا ہے تقسیم وطن کے بعد فسادات کی وجہ سے انھیں اپنے گاؤں کو ترک کرنا پڑا مگر گاؤں کے ماحول، رسم و رواج، وہاں کے مسائل، وہاں کے لہلہاتے کھیت اور خوبصورت مناظر ان کے رگ و پے میں رچ بس گئے تھے چنانچہ ترک وطن کا قلق اکثر ستاتا رہتا تھا۔ 'ایک خط۔ اپنے بچپن کے نام' میں انھوں نے لکھا ہے:

''جب جب یہ نغمے یاد آتے ہیں۔ تو دل میں ایک ٹیس سی اٹھتی ہے اور پھر لگتا ہے کہ ملک کی اس تقسیم نے مجھ سے صرف میرا گاؤں ہی نہیں چھینا یا محض وہ دھرتی ہی نہیں چھینی، جہاں میں پیدا ہوا تھا بلکہ مجھ سے میری ہیر چھین لی گئی، موہنی چھین لی گئی یوں کہوں کہ زندگی سے حسن چھین لیا گیا ہے۔ مٹھاس چھین لی گئی ہے۔''

(ایک خط: اپنے بچپن کے نام، تصنیف، دربدری، رتن سنگھ، نصرت پبلشر لکھنؤ 1986، ص نمبر 35)

رتن سنگھ 15 نومبر 1927 (سرٹیفکیٹ کے مطابق) کو تحصیل نارووال ضلع سیالکوٹ (پاکستان) کے ایک چھوٹے سے گاؤں داؤد میں پیدا ہوئے۔ ان کے والد کا نام سردار پرتاپ سنگھ اور والدہ کا نام کرتار کور تھا۔ انھوں نے اپنی ابتدائی تعلیم ڈیرہ بابا نانک (پاکستان) میں حاصل کی اور وہیں سے ہائی اسکول کا امتحان پاس کیا۔ ملک کی تقسیم کے بعد ہجرت کرکے ہندستان (لکھنؤ) آئے اور ریلوے میں ملازم ہو گئے مگر تنخواہ کم ہونے کی وجہ سے مختلف مصائب سے دوچار ہوئے۔ اپنی' آپ بیتی' میں انھوں نے لکھا ہے:

''ڈیڑھ سو تنخواہ اور سر پر دادی، ماں، باپ، چھوٹے بھائی بہنوں اور بیوی بچوں کو ملا کر تقریباً ایک درجن افراد کی ذمہ داری اور اس پر باپ کو پاگل پن کی بیماری۔ باقی تو خیر سب کچھ جھیلا لیکن ایک بار صاحب اس غریبی نے یہاں تک مجبور کر دیا کہ پاگل باپ کو پاگل خانہ میں داخل کرانے کے لیے اس کے ہاتھوں میں ہتھکڑی پہنوانی پڑ گئی۔ اس ظالم لمحے کی جب بھی یاد آتی ہے غم کی شدت سے خود پاگل ہو ہو جاتا ہوں۔''

(آپ بیتی تصنیف، دربدری، رتن سنگھ، نصرت پبلشر لکھنؤ 1986، ص 99)

ایسی زبوں حالی میں وہ کبھی زندگی سے دل برداشتہ نہیں ہوئے اور آگے بڑھتے ہوئے 1960 میں لکھنؤ یونیورسٹی سے بی. اے کا امتحان پاس کیا۔

قیام لکھنؤ کے دوران رتن سنگھ کو آل احمد سرور، احتشام حسین، علی عباس حسینی، ڈاکٹر محمد حسن، رام لعل، ڈاکٹر قمر رئیس، قاضی عبد الستار، شارب ردولوی، باقر مہدی وغیرہ جیسے بڑے ادیبوں کی صحبت نصیب ہوئی جن کی حوصلہ افزائی سے ان کا ادبی سفر پروان چڑھا۔ ان کے احباب کی بھی ایک طویل فہرست ہے خصوصاً اقبال مجید، عابد سہیل، احمد جمال پاشا اور حسن کمال وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان حضرات نے اچھے برے وقت میں ان کا ساتھ دیا اور ہر ممکن ان کی مدد کی۔

1962 میں رتن سنگھ کو آل انڈیا ریڈیو (بھوپال) میں ملازمت کا موقع ملا اور وہ اپنی سولہ سال کی ریلوے کی نوکری کو خیر باد کر کے لکھنؤ سے بھوپال آ گئے۔ یہاں تقریباً دو سال ہی ہوئے ہوں گے کہ تبادلوں کا سلسلہ شروع ہو گیا اس سے ایک فائدہ یہ ہوا کہ انھیں لکھنؤ اور بھوپال کے علاوہ حیدر آباد، شری نگر، وشاکھا پٹنم، گوالیار وغیرہ جیسے مختلف بڑے شہروں کی ادبی سرگرمیوں سے استفادہ کرنے کا موقع ملا جس سے ان کی ادبی صلاحیتیں صیقل ہوئیں اور انھوں نے مسلسل اپنا ادبی سفر جاری رکھا جس کا اعتراف کیا گیا اور انھیں کئی اعزازات سے نوازا گیا۔

رتن سنگھ نے اردو افسانہ کی دنیا میں اپنا پہلا قدم 1951 میں رکھا۔ ہوا یوں کہ ایک دن ان کی ملاقات رام لعل صاحب سے ہو گئی اور پھر انھیں کے توسط سے انھوں نے لکھنؤ کے ایک ادبی جلسے میں شرکت کی جس کا اثر یہ ہوا کہ اگلے ہی دن انھوں نے ایک کہانی لکھی اور رام لعل صاحب کو سنائی یہ ان کی پہلی کہانی تھی جس کا عنوان تھا 'ممی تم ایک دیوار ہو'۔ یہ کہانی راہی (دہلی) میں چھپی۔

اب تک رتن سنگھ کے مختلف افسانوی مجموعے منظر عام پر آ چکے ہیں۔ پہلی آواز، پنجرے کا آدمی، کاٹھ کا گھوڑا، سفر در سفر اور پناہ گاہ وغیرہ ان کے اہم افسانوی مجموعے ہیں۔ مانک موتی ان کے مختصر ترین افسانوں کا مجموعہ ہے۔ ان کے ساتھ ہی انھوں نے پنجابی افسانوں کا اردو ترجمہ بھی کیا ہے جو اردو افسانہ کے فنی لوازمات سے ان کی گہری واقفیت اور بے پناہ دلچسپی کا ثبوت ہے۔ ڈاکٹر صادق ان کے افسانوں کی فنی عظمت کا اعتراف

کرتے ہوئے تحریر فرماتے ہیں:

''... رتن سنگھ کا فن زندگی کے چھوٹے بڑے تجربات سے مختص ہے وہ عصری صداقتوں کو ان کے ابدی روپ میں دیکھنے کے بجائے لمحہ موجود میں دیکھنے کی سعی کرتے ہیں۔ کرداروں کا نفسیاتی تجزیہ ان کے فن میں ژولیدگی پیدا نہیں کرتا بلکہ افسانے کی دلچسپی میں اضافے کا باعث بنتا ہے۔''

(ادب کے سروکار، ڈاکٹر صادق، ثمر پریس، نئی دہلی، اشاعت اول 1996، ص نمبر 91)

رتن سنگھ نے اپنے افسانوں کے ذریعہ خصوصاً اپنے عہد کے حالات و حوادث اور مسائل کو بڑی خوبی سے اجاگر کیا ہے ان کے افسانوں میں دیہی اور شہری دونوں معاشروں کی جیتی جاگتی تصاویر موجود ہیں۔ دیہی زندگی سے وابستہ ان کے افسانے خصوصاً دیہاتیوں کی ان بنیادی ضرورتوں اور مسائل کی جانب توجہ دلاتے ہیں جو قبل آزادی سے اب تک کسی نہ کسی شکل میں موجود ہیں۔

رتن سنگھ کے افسانوں میں آزادی سے قبل کے دیہی معاشرے کی مختلف تصاویر موجود ہیں چونکہ ہجرت سے پہلے ان کا پورا بچپن گاؤں میں گزرا تھا انھوں نے زمینداروں وچودھریوں کے ذریعہ کیے جانے والے استحصال اور ناانصافیوں کو بہت نزدیک سے دیکھا تھا۔ افسانہ 'اکائی' اور 'لہولہو راستے' میں اس سیاق سے متعلق واقعات موجود ہیں۔ افسانہ 'اکائی' میں گاؤں کے ایک ایسے غریب شخص (دلے) کی استحصال بھری زندگی کو پیش کیا ہے جو خدمت خلق کو اپنا نصب العین سمجھتا ہے۔ وہ صبح وشام اپنے گھر میں بیٹھ کر کسانوں کے ہلوں اور کاشتکاری کے دیگر اوزاروں کی مرمت کرتا اور پھر اس کی پوری دوپہر چودھریوں کی چلمیں بھرنے، ان کی ٹانگیں دبانے اور بے گار کرنے میں گزر جاتی۔ باوجود اس کے چودھری اس کو گالیاں دیتے سب کے سامنے جوتے سے بھی مرمت کر دیتے لیکن دلا کبھی بھی حرف شکایت زبان پر نہ لاتا۔ اتنا ہی نہیں ایک دفعہ تو چودھری عنایت اللہ کے والد دلا کو کسی عزیز کے یہاں چھ ماہ کے لیے گروی تک رکھ آئے تھے۔ اقتباس دیکھیے:

''...... چودھری کو کسی عزیز کے پچاس روپے دینے تھے جب وہ کافی دنوں تک یہ رقم لوٹا نہ پائے تو ایک دن انھوں نے دُلے سے کہا چلو بھئی دلے تمھیں ایک رشتے دار کے ہاں لے چلیں۔ تب دلا اٹھارہ سال کا تھا۔ چودھری صاحب کی گھوڑی کے پیچھے چلتا ہوا ان کے عزیزوں کے ہاں گیا۔ چودھری صاحب وہاں دو تین دن رہے اور پھر پتہ نہیں کب گھوڑی پر زین کسوائی اور گاؤں لوٹ آئے۔ جب دلا اپنی چادر کندھے پر ڈال، جوتا پہن، گاؤں لوٹنے کے لیے تیار ہوا تو چودھری کے عزیزوں نے اسے بتایا کہ چودھری اسے پچاس روپے کے عوض یہاں چھ مہینے کے لیے چھوڑ گئے ہیں۔ دلا چھ مہینوں تک ان کا پانی بھرتا رہا اور میعاد پوری ہو جانے پر گاؤں لوٹ آیا۔''

(مجموعہ، پہلی آواز، رتن سنگھ، نصرت پبلشر، لکھنؤ، بار اول 1969، ص نمبر 23)

افسانہ 'لہولہو راستے' میں ایک شخص کا قتل محض اس وجہ سے کر دیا جاتا ہے کہ اس نے چودھری کی حویلی کو سر اٹھا کر دیکھ لیا تھا جو اس بستی کی صدیوں پرانی روایت کے خلاف تھا کیونکہ سر اٹھا کر چلنے کا حق صرف چند چودھریوں کو ہی حاصل تھا اور وہی بستی کی ساری زمین اور پیداوار کے مالک بھی تھے۔ یہی وجہ ہے کہ اس کے بعد بھی (سر اٹھا کر جینے کی خواہش میں) اور چار لوگوں کا قتل کر دیا جاتا ہے... رتن سنگھ چاہتے تو یہاں کہانی ختم ہو سکتی تھی مگر انھوں نے اپنے مختلف افسانوں کی طرح اس کہانی کو بھی ایک نیا موڑ دیا اور یہ منکشف کیا ہے کہ دیہی معاشرہ اب بدل رہا ہے۔ تبدیلی کی اس آہٹ کو انھوں نے یوں پیش کیا ہے:

''اس دلدوز واقعے کے بعد جہاں بستی والے لوگوں کے سر زمین کی طرف اور زیادہ جھک گئے ہیں وہاں بہت سے لوگوں کے دلوں میں یہ خواہش بھی پیدا ہوئی ہے کہ وہ سب ایک ساتھ سر اونچا اٹھالیں... اور پھر جو ہو سو ہو۔'' (مجموعہ پناہ گاہ، رتن سنگھ، نئی دہلی ایڈیشن 2000، ص نمبر 36)

1947 میں ہمارا ملک آزاد تو ہوا مگر تقسیم کی وجہ سے فساد برپا ہوئے جس کی زد میں آکر نہ صرف کئی شہر تباہ ہو گئے بلکہ گاؤں کے گاؤں بھی پوری طرح اجڑ گئے۔ رتن سنگھ نے اپنے کئی افسانوں میں اس عہد کے واقعات کا تذکرہ کیا ہے۔ افسانہ 'پناہ گاہ' اور 'پنجرے کا آدمی' میں بھرپور عکاسی کی ہے... افسانہ 'پناہ گاہ' ایک علامتی افسانہ کہا جا سکتا ہے۔ اس افسانہ میں رتن سنگھ نے دیہی زندگی سے متعلق مختلف پہلوؤں کو اجاگر کیا ہے۔ تقسیم کی وجہ سے دیہاتوں میں جو حالات پیدا ہوئے تھے اس کے متعلق لکھتے ہیں:

''... جب وقت کا وہ ظالم لمحہ قریب آیا جس کے ایک ہی وار نے صدیوں پرانے رشتوں کو کاٹ کر رکھ دیا تھا تو گھر میں موت کا سناٹا چھا گیا۔ گاؤں کا لمبا تڑنگا نمبردار مراد علی آنگن میں کھڑا ہم سب کے گھر سے نکلنے کا انتظار کر رہا تھا۔ اس نے آتے ہی کہا تھا ''جلدی چلو۔ تڑ پھڑ۔ سارے ہندو بازار میں اکٹھا ہو رہے ہیں۔ وہاں سے فوراً ہی چل دینا ہے۔ راوی پار کرنے کے لیے۔''

(مجموعہ، پناہ گاہ، رتن سنگھ، نئی دہلی ایڈیشن 2000، ص نمبر 14)

ایک طرف تو گاؤں کے لوگ ہجرت کے کرب میں مبتلا تھے تو دوسری طرف نمبردار مراد علی جیسے لوگ اس موقع کا فائدہ اٹھا رہے تھے وہ گھر سے نکلنے والے ایک ایک شخص کی تلاشی لے رہے تھے اور ان کی محنت کی جمع رقم ان سے چھین رہے تھے۔ اقتباس پیش ہے:

''جب دادی دوپٹہ اوڑھ کر باہر آئیں تو ان کے ہاتھوں میں پکڑی ہوئی چاندی والی پوٹلی نمبردار نے لے کر اپنی بغل میں دبالی اور پھر وہ میرے والد کے ہاتھوں میں پکڑے ہوئے کاغذات دیکھنے لگا کہ کہیں ان میں نوٹ تو نہیں چھپائے ہیں۔''

(مجموعہ، پناہ گاہ، رتن سنگھ، نئی دہلی ایڈیشن 2000، ص نمبر 14)

اس افسانہ میں رتن سنگھ نے گاؤں پر تقسیم کے اثرات کے علاوہ گاؤں کی خوبیوں اور خامیوں کے ساتھ ساتھ سیلاب سے پیدا ہونے والے مسائل کی تصویر بھی دکھائی ہے:

''ہمارے گاؤں میں دوسرے تیسرے سال باڑھ آجاتی تھی۔ راوی کا پانی اپنے کناروں کو توڑ کر ہمارے گاؤں کو جب کالے ناگ کی طرح گھیرتا تو ہر طرف پانی ہی پانی نظر آتا۔ ہماری گلی کے سامنے جو چوڑا راستہ جاتا ہے وہاں تو گھٹنوں گھٹنوں پانی ہوتا لیکن ذرا آگے بڑھو تو یہی پانی گلے سے بھی اوپر ہو جاتا۔ ایسی باڑھ کے وقت پانی کی تیز دھاروں کی سائیں سائیں سے سارے گاؤں پر دہشت چھا جاتی۔ ہر شخص گھبرایا ہوا ہوتا۔''

(مجموعہ پناہ گاہ، رتن سنگھ، نئی دہلی ایڈیشن 2000، ص 17)

قومی یکجہتی جو گاؤں کی ایک بڑی خوبی ہے اس افسانے میں پیش کی گئی ہے گاؤں کے دو خاندان الگ الگ ہونے کے باوجود اس قدر ایک معلوم ہوتے ہیں کہ باہر سے آنے والے مہمان اس کا اندازہ تک نہیں لگا پاتے اقتباس ملاحظہ ہو:

''... باہر سے آنے والے مہمان گھر میں دو دو مہینے رہ جاتے اور کسی کو یہ پتہ نہ چلتا کہ دسترخوان پر رکھا ہوا کھانے کا سامان دو رسوئیوں سے، دو گھروں سے بن کر آیا ہے۔ وہ سب یہی سمجھتے کہ دونوں بھائی بڑی محبت سے مل جل کر رہ رہے ہیں۔''

(مجموعہ، پناہ گاہ، رتن سنگھ، نئی دہلی ایڈیشن 2000، ص نمبر 16)

الغرض، پناہ گاہ، دیہی زندگی کے کئی حقیقی پہلوؤں کو روشن کرتا ہے۔ اتنا ہی نہیں اس میں پیش کردہ واقعات رتن سنگھ کی آپ بیتی سے بہت حد تک میل کھاتے ہیں... 'پنجرے کا آدمی' بھی ایسا ہی ایک افسانہ ہے جو درد ہجرت سے معمور ہے۔ یہ افسانہ دیہی زندگی سے ان کی دلی محبت کا اظہار ہے۔ افسانہ میں جگہ جگہ ایک سچے دیہاتی کی ذہنی الجھنیں اور خواہشیں جھلکتی ہوئی نظر آتی ہیں۔ یہ وہی دیہی باشندہ ہے جو ہجرت کی وجہ سے شہر تو آگیا لیکن اپنے گاؤں اپنے گھر واپس جانے کی تمنا رکھتا ہے مگر جا نہیں پاتا کیونکہ:

''... وہاں تو پانچ اجنبی اپنی بندوقوں کا رخ اس طرف کیے ہوئے تھے جیسے کہہ رہے ہوں ''خبردار اپنے گھر کی طرف آنے کی کوشش کی۔ اس لکیر کے پار آنا منع ہے۔''

(مجموعہ، پنجرے کا آدمی، رتن سنگھ، نامی پریس لکھنؤ، ایڈیشن 1973، ص نمبر 13)

آزادی کے بعد ہندستان کی دیہی زندگی میں جو تبدیلیاں رونما ہو رہی تھیں رتن سنگھ کے افسانوں میں اس کی عکاسی بڑی خوبصورتی سے ہوئی ہے خصوصاً دیہی معاشرے کے بدلے ہوئے مسائل ان کے افسانوں میں جا بجا دیکھے جا سکتے ہیں۔ ان کا بہترین افسانہ 'چھلنی کے چھید' اس سلسلے کی عمدہ مثال ہے۔ اس افسانے میں پریم چند کے مشہور افسانے 'کفن' سے آگے کی کہانی پیش کی گئی ہے اس کے کردار بھی ویسے ہی ہیں جیسے 'کفن' کے ہیں۔ کہانی یوں شروع ہوتی ہے کہ گھیسو اور مادھو، دھنیا کی موت پر آنسو بہا رہے ہیں لیکن جب گھیسو کو یہ بات معلوم ہوتی ہے کہ اس کی بہو کے کفن دفن کے لیے دہلی کی مرکزی سرکار پانچ ہزار روپے بھیج رہی ہے تو وہ روتے روتے چپ ہو جاتا ہے اور پھر یکا یک خیالوں میں ڈوبتا ابھرتا ہے:

''پہلے تو اسے سمجھ ہی نہیں آئی کہ مرکزی سرکار کیا ہوتی ہے اور جب سرپنچ کے دس بار سمجھانے پر بھی بات سمجھنے میں نہ آئی تو اس نے اس کے لیے سر کھپانے کی ضرورت نہیں سمجھی۔ اس کے لیے اتنا سمجھ لینا ہی کافی تھا کہ کوئی سرکار نام کا شخص اس کی بدحالی پر ترس کھا کر اس کی مری ہوئی بہو کا کریا کرم کرنے کے لیے پانچ ہزار روپے بھیج رہا ہے۔''

(مجموعہ، پناہ گاہ، رتن سنگھ، نئی دہلی ایڈیشن 2000، ص نمبر 323)

اس افسانے کے ذریعہ رتن سنگھ نے گاؤں میں موجود فرسودہ رسم و رواج کو اجاگر کرتے ہوئے فرسودہ سیاسی نظام حکومت پر خاصہ طنز کیا ہے اور خصوصاً اس بات کو اجاگر کیا ہے کہ آزادی کے بعد بھی دیہات میں استحصال کا سلسلہ کسی نہ کسی صورت میں اب بھی جاری ہے۔

افسانہ 'باپو' بھی گاؤں والوں کو ان کا حق نہ ملنے کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ اس افسانے میں ایک ڈیم بننے سے قبل ہی وہاں شہر بسانے کا سلسلہ شروع ہو جاتا ہے یہی وجہ ہے کہ تعمیر ڈیم کے دوران ایک بزرگ مختلف لوگوں سے بار بار یہ سوال کرتا ہے کہ کیا کلو کے گھر تک اس ڈیم کی بجلی پہنچے گی کیا کلو کے سوکھے کھیتوں کو اس ڈیم سے نکلنے والی نہر سیراب کرے گی؟ لیکن بزرگ کے اس سوال کا صحیح جواب کوئی بھی نہیں دے پاتا۔ آخرکار ڈیم بن کر تیار ہو جاتا ہے تو وہاں ڈیم پر کام کرنے والوں کے لیے ہزاروں مکانوں کی ایک بستی بھی بسائی جاتی ہے ساتھ ہی ساتھ بستی کے وسطی چوک میں مہاتما گاندھی کا ایک قد آدم مجسمہ بھی نصب کیا جاتا ہے اور ڈیم کے ادگھاٹن کے موقع پر اس مجسمے سے بھی پردہ ہٹایا جاتا ہے تو دیکھا جاتا ہے کہ:

''لاغر سا جسم، کمر میں لنگوٹی، باقی بدن ننگا۔ ایک ہاتھ میں سوٹی اور آنکھوں پر پتلا سا چشمہ، اس کے ہونٹ ہلتے ہوئے سے معلوم ہو رہے تھے جیسے وہ ان سب سے پوچھ رہا ہو.. 'جس ڈیم کو تم نے بنایا ہے اس کی بجلی کلو کے گھر گئی ہے یا نہیں اور اس نہر کا پانی کلو کے کھیتوں کو سیراب کر رہا ہے یا نہیں؟''

(پنجرے کا آدمی، رتن سنگھ، نامی پریس لکھنؤ، ایڈیشن 1973، ص نمبر 35)

افسانہ کا یہ آخری حصہ دیہی زندگی کے بنیادی مسائل کی طرف بہت حد تک اشارہ کرتا ہے۔

افسانہ 'صرف ایک آدمی کا درد' میں رتن سنگھ نے قحط سے پیدا ہونے والے حالات کو اجاگر کرتے ہوئے یہ بتایا ہے کہ قحط سے نہ صرف کسان کے کھیت سوکھ جاتے ہیں بلکہ کھیتوں کو پانی دینے والے کنوئیں، تالاب، ندیاں نالے وغیرہ بھی سوکھ جاتے ہیں اور ایسا لگتا ہے جیسے پوری انسانی زندگی تھم سی گئی ہو... ایسے حالات میں ایک کسان (جس کے خاندان کے سارے افراد مر چکے تھے) اپنے کھیت سے میلوں دور ایک سوکھی ندی کے پاٹ میں گہری کھودائی کر کے پانی کے کچھ قطروں کو مٹی کے ایک برتن میں سمیٹ کر اپنے کھیت کو سیراب کرنے کے لیے لاتا ہے اور اس کی یہ کوشش کئی دنوں تک جاری رہتی ہے۔ آخرکار اس کے جسم کی رہی سہی طاقت بھی ختم ہونے لگتی ہے اور اس کی آنکھوں سے دو آنسو نکلتے ہیں جو کھیت کو سیراب کر دیتے ہیں اور اسی وقت اتنی بارش ہوتی ہے کہ زمین کی ساری پیاس مٹ جاتی ہے... مختصر یہ کہ اس افسانہ کے ذریعہ نہ صرف قحط کے اثرات سے واقفیت ہوتی ہے بلکہ ایک کسان اپنے کھیت اور فصل سے کس حد تک محبت کرتا ہے اس کا اندازہ بھی لگایا جا سکتا ہے۔

مذکورہ بالا اقتباس سے بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ضعیف الاعتقادی کی وجہ سے دیہی زندگی کس حد تک متاثر ہوتی ہے۔

رتن سنگھ نے اپنے افسانوں میں نہ صرف گاؤں کے دبے کچلے لوگوں کی زندگانی اور مسائل کو اجاگر کیا ہے بلکہ جاگیرداروں اور امیروں کی گھریلو زندگی اور آپسی جھگڑوں کو بھی بڑی خوبی سے پیش کیا ہے۔ افسانہ 'لوک گیت کے آنسو' اور 'دیوار' اس سلسلے کی مثالیں ہیں۔ افسانہ 'دیوار' میں جھگڑے کے ڈر سے بڑی حویلی کے اندر تقسیم کی دیوار تو کھینچ جاتی ہے لیکن نفرت کی آگ کہاں بجھنے والی تھی یہی وجہ ہے کہ اکثر دونوں بھائیوں میں کسی نہ کسی بات کو لے کر جھگڑا ہوتا رہتا اور یہ جھگڑا آہستہ آہستہ اس حد تک بڑھ چکا تھا کہ دونوں ایک دوسرے کے خون کے پیاسے بن گئے۔ افسانہ یہاں ختم ہو سکتا تھا مگر یہ رتن سنگھ کا کمال ہے انھوں نے اس نفرت کو ختم کرنے کے لیے ایک اور مختصر واقعہ کو پیش کیا ہے جس میں نفرت کو مٹانے کی تدبیر مضمر تھی لکھتے ہیں:

''نفرت کی دیواریں گیتیوں اور پھاوڑوں سے نہیں محبت کے اظہار سے ڈھہا کرتی ہیں۔''

(مجموعہ پناہ گاہ، رتن سنگھ، نئی دہلی ایڈیشن 2000، ص 141)

مختصر یہ کہ رتن سنگھ ایک کامیاب افسانہ نگار تھے۔ فنی اعتبار سے ان کے افسانے بڑے وقیع ہیں۔ وہ کہانی کہنے کا ڈھنگ خوب جانتے تھے۔ انھوں نے مختلف موضوعات پر افسانے لکھے ہیں جن میں دیہی زندگی اور وہاں کے مسائل بھی شامل ہیں۔ دیہاتی زندگی سے وابستہ ان کے افسانوں کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ ان میں اکثر دیہات کا بنیادی ڈھانچہ اپنے بنیادی مسائل کے ساتھ نظر آتا ہے اور اس طرح ان کا پیش کردہ دیہات ہندستان کے ہر گوشے میں دیکھا جا سکتا ہے... یہ سچ ہے کہ ہندستان میں آزادی کے بعد مختلف ترقیاتی منصوبوں کے تحت دیہاتی زندگی بدلتی جا رہی ہے پھر بھی اگر غور سے دیکھا جائے تو اب بھی دیہات نے ترقی کی وہ منزلیں طے نہیں کیں جس کی توقع کی گئی تھی۔ اس کی سب سے بڑی وجہ دیہاتیوں کا استحصال ان کی غریبی اور ضعیف الاعتقادی ہے جو اب بھی کسی نہ کسی شکل میں وہاں اپنی جڑیں پھیلائے ہوئے ہیں۔ ضرورت اس بات کی ہے کہ دیہات کے ان بنیادی مسائل کی طرف توجہ دی جائے اتنا ہی نہیں انھیں حل کرنے کی ہر ممکن کوشش ہونی چاہیے کیونکہ ایسا کہا جاتا ہے کہ کسی بھی ملک کی ترقی کا اندازہ وہاں کی دیہی ترقیات سے لگایا جاتا ہے...!

رتن سنگھ کے عزم و حوصلہ کو دیکھتے ہوئے ان کے مداحین یہ قیاس آرائی کر رہے تھے کہ ان کی حیات ایک صدی کو پار کر جائے گی مگر موت سے کس کو رستگاری ہے۔ ابھی ان کی عمر کو ایک صدی کی تکمیل میں چند سال باقی تھے کہ 2 مئی 2021 کو (94) سال کی عمر میں وہ ہم سے جدا ہو گئے۔ افسانوی ادب کے افق پر یہ ستارہ 70 سالوں تک جگمگاتا رہا۔ اس طویل المدت ادبی سفر میں انھوں نے افسانہ نگاری کی آبیاری جس استقلال اور استغراق سے کی ہے وہ بے مثال و باکمال ہے۔

■

Dr.Narayan Patidar
Department of Urdu
Bhagat Singh Govt.PG college
Jaora, Distt-Ratlam - 457226 (MP)
Mob:8305065238

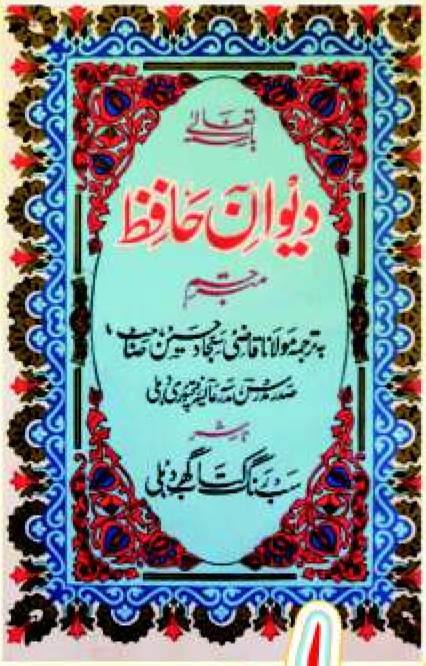

مولانا قاضی سجاد حسین کی ادبی خدمات

عتیق الرحمن

مولانا قاضی سجاد حسین محلہ قاضیان، کرتپور، ضلع بجنور میں 3 نومبر 1910 کو پیدا ہوئے۔ آپ کے والد کا نام قاضی شمشاد حسین تھا۔ قاضی سجاد کے آباواجداد کو عہدۂ قضا اور جاگیریں مغل بادشاہ اکبر کے زمانے میں عطا کی گئی تھیں۔ سجاد حسین صاحب کی ابتدائی تعلیم کرتپور میں ہوئی۔ اس کے بعد انھوں نے دیوبند کا رخ کیا جہاں سے سند فراغت حاصل کر کے مدرسہ فتحپوری دہلی میں درس وتدریس کا مشغلہ شروع کیا اور وہیں 1947 میں صدر مدرس کے منصب پر فائز ہوئے۔ قاضی سجاد حسین نے تدریس کے ساتھ ساتھ 1934 میں الہ آباد بورڈ سے 'فاضل ادب' کا امتحان اول درجے سے پاس کیا پھر 1935 میں پنجاب یونیورسٹی سے عربی میں آنرز کی سند اول نمبر سے حاصل کی اور سلور میڈل سے نوازے گئے۔

سجاد حسین صاحب کی شخصیت جہاں علم کی وجہ سے ممتاز تھی وہیں آپ کی سماجی خدمات بھی قابل تحسین ہیں۔ آپ نے بہت سے لوگوں کو روزگار کے مواقع فراہم کرائے، عربی اور فارسی کا عالم ہونے کی حیثیت سے آپ نے ایران، ترکی اور سعودی عرب کے سفر کیے۔ اہل علم حضرات میں آپ کی بہت پذیرائی ہوئی۔ جمیعۃ العلماء اور ہمدرد دواخانہ سے آپ کا خصوصی تعلق تھا۔ حکیم عبدالحمید صاحب، مالک ہمدرد دواخانہ سے آپ کا تعلق تاحیات رہا۔ آپ نے غالب اکیڈمی میں خطاطی اور اردو ٹائپنگ کے کورسیز شروع کرائے۔

مولانا قاضی سجاد حسین کی فارسی کتابوں کے اردو تراجم اہل علم کے درمیان کافی مقبول ہوئے۔ ان تراجم میں گلستان، بوستاں، اخلاق محسنی، دیوان حافظ، مالا بدمنہ اور مثنوی معنوی (شش جلدی) خاص طور سے قابل ذکر ہیں۔ اس کے علاوہ مولانا نے پند نامہ، کریمہ سعدی، کتاب توشیحات (سبع معلقات)، سراج الہند پر حواشی تحریر کیے ہیں۔ مولانا نے اس کے علاوہ حکومت ہند کے ایک پروجیکٹ فتاوی تاتارخانی کی ایڈیٹنگ کا کام شروع کیا جو عربی زبان میں نو جلدوں پر مشتمل ہے۔ سجاد حسین صاحب نے پانچ جلدوں کی ایڈیٹنگ کی تھی اور ان کے انتقال کے بعد یہ پروجیکٹ نامکمل رہ گیا اور اس کی شائع شدہ جلدیں حکومت کی تحویل میں ہیں۔

1966 میں حکومت ہند نے مولانا کی فارسی خدمات پر انھیں سرٹیفکیٹ آف آنرز ان پرشین اور وظیفے سے نوازا جو انھیں تاحیات ملتا رہا۔

یوں تو فارسی کی بہت سی اہم کتابوں کا ترجمہ اور شرح فارسی سے فارسی اور انگریزی میں ہوئی ہیں۔ خاص طور سے فارسی کی مشہور ومعروف کتابوں میں گلستاں، بوستاں، دیوان حافظ اور مثنوی معنوی وغیرہ کا ترجمہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں ہو چکا ہے۔ اسی سے ان کتابوں کی اہمیت، افادیت اور عظمت کا بخوبی اندازہ لگایا جا سکتا ہے کہ ہندوستان میں پہلی بار قاضی سجاد حسین صاحب نے گلستاں پر حواشی لکھنے کی زور آزمائی کی جس کی اہل علم طبقے نے حوصلہ افزائی کی اس کے بعد یکے بعد دیگرے مولانا نے گلستاں سعدی، بوستاں سعدی، اخلاق محسنی، گلزار دبستاں، دیوان حافظ ومثنوی مولانا روم کے تراجم اردو میں کیے اور اس کے علاوہ قاضی سجاد صاحب نے پند نامہ، کریمہ سعدی، حمد باری، مالا بدمنہ اور سراج الہند پر حواشی لکھے ہیں اور عربی کتاب فتاوی تاتارخانی کی ایڈیٹنگ بھی کی ہے۔ مولانا کے چند تراجم اور حواشی مندرجہ ذیل ہیں:

سجاد حسین صاحب کی شخصیت جہاں علم کی وجہ سے ممتاز تھی وہیں آپ کی سماجی خدمات بھی قابل تحسین ہیں۔ آپ نے بہت سے لوگوں کو روز گار کے مواقع فراہم کرائے، عربی اور فارسی کا عالم ہونے کی حیثیت سے آپ نے ایران، ترکی اور سعودی عرب کے سفر کیے۔ اہل علم حضرات میں آپ کی بہت پذیرائی ہوئی۔ جمیعۃ العلما، اور ہمدرد دواخانہ سے آپ کا خصوصی تعلق تھا۔ حکیم عبدالحمید صاحب، مالک ہمدرد دواخانہ سے آپ کا تعلق تا حیات رہا۔ آپ نے غالب اکیڈمی میں خطاطی اور اردو ٹائپنگ کے کورسیز شروع کرائے۔

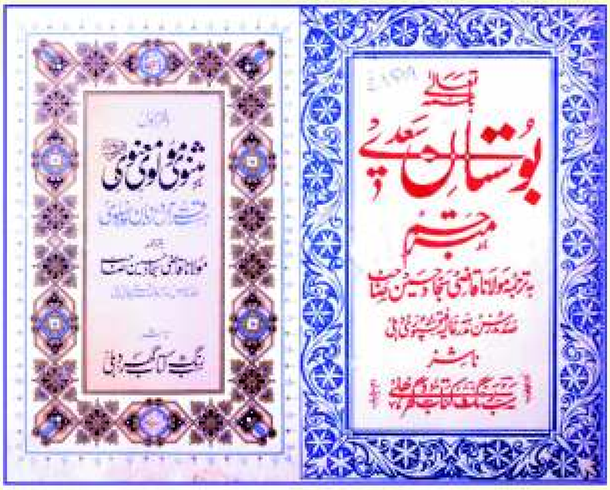

گلستاں سعدی: شیخ سعدی نے یہ کتاب 656ھ میں شہزادہ سعد بن ابو بکر زنگی کے نام معنون کی، گلستاں اخلاق و موعظت کا ایک بہترین مرقع ہے۔ اس میں ایک مقدمہ اور آٹھ ابواب ہیں۔ ذرائع ابلاغ کے وسائل نہ ہونے کے باوجود گلستاں اپنی جادو بیانی اور فصاحت و بلاغت کی وجہ سے شیخ سعدی کی زندگی ہی میں ایران، ترکستان، تاتار اور ہندوستان میں پھیل گیا تھا۔

مولانا قاضی سجاد حسین گلستاں کی مقبولیت پر لکھتے ہیں:

''غور تو کرو گلستاں میں نہ غزل عاشقانہ ہے نہ قول عارفانہ، نہ بہادروں کے کارنامے، نہ فوق العادت قصے، نہ حقائق و معارف، نہ اسرار شریعت، نہ نکات طریقت بلکہ اس کی بنیاد محض اخلاق و پند و موعظت پر رکھی گئی جس سے زیادہ بے نمک مضمون نہیں ہو سکتا۔ اس پر بھی وہ اس قدر مقبول ہوئی، اور محض اس لیے ہوئی کہ فصاحت و بلاغت، حسن بیان اور لطائف ادا کے لحاظ سے تمام فارسی ادب میں بے مثل اور لاجواب ہے اس لیے دنیا کی ہر زندہ قوم نے گلستاں کا اپنی زبان میں ترجمہ کیا ہے اور گلستاں زندۂ جاوید بن چکی ہے۔'' (گلستاں، ترجمہ قاضی سجاد حسین، سب رنگ کتاب گھر، دہلی، ص4)

قاضی سجاد حسین نے گلستاں کے ترجمے میں ادبی معنویت کو برقرار رکھتے ہوئے اس کے فلسفیانہ، حکیمانہ اور نصیحت آمیز قصے کو بخوبی اپنے لفظوں میں ڈھالا ہے اور جا بجا درمیان میں آئے عربی شعر اور مقولے کو بھی بڑے عالمانہ انداز میں اپنے لفظوں کے سانچے میں ڈھال کر گلستاں کے کلاسیکی انداز کو بھی بخوبی نبھایا ہے۔ علاوہ بریں گلستاں کے دیگر اردو تراجم بھی موجود ہیں لیکن ان میں ترجمے کی وہ خوبیاں اور انداز بیاں نظر نہیں آتا۔ قاضی سجاد صاحب کی ترجمہ کردہ گلستاں آج بھی ہندوستان کے مختلف مدارس کے نصاب میں شامل ہے اور گلستاں کی اہمیت اور افادیت کا اندازہ اس بات سے لگایا جا سکتا ہے کہ سات سو سال سے زائد کا وقفہ گذر جانے کے بعد بھی اس کی ادبی معنویت اور چاشنی میں کوئی کمی نہیں آئی ہے۔ گلستاں سعدی مندرجہ ذیل آٹھ ابواب پر مشتمل ہے:

باب اول: در سیرت پادشاہاں (بادشاہوں کی سیرت کے بارے میں)
باب دوم: در اخلاق درویشاں (درویشوں کے اخلاق کے بیان میں)
باب سوم: در فضیلت قناعت (قناعت کی فضیلت کے بیان میں)
باب چہارم: در فوائد خاموشی (خاموشی کے فوائد کے بارے میں)
باب پنجم: در عشق و جوانی (عشق اور جوانی کے بارے میں)
باب ششم: در ضعف پیری (بڑھاپے کی کمزوری کے بارے میں)
باب ہفتم: در تاثیر تربیت (پرورش کی تاثیر کے بارے میں)
باب ہشتم: در آداب صحبت و حکمت (صحبت اور حکمت کے آداب میں)

بوستاں سعدی: گلستاں کی طرح بوستاں بھی شیخ سعدی کی دوسری اہم تصنیف ہے، اور جس طرح نثر میں گلستاں کو امتیاز اور شرف حاصل ہے، بوستاں کو نظم میں وہی درجہ میسر ہے۔ فارسی ادب میں تین شاعر اپنی اپنی صنف میں امام مانے جاتے ہیں۔ اس ضمن میں یہ دو شعر ملاحظہ ہوں:

در شعر سہ کس پیمبرانند — ہر چند کہ لا نبی بعدی
ابیات و قصیدہ و غزل را — فردوسی و انوری و سعدی

فارسی ادب میں جس طرح یہ تین شاعر تین بڑی بڑی اصناف سخن کے مالک ہیں اور سعدی ان تینوں کے امام ہیں اسی طرح فارسی نظم میں تین کتابیں بہت بلند پایہ سمجھی جاتی ہیں۔ (1) شاہنامہ، (2) مثنوی مولانا روم (3) دیوان حافظ۔ لیکن ان میں سے ہر ایک اپنی ایک خصوصیت کی وجہ سے مشہور ہے۔ مثلاً 'شاہنامہ' رزمیہ قصوں کی وجہ سے۔ 'مثنوی معنوی' شریعت کے احکامات و تصوف کے بیان میں ہونے کی وجہ سے اور 'دیوان حافظ' اپنے تغزلی رنگ کی وجہ سے لیکن بوستاں کی خوشبو و طراوت کسی خارجی کوائف کا نتیجہ نہیں بلکہ اس کی ذاتی اور حقیقی ہے۔

(بوستاں، ترجمہ قاضی سجاد حسین، سب رنگ کتاب گھر، دہلی، ص1)

سعدی شیرازی نے بوستاں 655ھ میں ابوبکر سعد بن زنگی کے نام معنون کیا ہے۔

بوستاں سعدی دس ابواب پر مشتمل ہے جو مندرجہ ذیل ہیں:

1. باب اول: در عدل و رای و تدبیر جہانداری (عدل و رای اور جہانداری کی تدبیر کے بیان میں)
2. باب دوم: در احسان (احسان کے بارے میں)
3. باب سوم: در عشق (عشق کے بارے میں)
4. باب چہارم: در تواضع (تواضع سے متعلق)
5. باب پنجم: در رضا (رضا کے بارے میں)
6. باب ششم: در قناعت (قناعت سے متعلق)
7. باب ہفتم: در تربیت (تربیت کے بارے میں)
8. باب ہشتم: در شکر (شکر کے بیان میں)
9. باب نہم: در توبہ (توبہ کے بارے میں)
10. باب دہم: در مناجات (مناجات کے بیان میں)

دیوان حافظ: سرزمین ایران اپنی تاریخ، تہذیب اور ثقافت کے لحاظ سے ہمیشہ ممتاز رہی ہے، اور ہندوستان سے اس کے تہذیبی اور تاریخی روابط کافی پرانے رہے ہیں اور دونوں ملکوں کے درمیان تجارتی اور ثقافتی تعلقات کی قدامت سے بھی انکار نہیں کیا جا سکتا۔ ایران کے باشندے کو حسن اور فنون لطیفہ سے بڑی گہری مناسبت ہے اس علمی سرزمین نے بہت سے عالم، فلسفی، شاعر، صوفی اور آرٹسٹ پیدا کیے جن کو اپنی انفرادی خصوصیات کے لحاظ سے صفحات تاریخ پر نمایاں مقام حاصل ہے۔ ایران کے عظیم شعرا میں فردوسی، خیام، سعدی اور حافظ کو قبول عام ملا ہے وہ ان کے باکمال ہونے کی ایک روشن دلیل ہے۔ انھیں سلسلے کی کڑی کو استوار کرنے کے لیے قاضی سجاد صاحب نے دیوان حافظ کا اردو ترجمہ کر کے دونوں ملکوں کے تعلیمی اور ادبی روابط کو مضبوط کرنے کی کامیاب کوشش کی ہے۔

مولانا قاضی سجاد حسین صاحب نے گلستاں، بوستاں اور اخلاق محسنی کے بعد دیوان حافظ کا اردو ترجمہ شائع کیا۔ حافظ کی غزل کا انداز بالکل انفرادی ہے یہ لب و لہجہ انھیں کے لیے مخصوص ہے، ان کے اشعار ایک خاص کیفیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں۔ حافظ کے کلام میں ایسی سحر آفریں تاثیر پائی جاتی ہے جو گلوں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے۔

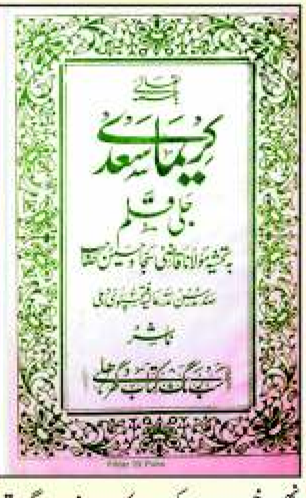

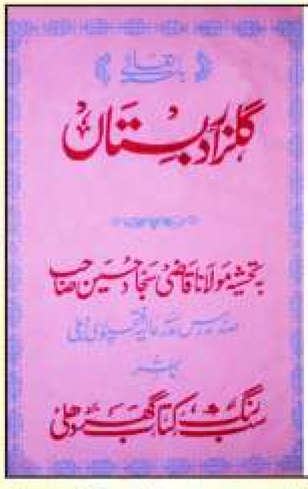

انھیں خصوصیات کی بنا پر کلام حافظ ہر جگہ مقبول ہے۔ ہندوستان میں جب تک فارسی کا ذوق رہا دیوان حافظ بغیر ترجمہ کے پڑھا اور سمجھا جاتا رہا لیکن جب یہ مذاق کم ہو گیا تو حافظ کو پڑھنے اور سمجھنے کی غرض سے تراجم کی ضرورت ہونے لگی۔ بعض حضرات نے وقت کے تقاضوں کا خیال رکھتے ہوئے دیوان حافظ کے اردو تراجم شائع کیے۔ جس انداز سے ان کی اشاعت ہوئی اس میں وہ حسن اور معیار نہ تھا جس سے ذوق کی تسکین ہوتی۔

مولانا نے عوام کے ذوق بلندی کا احترام کرتے ہوئے دیوان حافظ کو ایک معیاری ترجمہ کے ساتھ اہل علم وفن کے سامنے پیش کیا اور ترجمہ کی زبان کی سلاست وروانی اور اختصار کا پورا خیال رکھا ہے۔ قاضی سجاد حسین صاحب نے زائد اور غیر ضروری الفاظ سے احتراز کیا اور اس بات کی حتی المقدور کوشش کی ہے کہ اصل شعر کی روح وروانی باقی رہے اور آسان نثر میں منتقل ہو جائے۔

حافظ کی غزل کا انداز بالکل انفرادی ہے یہ لب ولہجہ انھیں کے لیے مخصوص ہے ان کے اشعار ایک خاص کیفیت کے آئینہ دار ہوتے ہیں ان کے کلام میں ایک ایسی سحر آفریں تاثیر پائی جاتی ہے جو دلوں کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے انھیں خصوصیات کی بنا پر کلام حافظ ہر جگہ مقبول ہے۔

مثنوی معنوی: مولانا کی اسی کتاب نے مولانا روم کو حیات جاوداں عطا کی ہے۔ اس کتاب کی مقبولیت اور ہر دلعزیزی اس قدر بڑھی کہ تمام ایرانی تصانیف اس کے مقابلے میں ہیچ ہو کر رہ گئیں۔ اس مثنوی کے کل اشعار کی تعداد 2666 ہے۔ مثنوی کے لغوی معنی تو دو والا ہیں، اصطلاح میں اس نظم کو مثنوی کہا جاتا ہے جس کے ہر شعر میں دو قافیے ہوں ایک پہلے مصرع میں ایک دوسرے مصرع میں۔ مولانا کی اس مثنوی کو مثنوی معنوی بھی کہا جاتا ہے کیونکہ اس میں عالم معنی اور احوال باطن کے اسرار و معارف کا تذکرہ ہے۔ مسائل تصوف اور اسرار معارف کے بیان میں سلطان ابو سعید ابوالخیر کی رباعیات بھی مشہور ہیں۔ حکیم سنائی رحمۃ اللہ علیہ نے حدیقہ لکھا جو تصوف کی پہلی منظوم کتاب ہے۔ خواجہ فریدالدین عطار نے تصوف کے موضوع پر مختلف مثنویاں تحریر فرمائیں جن میں منطق الطیر کو زیادہ شہرت اور مقبولیت حاصل ہوئی۔ لیکن اب اس موضوع پر سب سے زیادہ اہمیت مولانا روم کی مثنوی کو ہی حاصل ہے۔ اس مثنوی کی تصنیف کا سبب مولانا کے مرید حسام الدین چلپی بنے ہیں۔ چنانچہ مولانا نے دفتر اول کے علاوہ ہر دفتر میں ان کا ذکر کیا ہے۔ (مثنوی معنوی، ترجمہ قاضی سجاد حسین، حامد اینڈ کمپنی، لاہور، ص9)

مولانا قاضی سجاد حسین نے مثنوی معنوی مولانا روم کی چھ جلدوں کو اردو تراجم اور حواشی کے ساتھ شائع کیا ہے۔ جبکہ اس معروف ترین ومشہور ترین عرفانی منظومہ کا ترجمہ دنیا کی بیشتر زبانوں میں ہو چکا ہے۔ ان چھ جلدوں کو قاضی صاحب نے یکے بعد دیگرے، جن میں چھبیس ہزار اشعار ہیں بڑے ہی عمدہ اور پر معنی انداز میں شائع کیا ہے۔ یہ کتاب سات سو سالوں سے زیادہ کا وقفہ گذر جانے کے بعد بھی ایران اور ہندوستانی مکاتب و مدارس کے نصاب میں شامل ہے۔ ایران کی چار کتابوں مثلاً شاہنامہ فردوسی، گلستاں سعدی، دیوان حافظ اور مثنوی معنوی کو جس قدر شہرت حاصل ہوئی وہ دیگر ایرانی کتب کو حاصل نہ ہو سکی۔ مثنوی معنوی نے مولانا روم کو حیات جاوداں عطا کی ہے۔ مولانا نے مختلف موضوعات کو اپنی ضخیم تصنیف میں سمو دیا ہے اور جا بجا فلسفیانہ مسائل پر روشنی ڈالی ہے۔ اس ضمن میں مولانا کے دو شعر ملاحظہ ہوں۔

جفت جفت و عاشقان جفت خویش   جملہ اجزاء جہان زان محکم پیش
با تو چون آہن و آہن ربا   آسمان گوید، زمین را مرحبا

فارسی وہ زبان ہے جس نے ہندو پاکستان پر بڑے گہرے خوبصورت نقش ونگار بنائے ہیں اردو پر فارسی کا بہت اثر ہے جس طرح مغلوں کے ان نقوش کو ملک کی تہذیب اور کلچر سے محو نہیں کیا جا سکتا جو صدیوں تک ابھرتے رہے ہیں اور اب اس کے جوہر میں سرایت کر چکے ہیں اسی طرح فارسی کی حلاوت کو اردو سے جدا نہیں کیا جا سکتا۔ اردو کی بین الاقوامی شہرت اور مقبولیت میں فارسی کا حصہ بہت زیادہ ہے۔ فارسی نہایت میٹھی رسیلی اور اثر انگیز زبان ہے اس میں رومان اور وہ نزاکت ورعنائی ہے جو صرف محسوس ہی کی جا سکتی ہے اس زبان کے اشعار میں بھی بڑی سہل نشین تاثیرات پائی جاتی ہیں۔ یہ کافی مالدار زبان ہے اور لٹریچر کا بہت بڑا ذخیرہ اپنے دامن میں رکھتی ہے فارسی کی بڑی خصوصیت یہ ہے کہ اس میں قوم پرستی اور وطن دوستی کا سمندر بند ہے۔ ایران کی تاریخ سے ظاہر ہے کہ قوم پرستی کا جذبہ ہر دور میں وہاں موجود رہا ہے۔

فارسی کتابوں کے تراجم کی وساطت سے حب الوطنی کی یہ شراب چھن چھن کر آتی رہی ہے فارسی لٹریچر کو اردو لباس پہنانے کا سب سے بڑا فائدہ یہی ہے۔ خاص طور پر حافظ جیسے بین الاقوامی فن کار کی تخلیقات کو اردو میں منتقل کرنا اس لیے بھی ضروری ہے کہ وہ مختلف فرقوں میں یک جہتی اور ہم آہنگی کی روح پیدا کرنے کے محرک ہیں وہ صوفیزم کے علمبردار تھے جس میں سب سے زیادہ اہمیت انسانیت کو حاصل ہے مذہب ان کے یہاں ثانوی درجہ رکھتا ہے۔ (گلستاں، ترجمہ قاضی سجاد حسین، پروگریسیو بکس، لاہور، ص40و41)

منابع وماخذ

1 گلستاں سعدی، سعدی شیرازی، مترجم قاضی سجاد حسین، سب رنگ کتاب گھر، دہلی
2 گلستان، سعدی شیرازی، مترجم ومحشی، مولانا قاضی سجاد حسین، مکتبہ رحمانیہ، لاہور
3 بوستان، سعدی شیرازی، مترجم ومحشی، مولانا قاضی سجاد حسین، مکتبہ رحمانیہ، لاہور
4 بوستاں سعدی، سعدی شیرازی، مترجم قاضی سجاد حسین، سب رنگ کتاب گھر، دہلی
5 مثنوی معنوی ج1، مولانا جلال الدین رومی، ترجمہ، مولانا قاضی سجاد حسین، حامد اینڈ کمپنی، لاہور
6 مثنوی معنوی ج2، مولانا جلال الدین رومی، ترجمہ، مولانا قاضی سجاد حسین، حامد اینڈ کمپنی، لاہور
7 مثنوی معنوی ج3، مولانا جلال الدین رومی، ترجمہ، مولانا قاضی سجاد حسین، حامد اینڈ کمپنی، لاہور
8 مثنوی معنوی ج4، مولانا جلال الدین رومی، ترجمہ، مولانا قاضی سجاد حسین، حامد اینڈ کمپنی، لاہور
9 مثنوی معنوی ج5، مولانا جلال الدین رومی، ترجمہ، مولانا قاضی سجاد حسین، حامد اینڈ کمپنی، لاہور
10 مثنوی معنوی ج6، مولانا جلال الدین رومی، ترجمہ، مولانا قاضی سجاد حسین، حامد اینڈ کمپنی، لاہور
11 دیوان حافظ، حافظ شیرازی، ترجمہ، مولانا قاضی سجاد حسین، پروگریسیو بکس، لاہور

Dr. Atiqur Rahman
Assistant Prof. of Persian
Dept. of Arabic,Persian,Urdu&Islamic Studies,Bhasha-Bhavana,
Visva-Bharati,
Santiniketan - 731235 (WB)
Mob.No.:09635193411,08250056711
Email: atiqura@044gmail.com

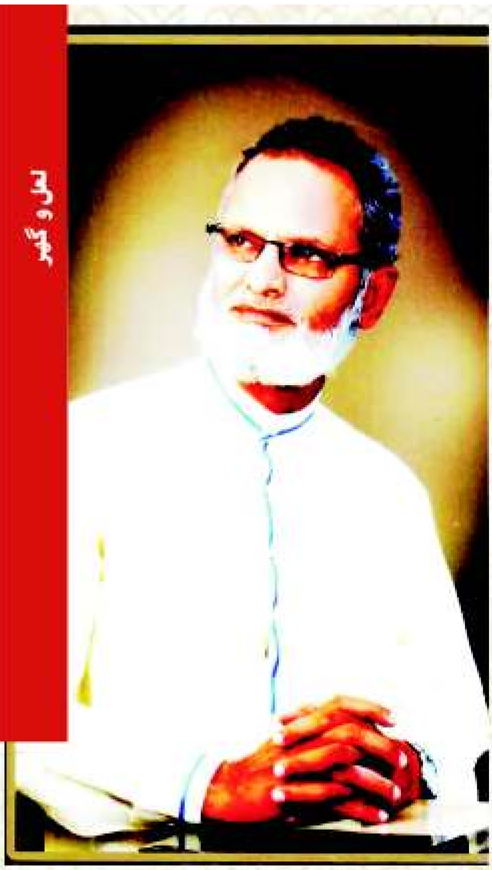

فنکارانہ تخلیقی اظہار کا شاعر
تسنیم انصاری

اسرار اللہ انصاری

تسنیم انصاری کا نام دنیائے ادب میں بہت زیادہ جانا پہچانا نہ سہی، نا ہی وہ مشاعروں کے پروفیشنل شاعر رہے ہیں، اور نہ رسائل وجرائد میں خاطر خواہ اپنا کلام شائع کروایا، یہی سبب ہے کہ اردو کے وسیع منظرنامے تک ان کی آواز نہ پہنچ سکی۔ لہٰذا ناقدین ادب کے جائزوں سے ان کا کلام محروم رہا، اور اپنے معیار شاعری کے اعتبار سے جو شہرت ومقبولیت انھیں حاصل ہونا چاہیے تھی، نہیں ہوئی، علاقائی سطح کے مشاعروں، ادبی نشستوں اور محفلوں میں اپنی بساط بھر شرکت ضرور کی، اپنے اسی محدود حلقے میں انھیں مقبولیت حاصل رہی۔

آپ کا نام امانت حسین اور تخلص تسنیم ہے۔ 28/مارچ 1957 کو برہان پور میں ولادت ہوئی۔ والد کامریڈ حبیب اللہ شاعر وادیب نہ تھے، بلکہ سیاسی وسماجی سرگرمیوں سے دلچسپی رکھتے تھے۔ خاندانی پیشہ پارچہ بافی تھا، والدہ بھی ہتھ کرگھے پر کام کرکے محنت مزدوری کرتیں اور گھریلو اخراجات میں ہاتھ بٹاتیں۔ دادی سکینہ بی ایک نیک سیرت خاتون تھیں، انھوں نے تسنیم انصاری کی تعلیم وتربیت پر بطور خاص توجہ دی۔ تسنیم انصاری کے خاندان میں ان کے تایا عبداللطیف سیفی راشدی زود گو شاعر تھے جو استاد الاساتذہ علامہ مطیع اللہ راشد سے شرفِ تلمذ رکھتے تھے۔ اسی طرح سیفی راشدی کے فرزند قیس برہان پوری بھی شاعری کرتے تھے۔ ان کی صحبتوں کا اثر یہ ہوا کہ تسنیم انصاری کو بچپن سے ہی علم وادب اور شعروشاعری کا شوق پیدا ہوگیا۔ شہر کے ادبی ماحول نے بھی ان کے ذوق ادب کو پروان چڑھانے میں جلا بخشی۔ ایک اور قابلِ ذکر بات یہ ہے کہ برہان پور میں اپنے ماضی کی طرح اس دور میں بھی شعروادب کا ماحول گرم تھا۔ متعدد ادبی انجمنیں اور شاعری کے گروہ خاص خاص موقعوں پر شعری وادبی نشستیں اور طرحی مشاعرے منعقد کیا کرتے، نیز بڑے اور کل ہند مشاعرے بھی کثرت سے منعقد ہوتے تھے۔ ان مشاعروں اور ادبی تقریبوں میں اردو ادب کی اہم ترین شخصیتوں نے شرکت کی ہیں، مثلاً مجروح سلطان پوری، خمار بارہ بنکوی، کرشن بہاری نور، بیکل اتساہی، وغیرہ جیسے متعدد بڑے اور چوٹی کے شعرا وادبا کے نام پیش کیے جاتے ہیں۔ ان کامیاب ترین مشاعروں اور تقریبوں کا انعقاد شہر برہان پور کے استاد شعرا اور ادب نواز حضرات کیا کرتے تھے جن میں تسنیم انصاری جیسے متعدد نوجوان اور مبتدی جوش و خروش کے ساتھ شرکت کرتے اور فنِ شاعری کے رموز حاصل کرنے کے ساتھ ساتھ اساتذہ کی خدمت میں مصروف رہتے۔ اس دور میں برہان پور کے شعری ماحول میں جو اساتذۂ فن شاعری کے افق پر اپنی تابانی بکھیر رہے تھے، اپنی شاعری سے عوام کو متاثر کر رہے تھے اور برہان پور کا نام دور ونزدیک روشن کر رہے تھے اُن کی فہرست طویل ہے محض چند ناموں پر اکتفا کیا جائے تو ان اساتذہ میں حشمت اللہ ریاضی، برکات احمد غالب ہاشمی، حمید اللہ خلیق، شفق راشدی، آزاد امیدی، غلام حسین شمیم اشرفی اور فاضل انصاری وغیرہ کے نام بطور خاص پیش کیے جاسکتے ہیں۔

مذکورہ ادبی فضا کا اثر تسنیم انصاری کی شخصیت پر پڑنا لازمی تھا اسی ماحول سے کسبِ فیض کرتے ہوئے انھوں نے اپنی ہائی اسکول کی تعلیم کے دوران ہی بیت بازی کے ایک مقابلے سے شعر کہنے کا آغاز کیا، جب شاعری کی طرف چل نکلے تو خادم اشرفی سے مشورۂ سخن کرنے لگے۔ استاد خادم اشرفی برہان پوری نے جلد ہی اپنے استاد شمیم اشرفی سے شرفِ تلمذ حاصل کرنے کے لیے تسنیم انصاری کو مشورہ دیا۔ لہٰذا تسنیم انصاری باقاعدہ شمیم اشرفی کے حلقۂ تلامذہ میں شامل ہوگئے، اور انہیں سے اپنے کلام پر اصلاح لینے لگے۔ اس طرح تسنیم انصاری سلسلۂ ناسخ سے وابستہ ہوئے، یعنی یہ شعری سلسلہ شمیم اشرفی کے توسط سے اردو کے اہم ادبی اسکول دبستان لکھنؤ کے بنیاد گزار شاعر شیخ امام بخش ناسخ سے ملتا ہے۔

اسی زمانے میں بزمِ سخن، برہان پور کے تحت شعری وادبی تقریبات منعقد ہوا کرتی تھیں جس میں دیگر دوستوں اور شعرا کے ہمراہ تسنیم انصاری بڑھ چڑھ کر حصہ لیتے۔ اس بزم کے تحت تربیت یافتہ شعرا میں بشمول تسنیم انصاری کے لطیف شاہد، کلام آذر، شوکت انصاری، مجاز آشنا، شمشیر انجم، ہمسر اندوری، ہارون ایاز قادری، نعیم اختر، نادم اشرفی، جبار سحر، کوثر شمیمی اور ولی شمیمی وغیرہ کے نام اہم ہیں۔ اس وقت تسنیم انصاری کے ہمراہ دوستوں کا جو حلقہ شعروادب میں داخل ہوا تھا ان میں سے چند ایک تسنیم انصاری کی طرح ہی عہد حاضر میں علاقہ برہان پور کے استادانِ فن کی حیثیت سے سرگرم عمل ہیں، مثلاً منفرد لب ولہجہ کے شاعر کلام آذر جو چند برسوں قبل اللہ کو پیارے ہوگئے۔ دیگر شعرا میں لطیف شاہد، شوکت انصاری، نعیم خادمی اور مجاز آشنا وغیرہ اپنی شاعری کے جوہر بکھیرنے کے ساتھ ساتھ نوجوان شعرا اور ادبی محفلوں کی سرپرستی فرما رہے ہیں۔ دوستوں کے اس حلقے نے تسنیم انصاری کے تقریباً ساتھ ہی اپنے شعری سفر کا آغاز کیا۔

ایسے باذوق دوستوں اور شاعروں کی صحبتوں کے ساتھ ہی اساتذہ کی رہنمائی میں تسنیم انصاری کی شاعری نکھرتی اور پروان چڑھتی گئی۔ شعروادب کی باریکیوں کو سمجھنے اور سیکھنے کے ساتھ ساتھ تسنیم انصاری نے عصری تعلیم سے وابستگی قائم رکھی، شہر کے معروف تعلیمی ادارے سیوا سدن کالج سے امتیاز کے ساتھ اردو میں ایم۔اے۔ اور اس کے بعد بی۔ایڈ۔ کی ڈگری حاصل کی۔ اپنی معاشی صورت حال کو بہتر بنانے کے لیے حصول ملازمت کے لیے کوششیں بھی برابر کرتے رہے، لہٰذا قسمت نے یاوری کی اور 1981 میں اسکول میں مدرس کی حیثیت سے آپ کا تقرر قصبہ راجے واڑی، کوکن میں ہوگیا، بعدازاں وہیں مستقل سکونت اختیار کرلی۔ کوکن میں رہتے ہوئے بھی تسنیم انصاری شعروادب کی خدمت میں مصروف رہے،

یہاں انھیں کئی ایسے ادب نواز دوستوں اور ساتھیوں کی صحبت میسر آئی جو مختلف علاقوں سے تعلق رکھتے تھے اور ادبی ذوق وشوق سے سرشار تھے، یہ سب لوگ پہلے سے ہی اردو زبان و ادب کی خدمت میں سرگرداں تھے اور علاقہ کوکن میں ادبی سرگرمیوں کا سلسلہ قائم کیے ہوئے تھے۔ ان میں ڈاکٹر رشید آثار، نوگل بھارتی، عبدالمجید شاغل، نظام الدین سعد، نوشاد اعظمی، ظہیر راشد، کامل وہوروی، وفا راجے واڑی، تاج الدین تاج، اگلن عباسی، فیض توڑیلوی وغیرہ کے اسمائے گرامی اہم ہیں۔

تسنیم انصاری بزم فروغ ادب کوکن سے منسلک ہوئے اور آگے چل کر کئی برسوں تک اس بزم کے صدر کی حیثیت سے نمایاں رول ادا کیا۔ اسی بزم کے تحت 'تذکرہ شعرائے کوکن' کی اشاعت عمل میں آئی، جسے ادبی حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھا گیا۔ یہاں سے نکلنے والے ہفت روزہ اردو اخبار 'کوکن کی آواز' کے آپ چیف ایڈوائزر بنائے گئے، ساتھ ہی کوکن اردو لائبریری اینڈ ریسرچ سینٹر کے سرگرم بانی رکن کی حیثیت سے اپنی ذمے داریاں بحسن وخوبی انجام دیں بعدازاں تشنگان علم وادب، طلبا اور ریسرچ اسکالروں کا بھرپور تعاون کیا۔ اس کے علاوہ Q8 کرکٹ کلب کے تحت کے پی ایل انڈر 16 کرکٹ لیگ کے مینیجر بھی رہے۔

منکسر مزاجی تسنیم انصاری کی شخصیت میں بدرجۂ اتم موجود تھی۔ غالباً اسی انکسار کے سبب انہوں نے اخبارات ورسائل میں اپنے کلام کی اشاعت سے بے اعتنائی برتی، برسوں قبل محترم ندیم صدیقی کی سعی سے روزنامہ انقلاب بمبئی میں چند شعری تخلیقات شائع ہوئیں، پھر کئی برسوں کے بعد گذشتہ ایک دو ہی برسوں میں مغربی بنگال اردو اکادمی کا ادبی جریدہ سہ ماہی روح ادب اور عہدِ حاضر کی معروف ادبی شخصیت ابوالکلام قاسمی کی ادارت میں نکلنے والے گراں مایہ سہ ماہی امروز علی گڑھ میں چند غزلوں کی اشاعت عمل میں آئی۔ اسی منکسر مزاجی کے باعث تسنیم انصاری نے اپنے کلام کو محفوظ کرنے کی طرف بھی کم ہی توجہ دی، اور خاصا کلام منتشر رہا، جس کا اعتراف انھوں نے اپنی تحریر میں کیا ہے۔ شاگرد ابوشاہد کی سعی پیہم سے جو شعری تخلیقات یکجا ہوئیں تھیں وہ ایک شعری مجموعہ 'اظہار' کی شکل میں 2010 میں زیور طبع سے آراستہ ہوا۔

تسنیم انصاری نام ونمود اور شہرت کی طلب سے دور اپنے فرضِ منصبی اور خدمتِ شعروادب میں منہمک رہنے والے شخص تھے، انہوں نے اپنے حلقے میں علم و ادب کی معروف شخصیت کے طور پر اپنی شناخت قائم کی۔ تعلیم وتعلم اور مطالعہ ومشاہدہ سے ہمیشہ وابستگی رکھی۔ اپنی صلاحیت اور قابلیت سے شاعری کو حتی الامکان فیض پہنچایا۔ الفاظ کو برتنے اور تلفظ کی ادائیگی سے بھی آپ خوب واقفیت رکھتے تھے۔ استادانہ مرتبے کو ملحوظ خاطر رکھتے ہوئے شاگردوں اور مبتدیوں کی اغلاط اور لغزشوں پر کھلے دل سے اصلاح دینے اور مشورے سے نوازنے میں ہمیشہ پیش پیش رہتے، جو اُن کی کشادہ قلبی، فراخ دلی، خوداعتمادی اور زبان دانی کی دلیل ہے۔ اس کے پس پشت موصوف کی طویل مشق سخن اور ابتدائے عمر سے ہی اساتذہ کی محفلوں میں اٹھنے بیٹھنے کے تجربے کی کارفرمائی دکھائی دیتی ہے۔ تسنیم انصاری تخلیقی رویے کو پروان چڑھانے اور شعر میں حسن وتازگی پیدا کرنے کے تعلق اپنا ایک واضح نظریہ رکھتے تھے جسے وہ حتی الامکان اپنی شاعری میں ملحوظ خاطر رکھنے کے ساتھ ساتھ عام گفتگو میں بھی اس کا اظہار کرتے اور اپنے شاگردوں کی اصلاح کرتے ہوئے انھیں بھی اس وصف کی اہمیت کے پیش نظر اس کی طرف راغب کرتے اور اپنی تخلیقات میں اسے استعمال کرنے کی ترغیب دیتے۔ شاگرد ابوشاہد کی ایک غزل پر اصلاح دیتے ہوئے تسنیم انصاری نے جو مشورہ دیا اس سے موصوف کے طرزِ اصلاح کا بھی پتہ چلتا ہے، ملاحظہ کیجیے۔

کہنے لگے شاہد!... شعر تو مکمل ہے مگر تمام لفظ عریاں ہیں۔ اس لیے شعر میں سمجھنے بوجھنے کا کوئی محل ہی نہیں!... شعر میں کوئی تو کلیدی لفظ ایسا ہو جو کچھ دیر تک اپنے پاس ٹھہرائے رکھے، اور غور وفکر پر مائل کرے، تمھیں جاننا چاہیے کہ ''برہنہ حرف نہ گفتن کمال گویائی ست۔''

(ابو شاہد، تسنیم انصاری الفاظ و مفاہیم کے مابین، مشمولہ مجموعہ کلام اظہار، 2010، ص 25)

تسنیم انصاری کے نظریۂ شعر کی یہ ایک مثال محض ہے۔ ان کے اس خیال کے پیش نظر ہم ان کی شاعری کا مطالعہ کریں تو ہمیں پتہ چلتا ہے کہ خود انہوں نے اپنی غزلوں اور اشعار میں الفاظ کو اپنے بیان کردہ خیال کے مطابق استعمال کرنے میں کمال ہنرمندی کا ثبوت فراہم کیا ہے۔ ان کے یہاں متعدد اشعار ایسے ہیں جن میں محض ایک لفظ بھی قاری کو اپنے پاس لمبے وقت تک نہ صرف ٹھہرائے رکھتا ہے، بلکہ اپنے طلسم میں غوطہ زن رکھنے کے ساتھ ساتھ غور وفکر کی دعوت اور الفاظ کے بعض نئے مفاہیم سے روشناس کراتا ہے۔

تسنیم انصاری جس طرح درس وتدریس سے وابستہ رہے اسی طرح شعروادب میں بھی انہوں نے استادی کے مرتبے کو وقار بخشا۔ ان کی شاعری کو دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ استادانہ کلام جلد کہنے لگے تھے۔ زبان و بیان پر شروع ہی سے گرفت مضبوط تھی۔ طرز ادا اور اشعار میں پختگی کا وہ مرحلہ جسے بعض شعرا ایک عمر کھپانے کے بعد طے کر پاتے ہیں یہ منزل تسنیم انصاری نے جلد عبور کر لی تھی۔ اس کے پیچھے اُن کی اُسی محنت شاقہ کا دخل ہے جس کی دُھن انہیں ابتدائے عمر سے ہی لگ چکی تھی۔

تسنیم انصاری نے نظمیں بھی کہیں، حمد ونعت اور سلام بھی۔ لیکن ان کا قابل قدر سرمایۂ سخن بطورِ خاص غزل پر مشتمل ہے، ایسا اس لیے کہا گیا کیوں کہ ان کا خاص جوہر اسی صنف میں زیادہ کھل کر سامنے آتا ہے۔ حیاتِ انسانی، مناظرِ فطرت اور مظاہر قدرت کے پُروسیع مطالعے اور گہرے مشاہدے کا ثبوت ہمیں تسنیم انصاری کے کلام میں نظر آتا ہے۔ نئے مضامین کی تلاش اور پرانے مضامین میں سے نئے نکات کے اظہار میں بھی وہ اپنی انفرادیت کا ثبوت دیتے ہیں۔

بے شمار مظاہرِ فطرت ہیں جسے ہماری آنکھیں آئے دن دیکھا کرتی ہیں، لیکن اسے لفظوں کا پیکر عطا کرنا ہمارے لیے ممکن نہیں، حیات و کائنات سے متعلق متعدد امور و وقائع ہمارے آس پاس بکھرے رہتے ہیں، یا، روزانہ ہی رونما ہوتے رہتے ہیں، لیکن ان تمام کو اس قدر حقیقت سے قریب اور گہرائی سے، برمحل و برجستہ اندازِ بیان میں رقم کرنے کی صلاحیت کم شعرا کے یہاں پائی جاتی ہے۔ یہ کارنامہ تسنیم انصاری نے اپنی شاعری میں قدم قدم پر سرانجام دیا ہے، مثلاً

وحشت کا معیار بدلتا رہتا ہے
دیوانہ دیوار بدلتا رہتا ہے
ہر موسم کی بیعت اس پر لازم ہے
مٹی کا کردار بدلتا رہتا ہے

اشیا کے مختلف خواص، اہمیت اور نوعیت کے پیش نظر اُن کی قدر وقیمت اور حرکات کا نقشہ ہمیں یہاں دیکھنے کو ملتا ہے۔ اسی طرح مظاہر کی دلچسپ اور موزوں شکلوں اور اُن سے متعلق روداد کا سہارا لے کر شاعر تسنیم انصاری نے اپنی شاعری کی بنت کی ہے۔ جامد و بے جان اشیا کو پیکر عطا کر کے تصویریں ابھاری گئی ہیں، پھر مختلف تصویروں سے جو منظر تشکیل پاتا ہے اس کو کسی واقعہ اور قصہ سے جوڑ کر شاعر نے اپنا خیال پیش کیا۔ ایسی پیکر تراشی کی بعض دلکش مثالیں تسنیم انصاری کے یہاں ہمیں دیکھنے کو ملتی ہیں۔ موسم کی تبدیلیوں سے مٹی پر کیا اثرات مرتسم ہوتے ہیں یا مٹی کس طرح موسم کے تغیرات کو قبول کرتی ہے اور اپنے اندر مثبت تبدیلیاں پیدا کرتی ہے، یہ غالباً فطری تغیرات کے مثبت اور تعمیری پہلو کی طرف اشارہ ہے، یہاں عظیم تر کے سامنے قلیل تر کی فرمانروائی کا سبق بھی ملاحظہ کیا جاسکتا ہے۔ تسنیم انصاری کے یہاں متعدد اشعار ایسے نکلیں گے جنھیں سن کر یا پڑھ کر ہمارا ذہن فوراً متاثر

ہوتا ہے۔ ہماری حس برجستہ اثر قبول کرتی ہے، اور ہم دل سے کہہ اٹھتے ہیں کہ اس مضمون پر اس سے بہتر طور پر ادائیگی شاید مشکل ہے۔ ہر لحظہ بدلتی ہوئی حیات اور تغیر پذیر کائنات پر دیکھیے کس فنکارانہ بصیرت سے شعر میں تبصرہ کیا گیا ہے۔ بالکل اچھوتا اور منفرد انداز ہے۔

اس کے ماہ و سال کی پیمائش کیا ہو
وہ اپنی رفتار بدلتا رہتا ہے
ہر نیا پل ترے چہرے کو بدل دیتا ہے
زندگی میں تری تصویر بنانے سے رہا

حقائق، واقعات و علائم اور امور کی تصویریں اتارنا فن کار کا شغل رہا ہے، وہ اگر چہ ایک لمحے پر ہی مشتمل کیوں نہ ہو، گزرتے ہوئے پل اور ماہ و سال کا عکس اتارنے کے لیے تسنیم انصاری بھی ہمیں کوشاں دکھائی دیتے ہیں، لیکن حیات و کائنات کوئی جامد شے تو نہیں کہ ایک مقام پر ٹھہرے رہے۔ یہ بات انہیں حیرت و استعجاب میں ڈالتی ہیں اور وہ محسوس کرتے ہیں کہ ہر پل تبدیل ہوتے ہوئے منظر کو گرفت میں لینا محال عبث ہے۔

موصوف کی شاعری علامتی شاعری نہیں، لیکن بعض الفاظ و حرکیات ان کے یہاں ایسی علامتوں کے طور پر نظر آتے ہیں جن میں پہلے پہل ابہام کا گمان ہوتا ہے، لیکن ذرا سا غور و فکر سے کام لیا جائے تو پتہ چلتا ہے کہ ان اشعار میں مفاہیم کی وسعت اور تہہ داری کا بحر بیکراں ہے جو ہمارے ذہن کے نہاں خانوں میں ارتعاش پیدا کیے بغیر نہیں رہتا، ان اشعار میں یہ اچھوتا پن دیکھتے ہی بنتا ہے۔ تسنیم انصاری اپنی شاعری کی ابتدا میں ہی ایسے اشعار کہنے لگے تھے۔

شور کرے ہے اب تو مٹی کی بلبل
کاغذ کا ہر پھول مہکتا جائے ہے

ایک وہ بھی سچائی تھی کہ 'خوش بو آ نہیں سکتی کبھی کاغذ کے پھولوں سے'، اور ایک یہ بھی حقیقت ہے کہ جس نے شعر کا جامہ پہنا ہے۔ عہد نو میں مادیت پرستی اور طرز حیات میں مصنوعی رنگ کے عکس کا پرتو اس شعر میں بخوبی دیکھا جاسکتا ہے۔ ایسے متعدد اشعار کو دیکھتے ہوئے رفعت سروش نے تسنیم انصاری کی شاعری میں تجریدی آرٹ کی بات کہی ہے، وہ رقم طراز ہیں:

''زندگی کے تصنع کو تسنیم نے عجیب انداز سے شعر کے پیکر میں ڈھالا ہے، عام طور پر ہماری شاعری میں کاغذی پھولوں کا ذکر ملتا ہے مگر تسنیم کے یہاں یہ لفظ پھول کی عاشق بلبل کے ساتھ کچھ اس طرح نظم ہوا ہے کہ تجریدی آرٹ کی بات یاد آ گئی ہے۔''

(رفعت سروش تسنیم انصاری کی غزل شمولہ مجموعہ کلام اظہار، 2010، ص 15)

بعض مقبول اشعار ہیں جن کی ہم مکمل تشریح کرنے سے قاصر ہیں، انھیں چند نثری جملوں میں واضح کرنا ممکن نہیں، حقیقت یہ کہ ان اشعار کو پڑھ کر محظوظ ہی ہوا جاسکتا ہے۔

متعدد مقام پر لفظوں کے رکھ رکھاؤ اور بامعنی الفاظ کے استعمال سے اشعار میں ایسی برجستگی پیدا ہوگئی ہے جو سیدھے قاری کے دل پر اثر کرتی ہے اور فکر کو تازگی عطا کرنے کے ساتھ ذہن کے نہاں خانوں کو منور کردیتی ہے، اور بے ساختہ ہمارے دل سے واہ نکل جاتی ہے۔ الفاظ کے دروبست، زبان کی پختگی اور نادر ردیف و قوافی سے اشعار میں انفرادیت اور حسن پیدا ہوگیا ہے۔

تنہائی کے کرب سے جشن عشرت تک
وقت صلیب و دار بدلتا رہتا ہے
تھا بڑا بد ذوق میرا رقص بھی دیکھا نہیں
ہو گیا رخصت مجھے زنجیر پہنانے کے بعد

قبائلی نظام میں مسند نشینی کا معاملہ ہو، بادشاہت و آمریت میں حصول اقتدار و رسوخ کی بات ہو، جمہور و مقہور نظام سلطنت میں منصب نوازی ہو یا علاقائی و برادری کی سطح پر انتخاب و نمائندگی کا واقعہ ہو، اس سفاکانہ و غیر منصفانہ طرز عمل سے شاید ہی کسی کو انکار ہو جس حقیقت کی طرف ان اشعار میں اشارہ کیا گیا ہے۔

آج تک ایک بھی گردن نہیں ماری تو نے
یہ قبیلہ تجھے سردار بنانے سے رہا
آپ انصاف کے قائل ہیں نہ سچائی کے
آئیے آپ کو سردار بنا دیتے ہیں

جہاں تسنیم انصاری اس قسم کے جرات مندانہ و حوصلہ مند خیالات کو اشعار کا جامہ پہناتے ہیں وہیں انہیں وقار آدمیت کا بھی احساس ہے۔ احترام انسانیت کا تقاضہ ہے نااہل کے سامنے سر تسلیم خم کی نوبت سے محفوظ رہنے کے لیے ان کی خدمت گزاری سے ہی دور رہا جائے۔ اسی حمیت انسانی کا فرض یہ ہے کہ اپنے خاندانی وقار کو بچانے کی خاطر جفا کاروں کے سامنے سر دے دیا جائے، لیکن ان کے دست نگر نہ ہوا جائے۔ وہ اپنی خودداری و وضع داری کا اظہار کرنے سے نہیں چوکتے۔

مرے خدا مجھے سر بیچنا نہیں آتا
امیر شہر کا خدمت گزار مت کرنا
دے دیا سر، نہ دیا دستِ جفا کو بوسہ
جدِ امجد تری میراث بچالی میں نے

تسنیم انصاری نے اپنی شاعری میں منفرد فنکارانہ تخلیقی اظہار کا ثبوت فراہم کیا ہے، جس میں آفاقیت بھی ہے۔ اس دور قحط الرجال میں ان کا رخصت ہوجانا شعر و ادب کے لیے خسارے کا باعث ہے، اگر وہ اور جیتے تو لازمی طور پر اردو شاعری کے دامن میں مزید قابل قدر اشعار کا اضافہ ہوتا۔ اردو ادب میں زبان زد اور ضرب المثل اشعار کی جو فہرست مرتب ہوگی اس میں تسنیم انصاری کے اشعار یقیناً جگہ پائیں گے۔ چند قابل ذکر اشعار ملاحظہ کریں۔

اپنے آنچل کے لیے اس نے ستارے مانگے
آسماں دور نہ تھا شرط لگالی میں نے
کون سمجھائے کہ اب ضد پہ اڑی ہے دنیا
خودکشی کے لیے تیار کھڑی ہے دنیا
رہ گئے اپنے بزرگوں کی نشانی بن کر
ہم ضعیفوں سے نہ دیوار کے جالے اترے
وہ بولتا رہا بادِ صبا کے لہجے میں
نہال ہوتی رہیں پتیاں سماعت کی
آج بھی اپنے گھروں میں ہے وہ شاہانہ روش
باپ جب بوڑھا ہوا بیٹا بغاوت کر گیا
ہمیں تو موت بھی اک تمکنت کے ساتھ آئی
یہ سانحہ بھی بڑے کروفر سے گزرا ہے
پہلے وہ مجھے شمع سا جلنے کو کہے گا
پھر تیز ہواؤں میں نکلنے کو کہے گا
مجھے خوابوں کی مسماری پہ یوں رونا نہیں آتا
کہ بچپن میں بھی میرا ہر کھلونا ٹوٹ جاتا تھا
میرا سر کاٹ لیا تم نے کوئی بات نہیں
اب یہ فانوس کسی راہ گزر پر رکھ دو
جہاں زمیں ہے وہاں آسمان بھی ہوگا
میں اس نگاہ سے دنیا کو دیکھتا ہی نہیں

■

Dr. Asrarullah Ansari
924, Maulwi Faizullah Marg, Hareerpura
Burhanpur - 450331 (MP)
Mob.:9753210869
Email.: asrar1607@gmail.com

شہلا پروین

سید محمد نسیم انہونوی

حیات و خدمات

سید محمد نسیم انہونوی اردو ادب میں کثیر الجہات شخصیت کے مالک ہیں۔ وہ صرف ناول نگار ہی نہیں ہیں بلکہ افسانہ نگار، مقالہ نگار اور عظیم صحافی ہونے کے ساتھ ساتھ اعلیٰ درجے کے پبلشر بھی تھے۔ انھیں نام و نمود کی خواہش نہیں تھی اور نہ ہی اس کے لیے انھوں نے خوشامدانہ لہجہ اختیار کیا۔ سچ کو سچ کہنا اپنا اولین فرض سمجھا۔ وہ اپنی تخلیق میں ان پہلوؤں کو اہمیت دیتے ہیں جس کا کوئی خاص مقصد ہو، کیوں کہ نصب العین کے بغیر کوئی بھی تخلیق کامیابی کی منزل تک نہیں پہنچ سکتی۔ ان کی نظر میں خالص ادب وہی ہے جو سماج اور معاشرے کا آئینہ دار ہو۔ وہ مشرقی اقدار کے حامی اور قدیم تہذیبی روایات کے پرستار تھے۔ لہٰذا ان کے ناولوں اور افسانوں کی اثر انگیز تحریریں، جملوں کی برجستگی، انداز بیان کی شگفتگی اور ندرت خیال ان کی شخصیت کے آئینہ دار ہیں۔

سید محمد نسیم انہونوی 1904 میں انہونہ میں پیدا ہوئے۔ انہونہ لکھنؤ سے تقریباً چالیس میل کی دوری پر واقع رائے بریلی کا ایک چھوٹا سا قصبہ ہے۔ نسیم انہونوی کے والد کا نام سید حشمت علی تھا۔ جو نہایت سادہ مزاج اور پاکیزہ طبیعت کے مالک تھے۔ ان کے خاندان میں پیری و مریدی کا سلسلہ قائم تھا۔ ان کا قصبہ تعلیمی و معاشی اعتبار سے زوال پذیر تھا۔ وہاں کے لوگ مفلسی اور غربت کی زندگی گزارنے پر مجبور تھے۔ تعلیم و تعلم کا معقول انتظام نہیں تھا۔ لہٰذا حشمت علی انہونہ سے ہجرت کر کے لکھنؤ آ گئے اور محلہ بشیرت گنج میں سکونت اختیار کر لی اور وہیں کے ایک مقامی اسکول میں درس و تدریس کے پیشے سے جڑ گئے۔

نسیم انہونوی کا خاندان بہت مہذب تھا، علم زہد اور تقویٰ ان کے گھرانے کی شان امتیاز تھی جس سے وہ فطری طور پر متاثر ہوئے۔ قرآن اور مذہبی تعلیم کی ابتدا گھر سے ہوئی انھوں نے اپنی ذہانت اور قابلیت کی بنا پر آٹھ سال کی عمر میں قرآن پاک کا ناظرہ مکمل کر لیا۔ 1915 میں ان کا داخلہ 'رام گنج پرائمری اسکول' میں کرا دیا گیا۔ یہاں کچھ عرصہ تعلیم حاصل کرنے کے بعد 'مولوی گنج پرائمری اسکول' میں داخلہ کرا دیا گیا۔ انھوں نے اسی اسکول سے بورڈ کا امتحان امتیازی نمبروں سے پاس کیا لیکن والد کی آمدنی قلیل ہونے اور کچھ معاشی مجبوریوں کے تحت ان کا تعلیمی سلسلہ منقطع ہو گیا۔

نسیم انہونوی کو بچپن سے ہی مطالعے کا بہت شوق تھا اور کم عمر میں ہی کہانیاں لکھنی شروع کر دی تھیں۔ اس وقت لکھنؤ میں ایک اسلامی تنظیم 'انجمن اسلامیہ ایک آنہ فنڈ' کی جانب سے ماہانہ رسالہ 'انکشاف' شائع ہوتا تھا۔ اس رسالے میں ان کی کئی کہانیاں چھپیں اور ادب میں ان کی پہچان بنی۔ ایک دن نسیم انہونوی اپنی کسی کہانی کی اشاعت کے سلسلے میں انکشاف کے دفتر پہنچے تو، اس رسالے کے ذمے داروں نے ان کی علمی لیاقت سے متاثر ہو کر ان کے سامنے ایڈیٹر شپ کی پیشکش کی جسے انھوں نے بہ سرو چشم قبول کر لیا۔ یہ سنہرا موقع ان کے مستقبل کو سنوارنے میں معاون ثابت ہوا۔ جس سے ان کی ایڈیٹر، پبلشر، صحافی، مصنف اور ناول نگار جیسی پوشیدہ صلاحیتوں کا لوگوں سے تعارف ہوا۔ نسیم انہونوی پورے حوصلے اور ایمانداری کے ساتھ میگزین کی ترتیب و تدوین میں مشغول ہو گئے۔ مالی وسائل کی کمی کی وجہ سے کلرک، ایڈیٹر اور منیجر تینوں کی ذمے داری خود ہی انجام دیتے تھے۔ جو ان کی ادبی لگن اور علم پروری کی جیتی جاگتی مثال ہے۔

نسیم انہونوی ایڈیٹر شپ کے عہدے پر فائز ہونے کے بعد دیگر شعرا، ادبا اور فکشن نگاروں سے متعارف ہوئے۔ ان میں شوکت تھانوی، امین سلونوی اور نیاز فتح پوری کے نام خاص طور سے لیے جا سکتے ہیں۔ شوکت تھانوی ان کی پوشیدہ صلاحیتوں سے بہت متاثر ہوئے۔ اس وقت لکھنؤ میں ایک ادبی حلقہ بن گیا تھا جو اپنے آپ میں ممتاز تھا۔ یہ ادبی حلقہ 'تثلیث' کے نام سے جانا جاتا تھا۔ اس میں تین احباب نسیم انہونوی، امین سلونوی اور شوکت تھانوی شامل تھے۔ یہ تینوں احباب 'باپ بیٹے' اور 'روح القدس' کے نام سے جانے جاتے تھے۔

نسیم انہونوی نے 'انکشاف' کی ادارت کے دوران اس کا 'ظریف نمبر' بھی شائع کیا۔ جس سے ان کی شہرت اور مقبولیت میں مزید اضافہ ہو گیا، لیکن یہ سلسلہ زیادہ دنوں تک قائم نہیں رہا اور چند غیر معمولی وجوہات کی بنا پر یہ رسالہ ہمیشہ کے لیے بند کر دیا گیا۔ اگرچہ ان کی یہ صحافتی خدمات بہت مختصر رہی، لیکن اس دوران انھیں ادبی حلقوں میں شہرت و مقبولیت حاصل ہوئی اور ایڈیٹنگ، پبلشنگ کے تمام تجربات حاصل ہو گئے۔ انکشاف کا بند ہونا اردو ادب کے لیے خسارہ تھا اور اس سے نسیم انہونوی کو بہت افسوس ہوا۔ انھوں نے اپنے اس غم کو دور کرنے کے لیے خود ایک رسالہ نکالنے کا منصوبہ بنایا۔ انکشاف کی ایڈیٹری کے دوران کی ذہنی فضا کے تانے بانے میں مذہبی رنگ حاوی ہو گیا تھا۔ دوسری طرف مغربی تہذیب اور جدید تعلیم کی بدولت نوجوان طبقے کا رجحان فیشن پرستی اور بے حجابی کی طرف تیزی سے بڑھ رہا تھا۔ مہذب گھرانے کی پردہ نشین خواتین بھی اس سے متاثر ہو رہی تھیں۔ چونکہ نسیم انہونوی مغربیت کے سخت مخالف اور مشرقیت کے زبردست حامی تھے اور مذہبی ماحول کے پروردہ تھے۔ لہٰذا ماحول اور فطرت نے سونے پر سہاگے کا کام کیا۔ جنوری 1931 میں اپنے ذاتی ادارہ 'نسیم بک ڈپو، لکھنؤ' سے خواتین کی اصلاح کے لیے ماہانہ رسالہ 'حریم' جاری کیا۔ اس کا پہلا شمارہ منظر عام پر آیا تو خوب پذیرائی ہوئی۔ عام طور پر خواتین طبقے میں اس وقت کا سب سے زیادہ پسندیدہ رسالہ ثابت ہوا کیونکہ اس میں ان کی تفریح کے تمام لوازمات موجود تھے۔

رسالہ حریم کا اداریہ نسیم انہونوی خود 'لمعات' کے عنوان سے لکھا کرتے تھے۔ جس میں اس وقت کے علمی

وادبی ماحول،عورتوں کی گھریلو زندگی،ان کی تعلیم وتربیت اور عصرحاضر سے متعلق باتیں ہوتی تھیں۔نسیم انہونوی نے اس کے ذریعے طبقۂ نسواں کی اصلاح کا بیڑا اٹھایا اوراس کے ساتھ ہی اہم بنیادی مسائل اور حالات حاضرہ پربھی قلم اٹھایا،تنقیدی و اصلاحی پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی۔وہ مشرقی تہذیب وتمدن کے امین تھے اور اس رسالے کے ذریعے انھیں اقدار کو محفوظ رکھنے کی ذمے داری نبھائی۔وہ بلاجھجک اپنے عہداور حالات سے پردہ اٹھاتے ہیں اور حریم کی اشاعت کا اصل مقصد بھی مشرقی تہذیب کی حمایت ہے۔انھوں نے جہاں ایک طرف تعلیم نسواں کی ضرورت کو محسوس کیا وہیں دوسری طرف قوم کی خواتین کو مغربی طرز زندگی اوراس کے نقائص سے محفوظ رکھنے کی تلقین کی ہے۔ان کا مقصد عورتوں کو علوم جدید سے دور رکھنا نہیں تھا بلکہ مشرقیت کے دائرے میں رہ کر جدیدیت کو قبول کرنا تھا۔

نسیم انہونوی نے دوسرا رسالہ'سرپنچ' کے نام سے اکتوبر 1931 میں جاری کیا۔یہ ہفتہ وار مزاحیہ رسالہ تھا۔اس کی ادارت کی ذمے داری انھوں نے شوکت تھانوی کے سپرد کردی۔سرپنچ کا پہلا شمارہ شائع ہوا تو ادبی حلقوں میں ہلچل مچ گئی۔یہ اس وقت کا اردو کا ایسا رسالہ تھا جس میں سب سے زیادہ مزاحیہ کالم ہوتے تھے۔

1945 میں نسیم انہونوی نے باقاعدہ سرپنچ کی ذمے داری سنبھالی۔انھوں نے اس کی کامیابی کے لیے بہت محنت اور پیسہ صرف کیے،لیکن بدقسمتی سے 1947 میں ہند وپاک کی تقسیم کے دوران ہونے والے فسادات میں ممبئی میں واقع سرپنچ کا آفس تباہ وبرباد ہوگیااور سرپنچ بند ہوگیا۔

ایک پبلشر کی حیثیت سے بھی نسیم انہونوی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔انھوں نے 1928 میں لکھنؤ میں لاٹوش روڈ پرادارہ'نسیم بک ڈپو' کی بنیاد رکھی۔یہ ان کا ذاتی ادارہ تھا اور ہندوستان کے معیاری اداروں میں شمار کیا جاتا تھا۔ان کا پہلا ناول'طرز زندگی'اسی ادارے سے شائع ہوا۔ 1989 تک انھوں نے اس ادارے سے ایک ہزار سے زائد کتابیں شائع کیں،جو ہمارے ادب کا گراں قدرسرمایہ ہیں۔اس کے ساتھ ہی انھوں نے خواتین قلمکاروں کا ایک گروہ پیدا کیا جس میں رضیہ سجاد ظہیر،حجاب امتیاز علی،صالحہ عابد حسین،عطیہ پروین،عفت موہانی،مسرور جہاں اور سعید ناز وغیرہ ناول نگار اور افسانہ نگار شامل ہیں۔نسیم انہونوی کی صلاحیتوں کو مدنظر رکھتے ہوئے ڈاکٹر اخلاق احمد اثر رقم طراز ہیں:

''سچ پوچھیے تو نسیم بک ڈپو کو نسیم انہونوی صاحب نے اکادمی کا درجہ دیا تھا۔بھوپال کے قلم کاروں کو دوسرے صوبوں سے جو انعامات و اعزازات ملے،بھوپال اور صوبے کے ادب کو جو مقام ملا اس میں نسیم انہونوی کا بہت بڑا ہاتھ تھا،ان کی خدمات کو ہم چاہیں بھی تو نظرانداز نہیں کر سکتے۔'' (نیا دور،لکھنؤ،جون 1980،ص 47)

نسیم انہونوی وقت کے بہت بڑے نباض تھے۔انھوں نے ادب کو ضروریات وقت کے مطابق پے در پے ترقی دینے میں گراں قدر خدمات انجام دیے ہیں۔زبان وادب کی ترقی اور نشوونما میں تراجم کا اہم رول ہوتا ہے۔انھوں نے اپنے ذاتی ادارے نسیم بک ڈپو سے بڑی تعداد میں تراجم شائع کیے اور ادب کے دامن کو مالا مال کیا۔اس سلسلے میں پروفیسر یعقوب یاور ایک جگہ لکھتے ہیں:

''انھوں نے اپنے ادارہ سے بڑی تعداد میں نہ صرف تراجم شائع کیے بلکہ مظہر الحق علوی،مظفر حنفی، ایم جے عالم،خان محبوب طرزی،مسعود جاوید،حسین امین اور بدنام رفیعی جیسے لوگوں کو اپنی طرف متوجہ بھی کیا۔نسیم بک ڈپو ہندوستان کا واحد غیر سرکاری ادارہ ہے،جہاں سے اتنی بڑی تعداد میں تراجم شائع ہوئے۔جن مغربی ناول نگاروں کے تراجم اس ادارہ سے شائع ہوئے ان میں ہرمن ہیس، سامرسیٹ مام، فیودردوستوفسکی،الیگزینڈر ورما، ماریو پوزو، کین فالیٹ،سڈنی شلڈن،رائڈر ہگرڈ اور اگاتھی کرسٹی جیسے نام شامل ہیں۔یہ مماثل بھی کتنے خوشگوار ہیں کہ اپنے عہد میں نول کشور نے منشیوں کو باقاعدہ ملازم رکھ کر داستانیں لکھوائیں جو اس عہد کے قارئین کے تقاضوں کی تکمیل تھی۔آج کے دور میں نسیم صاحب عوام کے ذوق کا لحاظ رکھتے ہوئے ویسی ہی توجہ تراجم پر صرف کی۔''

(یعقوب یاور،تفہیم وتفہیم،بھارت آفسیٹ،دہلی 2003،ص 27)

نسیم انہونوی کی ناول نگاری کی ابتدا'طرز زندگی' سے ہوئی۔انھوں نے جس عہد میں قلم سنبھالا وہ سیاسی سماجی اور معاشی نقطہ نظر سے نہایت کسمپرسی اور کرب کا زمانہ تھا اور پرانی قدریں دم توڑ رہی تھیں۔ایک طرف پستی،پسماندگی،رجعت پسندی،جہالت،مذہبی تعصب اور بے چارگی تھی تو دوسری طرف سامراجی طاقتیں اپنی گرفت مضبوط کرنے اوراپنے اقتدار کو قائم رکھنے کی کوشش کررہی تھیں۔ایسے نازک وقت میں قوم کا شیرازہ بکھر رہا تھااور خصوصاً نوجوان نسل انگریزی تعلیم کے زیراثر کیف و سرور کی سرمستیوں اور نت نئے فیشن میں ملوث ہوتی جا رہی تھی۔ایسے حالات میں نسیم انہونوی نے اپنے ناولوں کے ذریعے قوم کی اصلاح کی کوشش کی۔

نسیم انہونوی نے ڈپٹی نذیر احمد،عبدالحلیم شرر اور علامہ راشد الخیری کا اثر قبول کیااوران کے اصلاحی مقصد کے پیش نظر اپنے ناولوں کی تخلیق کی۔ان کا سب سے مشہوراور کامیاب ناول'کہکشاں' ہے۔یہ 1950 میں پہلی بار شائع ہوا۔اسے نسیم انہونوی اپنا شاہ کار ناول تسلیم کرتے ہیں۔اس ناول کے پندرہ ایڈیشن شائع ہوچکے ہیں۔اس کے بعد کئی ناول منظرعام پر آئے۔شگفتہ 1951،نجم السحر 1953،مہ پارہ 1954،تمنا 1955،شبانہ 1956،بانو اور سراب زندگی 1957،مہتاب اور گلرو 1958،خاتون اور ارمان 1959،کشور،آفاق اور رحمت 1960،مس طلعت 1962،پرایا دھن 1964،حسینہ 1966،حسرت 1973،آخری تمنا 1979،وغیرہ ناول لکھے۔

نسیم انہونوی کی ناول نگاری کا مقصد فرد اور سماج کی اصلاح ہے۔انھوں نے خصوصاً خواتین کی فلاح وبہبود اور ان کی تعلیم وتربیت کے لیے اپنے قلم کو جنبش دی۔ان کے زیادہ تر ناولوں کے نام نسوانی کردار سے ماخوذ ہیں۔انھوں نے زندگی کے مسائل سے چشم پوشی نہیں کی جو کچھ جیسا دیکھا اور محسوس کیا،اسے قلم کے ذریعے اپنے ناولوں میں بیان کردیا۔ناولوں میں قصے کے ڈھانچے تیار کرنے میں فنی چابک دستی سے کام لیا ہے اور واقعات نگاری کو خاص اہمیت دی ہے،جس سے ربط اور تسلسل قائم رہتا ہے۔ان مربوط واقعات کے ذریعے ہی قاری کی دلچسپی شروع سے آخر تک برقرار رہتی ہے۔ان کے ناولوں کی سب سے بڑی خوبی حقیقت اور تخیل کی حسین آمیزش ہے۔وہ اپنے تجربات و مشاہدات اور زبان و بیان کی چاشنی سے ناول کا حسن دوبالا کردیتے ہیں۔

نسیم انہونوی اپنے پیش رو ادیب علامہ راشد الخیری کی طرح اپنے تمام ناولوں میں عورت کی مظلومیت، پردے کی اہمیت وافادیت،گھریلو اور معاشرتی زندگی کو بنیادی حیثیت دی ہے۔جس کی وجہ سے انھیں عہد حاضر کا

ذی شعور صاحب فن ناول نگار تسلیم کیا جاسکتا ہے۔ان کے مد نظر ہمیشہ سماج اور معاشرے کی اصلاح رہی ہے۔ ان کی ناول نگاری کا اہم مقصد عورتوں کی تعلیم وتربیت اور ان کے تحفظ کے مسائل ہیں۔انھوں نے اپنے ناولوں کے ذریعے عورتوں کے خلاف برتے جانے والے امتیازات، مردوں کے ذریعے ان پر ہونے والے استحصال،مشرقی و مغربی تہذیب کا تصادم،مغربی تہذیب کی ظاہری چمک دمک اور ان سے پیدا ہونے والے مضر اثرات پر اظہار خیال کیا ہے۔یوں تو کئی خواتین قلم کاروں نے ان مسائل پر قلم اٹھائے ہیں،مگر نسیم انہونوی نے جس طرح سے نسوانی زندگی کے متعلق اظہار خیال کیا ہے،اس سے خواتین قلم کار پیچھے چھوٹ جاتی ہیں۔زندگی کے حقائق پر گہری نظر اور عمیق مشاہدات نے ان کے موضوعات کو دل آویز بنادیا ہے۔اس سلسلے میں ایک جگہ مسرور جہاں لکھتی ہیں:

"نسیم انہونوی مرحوم نے عورت کو عزت اور وقار بخشا،ان کے حقوق و فرائض پہنچوائے اور عورت کے استحصال کی پرزور مذمت کی۔مشرقی قدروں اور روایات کی پاسداری ان کا نصب العین رہا۔"

(نیادور، جون 1989،ص 43)

نسیم انہونوی عورت کو خانگی زندگی سے الگ کر کے نہیں دیکھتے ہیں۔وہ معاشرے میں اس کردار کو بلندیوں تک لے جانا اپنا اولین فرض سمجھتے ہیں۔ان کے ناول 'گلرو' اور 'مہ پارہ' ان نظریات کے حامی ہیں۔ناول 'گلرو' میں 'گنگا' ایک طوائف کی حیثیت سے سامنے آتی ہے،مگر کہانی کے آخر میں وہ مجرا ترک کر کے اپنی دولت نیک کاموں میں صرف کر دیتی ہے۔اسی طرح اس ناول کا دوسرا کردار 'گلرو' بھی رقص وسرود کو خیر آباد کہہ کر 'ارشاد' نامی شخص سے نکاح کر لیتی ہے اور پاکیزہ خانگی زندگی گزارتی ہے۔ ناول 'مہ پارہ' میں طوائف 'لیلیٰ' کا کردار بھی اہمیت کا حامل ہے۔فن موسیقی اس کا ذریعہ معاش ہے۔وہ بڑے بڑے اوباش رئیسوں کو اس فن سے مات دے جاتی ہے اور اپنے گوہر عصمت کو قائم رکھتی ہے۔ زندگی کے آخری ایام میں وہ حج بیت اللہ کے لیے روانہ ہو جاتی ہے۔نسیم انہونوی نے اپنے متعدد ناولوں میں مشرقی و مغربی تہذیب کا تصادم پیش کیا ہے،جس کی عکاسی ناول 'کہکشاں' میں بخوبی نظر آتی ہے۔ناول کا کردار 'افروز'، 'نازک' اور 'حسینہ' کی زندگی مغربیت کی اندھی تقلید کے سبب تباہ و برباد ہو جاتی ہے۔وہیں دوسری طرف ناول کا مرکزی کردار 'کہکشاں' جو مشرقی تہذیب کا دلدادہ اور اس روایات کا پرستار ہے،وہ اپنی ازدواجی زندگی میں سرخرو ہوتی ہے اور خوشیاں وشادمانیاں اس کے قدم چومتی ہیں۔

نسیم انہونوی کو مناظر فطرت سے گہری انسیت تھی۔ان کے زیادہ تر ناولوں کے اصلاحی پلاٹ کی شروعات انھیں مناظر سے ہوتی ہے۔وہ سال کے دو مہینے نینی تال میں گزارتے تھے۔وہاں کے خوشگوار اور پرسکون ماحول میں اپنے قلم کا جادو دکھاتے تھے۔وہاں کے قدرتی مناظر اور حسین نظاروں کی دلکش جھنکار ان کی تحریروں میں محسوس ہوتی ہے۔

"گو میں اب بوڑھا ہو چکا ہوں،لیکن میری محبوبہ پہلے بھی اسی طرح جوان تھی جس طرح آج نظر آرہی ہے،بلکہ میں سمجھتا ہوں کہ اس کے حسن میں پہلے سے زیادہ نکھار آگیا ہے اور جوانی جیسے پھوٹی پڑتی ہے۔وہی شادابی جو اس کے سراپا پر چھائی رہتی تھی،آج بھی نظر آتی ہے۔اس کا بانکپن شاید پہلے سے بھی زیادہ ہے۔شعرا نے اپنے محبوبوں کی آنکھوں کی تشبیہ جھیل سے دی ہے،لیکن اگر وہ نینی تال کو دیکھ لیں تو جھیل کے بجائے اسی سے تشبیہ دیتے۔صبح اٹھ کر اسے دیکھیے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے شب اول کی مست شباب دلہن شراب وصل پی کر سو گئی ہے۔دن میں دیکھیے تو ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے دلہن پہلی بار سسرال آئی ہے اور رونمائی کی رسم ہو رہی ہے۔ہر طرف چہل پہل ہر سمت شور وغل،جو ہے اس کا چہرہ دیکھنے کے لیے دوڑ رہا ہے، بھاگ رہا ہے اور رات کو دیکھیے تو ایسا معلوم ہوتا ہے جیسے نئی نویلی دلہن افشاں چھڑک کے کامدانی کا دوپٹہ اوڑھے لیٹی ہوئی ہے۔"

(آخری تمنا،نسیم انہونوی،نسیم بک ڈپو لاٹوش روڈ لکھنؤ 1979،ص 9)

> **"نسیم انہونوی اعلیٰ پایے کے ناول نگار تھے لیکن جن اقدار کو انھوں نے گلے لگایا وہ دم توڑ چکی تھیں اور نئی اقدار سماج میں قدم جما رہی تھی لہٰذا لوگوں کی توجہ ان کی طرف خاطر خواہ نہیں ہوسکی۔"**

افسانہ نگاری کے میدان میں بھی نسیم انہونوی کی اہمیت مسلم ہے۔ناولوں کی طرح افسانے بھی اصلاحی نقطہ نظر کے حامل ہیں لیکن ساتھ ہی ان میں رومانیت کا عنصر بھی موجود ہے۔جو اپنی منفرد پہچان رکھتا ہے۔ان کا پہلا افسانوی مجموعہ 'دردناک افسانے' کے نام سے 1939 میں شائع ہوا۔اس مجموعے میں کل اٹھارہ افسانے شامل ہیں۔دوسرا مجموعہ 'آخری کہانی اور دیگر افسانے' کے نام سے شائع ہوا۔

نسیم انہونوی سماجی حقیقت نگار ہیں۔انھوں نے عوام کے دکھ، درد، مصائب اور ایثار و قربانی کو اپنے افسانوں کا موضوع بنایا ہے اور خاص طور پر خواتین پر ہونے والے جبر اور ظلم وستم کے خلاف احتجاج کیا ہے۔ انھوں نے مظلوم اور بے سہارا عورتوں کو ان کا حق دلانے کی بھرپور کوشش کی۔ان کے نزدیک عورت ایثار و قربانی کا لازوال مجسمہ ہے۔جو ماں، بہن، بیوی اور بیٹی کی شکل میں ہمہ وقت قربانیاں دیتی رہتی ہے اور ہزار دشواریوں، مشکلات اور مصائب کے باوجود زندگی سے منھ نہیں موڑتی اور جینے کا حوصلہ رکھتی ہے۔آلام ومصائب سے ٹکرا کر ہی اس کی شخصیت میں نکھار آتا ہے اور وہ ایک آئیڈیل معاشرے کی تشکیل میں معاون ثابت ہوتی ہے۔

1970 کے بعد نسیم انہونوی دق کے مرض میں مبتلا ہو گئے اور طبیعت دن بہ دن خراب ہوتی گئی لیکن بیماری اور تکلیف کے باوجود بھی ان کا قلم نہیں رکتا تھا۔ہر بار سردیوں کے موسم میں سانس کی تکلیف میں اضافہ ہو جاتا تھا۔اس طرح صحت دن بہ دن خراب ہوتی گئی۔عالم یہ ہوتا تھا کہ ان کو کرسی پر بیٹھا کر دفتر کی سیڑھیوں سے اوپر پہنچایا جاتا اور کام کا سلسلہ جاری رہتا تھا۔جب کمزوری مزید بڑھ گئی تو بستر مرگ پر پہنچ گئے اور 4 مارچ 1989 کو اس دار فانی کو چھوڑ کر عالم جاودانی میں اپنے مالک حقیقی سے جا ملے۔

مختلف تحریروں کے مطالعے کے بعد یہ اندازہ ہوتا ہے کہ نسیم انہونوی اعلیٰ پایے کے ناول نگار تھے لیکن جن اقدار کو انھوں نے گلے لگایا وہ دم توڑ چکی تھیں اور نئی اقدار سماج میں قدم جما رہی تھی لہٰذا لوگوں کی توجہ ان کی طرف خاطر خواہ نہیں ہوسکی۔ان کے فن پر تبصرہ کرنا تنقیدی مضامین لکھنا بھی اہم قلم کاروں نے گوارہ نہیں کیا۔اس کا سبب یہ نہیں کہ ان کے ناول ایسے ہیں جنھیں نظر انداز کیا جاسکے۔ ایک ناشر کی حیثیت سے بھی وہ کامیاب انسان تھے۔جس کے آگے ان کے دوسرے کارنامے پھیکے پڑ گئے اور اہل ادب نے ان کے کارناموں سے چشم پوشی کر لی لیکن ان کے کارنامے اتنے اہم ہیں کہ اردو ادب میں ان کی خدمات کا اعتراف کرنا ہی پڑتا ہے۔ انھوں نے مشرقیت کی اجڑتی ہوئی اقدار کو اپنے قلم کی روشنائی سے سینچا اور زندگی کی آخری سانس تک اس کی آبیاری کرتے رہے کیونکہ یہ اقدار ہماری زندگی کے ضامن ہیں اور سماج کی ترقی کے لیے اہمیت کے حامل ہیں۔عصر حاضر میں اس بات کا بڑی شدت سے احساس ہوتا ہے کہ انھوں نے سماج کی اصلاح کی جو مہم چلائی تھی،اردو ادب میں وہ آج بھی سنگ میل کی حیثیت رکھتی ہے۔

■

Dr.Shahla Parveen
Assistant Professor(G.T.) Deptt.of URDU
S.N.S.College,Motihari
East Champaran- 845401 (Bihar)
E-mail:shahlap12@gmail.com

مغربی بنگال میں 2000 کے بعد اردو افسانہ

محمد علی حسین شائق

2000 کے بعد معاصر اردو افسانہ اپنے اندر نہ صرف اصلاحی پہلو لیے ہوئے ہے بلکہ اس کے اندر بیانیہ پن بھی ہے، علامتوں اور استعاروں کا استعمال بھی ملتا ہے۔ معاصر اردو افسانہ آج کے مسائل کی مناسبت سے اپنے اندر موضوعات لیے قاری کے درمیان حاضر ہوتا ہے جس سے قاری اس کی قرأت کرتے وقت ترسیل کے مسئلے سے دوچار نہیں ہوتا ہے۔ سابقہ روایات کے مقابلے، معاصر اردو افسانہ اپنے اندر تنوع لیے ہوئے ہے۔ اس بات کی بھی وضاحت ضروری ہے کہ سابقہ روایات یعنی ترقی پسند تحریک، جدیدیت کے رجحان اور اصلاحی پہلو تھی کرنے والے زیادہ تر افسانہ نگار، معاصر اردو افسانے کے تحت ایسے افسانے تخلیق کر رہے ہیں جس میں قاری کے لیے ذہنی آسودگی بھی ملتی ہے، تنوع بھی رہتا ہے، بیانیہ پن کا احساس بھی ملتا ہے اور ترسیل کا مسئلہ بھی پیدا نہیں ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ 2000 کے بعد کا افسانوی منظر نامہ سابقہ منظر ناموں کے مقابلے بہت ہی حوصلہ مند رہا ہے۔

اس بات کی وضاحت بھی ضروری ہوگی کہ معاصر اردو افسانہ نہ صرف اپنے اندر بیانیہ پن لیے رہتا ہے بلکہ اس کے ساتھ علامتوں اور استعاروں کا استعمال بھی ملتا ہے لیکن ایسی علامتوں اور استعاروں کا استعمال معاصر اردو افسانہ قطعی نہیں کر رہا ہے جس کے اندر ثقالت ہو۔ قاری وہی افسانے پسند کرتے ہیں جس میں ثقالت نہ ہو، ترسیل کا مسئلہ نہ ہو اور قاری اس کی ترسیل میں کوئی دقت محسوس نہ کرے۔ معاصر اردو افسانہ ایسے افسانے کا متقاضی ہے جس میں بیانیہ پن بھی ہو، تنوع بھی ہو، کردار بھی ہو، علامتوں اور استعاروں کا استعمال بھی ہو تو یقیناً وہ افسانہ قاری کو اپنی طرف راغب کرے گا۔

جہاں تک معاصر اردو افسانے میں رویے اور رجحانات کا تعلق ہے تو اس بات کو محسوس کیا جا سکتا ہے کہ معاصر اردو افسانہ اپنے اندر ایک احتجاج کی لے رہتا ہے لیکن اس میں شدت پسندی کا فقدان نظر آتا ہے۔ آج کا افسانہ نگار احتجاج کی لے بلند کرتا ہے لیکن اس میں دھیما پن رہتا ہے۔ معاصر اردو افسانہ منافرت بھرے ماحول سے نکل کر اطمینان و سکون کے ماحول کا متقاضی ہے۔ یہ گرتی ہوئی اخلاقی قدروں کی پامالی کا احتجاجی رویہ پیش کرتا ہے، سماج میں پھیلی معاشی ناہمواریوں کی صدا بلند کرتا ہے، اس کے افسانے میں جذباتیت رہتی ہے لیکن اس کی آنچ میں دھیما پن رہتا ہے، اس میں اجتماعیت کے مسئلے کا اظہار بھی ملتا ہے اور انفرادیت کے مسئلے کا اظہار بھی۔ جدیدیت کے رجحان میں جہاں اردو افسانہ شناخت کے مسئلے سے دوچار تھا تو اس وقت کے حالات کچھ اور تھے لیکن آج کا اردو افسانہ بھی شناخت کے مسئلے کو قاری کے سامنے رکھتا ہے۔ جدیدیت میں شناخت کا مسئلہ تقسیم ہند کے تناظر میں پیدا ہوا تھا لیکن اپنے ہی ملک میں رہتے ہوئے یہاں کا قاری شناخت کے مسئلے سے دوچار ہے، معاشی طور پر، اخلاقی طور پر اس لیے، معاصر اردو افسانہ شناخت کے مسئلے کو بھی سامنے رکھتا ہے۔

معاصر اردو افسانے کے رویے اور رجحانات میں فرق ضرور آئے ہیں لیکن مسئلہ وہی ہے، سابقہ سماج میں بھی قنوطیت کا مسئلہ تھا، آج کے سماج میں بھی۔ اس لیے سماج مسائل کے معاملے میں زیادہ بدلا ہوا نظر نہیں آ رہا ہے بلکہ کم و بیش اسی ڈگر پر رواں دواں ہے، لیکن انداز بیان میں تبدیلی ضرور آئی ہے۔ معاصر اردو افسانہ مغرب کی گندی تہذیب کو مشرق میں سرایت کرنے پر ایک کاری ضرب لگاتا ہے۔ اتنا ہی نہیں عریانیت کے حوالے سے انسان کے اندر جو شیطانی خیالات پنپتے ہیں اس کا اظہار بھی کرتا ہے۔

آج معاصر اردو افسانہ ایک مرتبہ پھر پریم چند کے اس خیال کی تشریح چاہتا ہے جو انھوں نے انجمن ترقی پسند مصنفین کے جلسے میں صدارتی خطبے کے دوران کہا تھا کہ ''ہمیں حسن کا معیار بدلنا ہوگا۔'' آج کا اردو افسانہ آخر کس حسن کی ضرورت محسوس کر رہا ہے۔؟ سائنسی طور پر ہمارا ذہن بہت ترقی کر چکا ہے۔ گھنٹوں کے مسئلے کو منٹوں میں اور منٹوں کے مسئلے کو سکنڈ میں حل کر رہا ہے لیکن کیا ہمارا ذہن اس بات سے قطعی پیچھا چھڑا لے گا کہ سائنس اور ٹکنالوجی کے میدان میں بے پناہ ترقی کے باوجود ہمارا سماج اخلاقی گراوٹ کا زبردست شکار ہو چکا ہے۔ اخلاقی اور تہذیبی گراوٹ ترقی کی نشانی نہیں ہو سکتی، ہمیں حسن کے معیار میں تبدیلی لانی ہوگی، سوچ میں استحکام لانا ہوگا۔ آسمانوں کی بلندیوں اور زمین کی تہوں میں پہنچنے سے ہمارا سماج مہذب نہیں کہلائے گا۔ ایک سماج کے مہذب کہلانے کے لیے اخلاقی، تہذیبی، معاشی، اور سماجی ناہمواریوں کو ختم کرنا ہوگا۔ معاصر اردو افسانہ ایسے ہی موضوعات کو اپنے اندر سمونا چاہتا ہے۔ آج کا فنکار گزشتہ فنکاروں سے زیادہ حساس ہے۔ اس میں دو رائے نہیں ہے کہ منٹو نے سماج میں پھیلے ہوئے ناسور کی نشتر زنی اپنے افسانوں سے کی لیکن معاصر اردو افسانہ کے افسانہ نگار بھی اس سے الگ نہیں ہیں۔ ان کی تخلیقات میں سماج میں پھیلی برائی کی نشتر زنی ملتی ہے۔ منٹو نے اس سماج کو دیکھا جس میں طوائفوں کے کوٹھے ہوا کرتے تھے اور سفید پوش رات کی تاریکی میں اپنی ہوس مٹا کر دن کے اجالے میں ان ہی طوائفوں پر انگلیاں اٹھاتے تھے۔ منٹو نے ان طوائفوں کے اندر ایک عورت کو محسوس کیا تھا اور حقیقتوں کو سامنے لا کر انھیں عورت کے مقام پر کھڑا کرنا چاہتا تھا تاکہ وہ عورت طوائف کی دنیا سے نکل کر ایک باعزت عورت کی شکل میں سماج میں اپنا مقام حاصل کر سکے۔ آج کا فنکار بھی اسی خیال کو اپنی تخلیقات میں پیش کرتا ہے۔

قحبہ خانے آج بھی ہیں لیکن ساتھ ہی مہذب قحبہ خانے بھی اسی معاشرے میں ہیں اور جسموں کی تجارت بڑے ہی شوق سے ہورہی ہے اور یہ ایک فیشن بن چکا ہے۔ مغرب کی تقلید نے مشرقی ممالک کو بھی فیشن پرست بنا دیا ہے اور جنسی تعلقات کو عیب نہیں بلکہ ایک فیشن سے تعبیر کررہا ہے۔ ہمارا معاشرہ اس وبا سے زبردست جوجھ رہا ہے۔ آج کا فنکار ان موضوعات کو اپنی تخلیقات میں پیش کرتا ہے۔

معاصر اردو افسانہ کئی چنوتیوں سے نبرد آزما ہے۔ سابقہ افسانے اور افسانہ نگاروں کے سامنے محدود چنوتیاں تھیں، موضوعات بہت تھے، آج کے فنکار کے پاس بھی ہیں لیکن انھیں بہت زیادہ چنوتیوں کا سامنا کرنا پڑتا ہے۔ آج کا افسانہ دوراہے پر کھڑا ہے۔ جب ترقی پسندی کا زور ٹوٹنے لگا اور جدیدیت کا غلبہ ہونے لگا اس وقت بھی افسانہ دوراہے پر کھڑا تھا لیکن وہاں ترسیل کا مسئلہ تھا لیکن آج کے افسانے کے پاس ترسیل کا مسئلہ نہیں بلکہ اظہار کے ذریعے اس کے اطلاق کا ہے۔ یہ بات بھی صحیح ہے کہ معاصر افسانہ کسی طرح اپنے رویے سے سمجھوتہ نہیں کرتا کیونکہ آج کا فنکار موضوعات کو سامنے رکھ کر اعتدال کے ساتھ اپنے خیالات اور جذبات کا اظہار کرتا ہے۔ رجحانات کے معاملے میں قاری ادب سے جڑ رہا ہے ،افسانے کی قرأت کو اپنا شیوہ بنا رہا ہے جس کا نتیجہ ہے کہ کتابیں منظر عام پر آرہی ہیں۔

افسانہ نگاروں کی نئی نسل جو 2000 کے بعد افسانے کی دنیا میں قدم رکھا، بڑے ہی حساس انداز میں اور طمطراق انداز میں اپنا سفر شروع کردیا ہے۔ آج پوری دنیا الیکٹرونک میڈیا سے نکل کر شوسل میڈیا اور ڈیجیٹل دنیا میں داخل ہو چکی ہے۔ انسان کی ضرورتیں بھی بے انتہا بڑھ گئیں ہیں، ساتھ ہی انسان کی مصروفیات میں بھی کمی کے بجائے زیادتی ہوئی ہے۔ آج کا انسان پہلے کے مقابلے بہت زیادہ مصروف ہوگیا ہے تاہم اس نے ادب سے اپنا رشتہ اب بھی استوار رکھا ہے اس کی خاص وجہ یہی ہے کہ معاصر ادب اپنے سفر کو نہایت ہی معتدل انداز سے جاری رکھے ہوئے ہے اور اس معاصر ادب میں معاصر اردو افسانہ اپنی مستحکم شناخت بنا چکا ہے اور اس طرح آگے کی طرف رواں دواں ہے جو ایک خوش آئند قدم ہے۔ یہ تو قومی سطح کی گفتگو ہوئی لیکن جب مغربی بنگا کی سطح پر اردو افسانے کے حوالے سے گفتگو کرتے ہیں تو ہمیں یہ علم ہوتا ہے کہ مغربی بنگال بھی اور دوسری ریاستوں کے ساتھ اردو ادب کی خدمت میں پیچھے نہیں رہا ہے۔

مغربی بنگال میں افسانہ نگاری کی ابتدا غالبا 1910 کے قریب ہوئی۔ یہاں کے ابتدائی افسانہ نگاروں میں ڈاکٹر عندلیب شادانی، راحت آرا بیگم، صالحہ بیگم مخفی، ل۔ احمد، اکبر آبادی، شائستہ سہروردی، حسن نجمی سکندر پوری، جوہر غازی پوری، شمس صابری، شین مظفر پوری طاہرہ دیوی شیرازی، شاہ مقبول احمد اسحاق امرتسری، شریف چکوالی، قیس شیخ پوری وغیرہ کے نام قابل ذکر ہیں۔ ڈاکٹر عندلیب شادانی جو بہت دنوں تک پریم پجاری کے نام سے لکھتے رہے۔ ان کے دو افسانوی مجموعے 'نئی کہانیاں' اور 'نوش ونیش' منظر عام پر آئے۔ راحت آراء بیگم کے چھ افسانوی مجموعے انقلاب، بدو کی بٹی، بانسری کی آواز، پریمی، دلنواز منظر عام پر آئیں۔ صالحہ بیگم مخفی کا افسانوی مجموعہ نیا شاہکار (مظاہرات مخفی) کے نام سے شائع ہوا۔ اس میں کل گیارہ یک حرفی افسانے ہیں۔ اس طرح دیگر افسانہ نگاروں کے بھی کئی ایک افسانوی مجموعے شائع ہوئے۔ ابتدائی افسانہ نگاری کے بعد جب ترقی پسندی کا زمانہ آیا تو بھی مغربی بنگال کے افسانہ نگاروں نے اس کا ساتھ دیا۔ مغربی بنگال کے ترقی پسند افسانہ نگاروں میں اہم نام نشاط الایمان جن کا افسانوی مجموعہ 'لیل ونہار'، شمس صابری کا افسانوی مجموعہ 'دھند اور کرن'، ڈاکٹر جاوید نہال کا 'پھول رانی'، سالک لکھنوی کا 'عذرا اور دیگر افسانے'، شانتی رنجن بھٹاچاریہ کا 'شاعر کی شادی' اور 'راہ کا کانٹا' یونس احمر کا 'سنگریزے' منظر عام آئے اور وقت کی ضرورت کو پورا کیا۔ جدیدیت کا اثر مغربی بنگال کے اردو افسانوں پر بھی پڑا اور یہاں کے افسانہ نگاروں نے بھی علامتی، استعاراتی اور تمثیلی افسانے لکھے۔ ان میں ایک نام ظفر اگانوی کا ہے جن کا اکلوتا افسانوی مجموعہ 'بیچ کا ورق' ہے۔ انیس رفیع کا تین افسانوی مجموعے 'اب وہ اترنے والا ہے'، 'کرفیو سخت ہے' اور 'گداگر سرائے' ہیں۔ فیروز عابد کا 'اندھی گلی میں صبح'، 'نقش بر آب'، 'کھلے آسمان کے نیچے' ہیں۔ ڈاکٹر عابد ضمیر کا 'ڈوبتے سورج کا کرب' کے علاوہ ان کے اور افسانوی مجموعے 'دل کی تحریر'، 'شطرنج کے مہرے'، 'بھیگی پلکیں' وغیرہ ہیں۔ شمس ندیم کے افسانے زخمی خوابوں کا کرب، سرخ عورت، نیلا گھوڑا، اور سیاہ روشنی کا شکاری اہم ہیں۔ سہیل واسطی کے افسانے رنگوں میں گھرا آدمی، اسموک اسکرین، شانتی پیدا ہوئی، پش بٹن اور پلک اہم ہیں۔ نذیر احمد یوسفی کا افسانوی مجموعہ چپ فضا میں عذاب، دو سو قدم کا ڈر ہے۔ ڈاکٹر عشرت بیتاب کے افسانوی مجموعے بے ثمر حیات، ٹھنڈی آنچ کا سورج وغیرہ ہیں، سفید ساڑی والی عورت، سورج میں اٹکا ہوا ایک قدم، ٹھنڈی آنچ کا سورج ان اہم علامتی افسانے ہیں۔ سعید پریمی کا افسانوی مجموعے 'چہرے کی واپسی' 1982 میں اور 'میرے اپنے' 2008 میں شائع ہوئے۔ ان کے علاوہ اظہارالاسلام کا افسانوی مجموعہ 'واپسی' ہے ان کے علامتی افسانوں میں وہ آدمی، اجنبی، سوراخ، دھواں ہیں۔ مشتاق اعظمی کے دو افسانوی مجموعے 'آدھا آدمی' اور 'نارسیدہ' ہیں۔ جلیل عشرت کا افسانوی مجموعہ اکیسویں صدی کا گوتم، نئی صدی کی بیٹی ہے۔ ضیاء الرحمن ضیاء کا افسانوی مجموعہ 'فصیلوں کا قیدی' ہے۔ صدیق عالم کا افسانوی مجموعے 'آخری چھاؤں' 1982 میں اور 'لیمپ جلانے والے' 2008 میں شائع ہوئے، محمود یٰسین کا افسانوی مجموعہ 'نئی بستی کا رزمیہ اور دیگر افسانے' ہے۔ ان کے اہم علامتی افسانے شکست خوردہ، نئی بستی کا رزمیہ، وغیرہ ہیں۔ سلیم خاں ہمراز کے دو افسانوی مجموعے 'ڈیڈ لائن' اور ندی میں اترتا سمندر ہیں۔ شبیر اختر کا افسانوی مجموعہ 'سنسان جنگلوں کا راستہ' ہے۔ ڈاکٹر مشتاق انجم کے افسانوی مجموعہ 'بے گھری' اور 'تلاش' ہیں۔ ان کے اہم علامتی افسانوں میں رات کا مسافر، نصف زمین میں گڑا ہوا آدمی، بے روح پرندہ وغیرہ ہیں۔ شبیر احمد کا افسانوی مجموعہ 'چوتھا فنکار' ہے۔ انیس النبی کا افسانوی مجموعہ 'پرندے' ہے۔ سلیم سرفراز کے تین افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں ان میں خواب کنارے، یادسہارے، دھوپ سنوارے ہیں۔ جاوید نہال حشمی کا افسانوی مجموعہ 'دیوار' ہے۔ عظیم اللہ ہاشمی کا افسانوی مجموعہ 'دیدۂ نم' ہے راقم الحروف (محمد علی حسین شائق) کے دو مجموعے منظرِ عام پر آچکے ہیں۔ ان میں کرچیوں میں بٹا انسان، اور اترکے شامل ہیں۔ ان کے علاوہ ڈاکٹر شہناز نبی، شبیر اصغر، وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔

جدیدیت کا زور جب ختم ہوا تو مغربی بنگال کے افسانہ نگاروں نے بھی اس کا ساتھ دیا اور یہاں بھی علامتوں سے نکل کر بیانیہ افسانے لکھے جانے لگے۔ ان افسانوں میں سماج کے مسائل، تہذیب کا گرتا معیار، اخلاقی قدروں کی پامالی، وغیرہ کے موضوعات چھائے رہے تب تک 2000 کا سال آگیا۔ معاصر اردو افسانے کے حوالے سے جب ہم 2000 کے بعد کے افسانوں کا مطالعہ کرتے ہیں تو ہمیں آج بھی ان افسانہ نگاروں کے جو 1960 اور 1980 کی دہائی میں افسانے لکھے ہیں 2000 کے بعد بھی ان کا افسانوی سفر جاری ہے اور معاصر احساسات کو ملحوظ خاطر افسانے لکھ رہے ہیں جس میں اشتراکی پہلو بھی غالب رہتا ہے، بدلتی قدروں کا ساتھ دیتے ہوئے اساطیری ادب کو بھی برت رہے ہیں اور علامتوں کا فنکارانہ استعمال بھی کیا جارہا ہے۔ آج کا ادب عصری تقاضوں کو صحت مند طریقے سے برت رہا ہے اور سفر کو آگے بڑھائے جارہا ہے۔

معاصر اردو افسانے کی روایت کو آگے بڑھانے

میں جن فنکاروں نے اپنی خدمات پیش کیں ان میں صدیق عالم، عشرت بیتاب، مشتاق انجم، خورشید اختر فرازی، شین کنور، شہیرہ مسرور، انیس النبی، شہناز نبی، یاسمین اختر، سلیم سرفراز، عظیم اللہ ہاشمی، جاوید نہال حشمی، ریاض دانش، مسرور تمنا، نسیم اشک، طلعت انجم فخر اور راقم الحروف کا نام شامل کیا جا سکتا ہے۔ درج بالا ناموں کے علاوہ اور بھی بہت سے نام ہیں جن کو اس میں شامل نہیں کیا جا سکا ہے لیکن ان کی خدمات سے انکار ممکن نہیں ہے۔

معاصر اردو افسانہ بھی اپنی روش کو اپنائے ہوئے ہے۔ مغربی بنگال کے معاصر اردو افسانہ نگاروں میں 2000 کے بعد کم تعداد میں سامنے آئے ہیں تاہم یہ بھی ہے کہ 2000 سے قبل لکھنے والے افسانہ نگار اب بھی لکھ رہے ہیں اور ان کے افسانے بھی معاصر ادب کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ معاصر اردو افسانہ ابھی نئے افسانہ نگاروں کی روش پر چل رہا ہے اور افسانہ نگار ضرورت کے تحت اور ماحول کی مناسبت سے افسانے لکھ رہے ہیں۔

مغربی بنگال کے معاصر اردو افسانے کی فضا میں ایک نام ڈاکٹر عشرت بیتاب کا ہے جو اپنی زندگی کے 80 کے پڑاؤ میں آچکے ہیں جن کے یہاں بیانیہ افسانے بھی ملتے ہیں، علامتی و استعاراتی افسانے بھی نظر آتے ہیں لیکن 2000 کے بعد کا جو منظر نامہ ہمارے سامنے موجود ہے جہاں انسانوں کے اندر انسانیت اور اپنے آبا و اجداد کی وراثت کی حفاظت کی ذمے داری تو دور کی بات رہی، اس کی اہمیت تک کو ہم نہیں سمجھتے۔ موصوف کا ایک افسانہ 'بے حسی' جو 2006 میں شائع ہوا اس خیال کو پیش کرتا ہے۔ آج کا ادب ہم سے اپنے اسلاف کی نشانی کی حفاظت کا متقاضی ہے۔ کہانی کے اختتام پر قاری فکر کی گہرائی میں غوطہ زن ہو کر سوچنے پر مجبور ہو جاتا ہے۔ ہمارے سماج میں تیسری جنس کے لوگ بھی رہتے ہیں جنھیں ہمارا سماج قبول نہیں کرتا ہے یا انھیں احترام کی نظروں سے نہیں دیکھتا ہے لیکن اس تیسری جنس کے اندر اپنے اسلاف کو یاد رکھنے کا عمل ہمارے مہذب سماج میں رہ رہے انسانوں کو جھنجھوڑتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

''رات میری موسی سپنے میں آکر کہہ رہی تھی کہ تجھ سے مل کر موسی والی وہ کہانی لے لیں''

''کون موسی والی کہانی؟''

''ارے وہی... کیا اچھا سا نام بتایا تھا موسی نے... رات کے سپنے میں!'' اور پھر کمر لچکا کر کچھ سوچنے لگی۔

''ہاں ہاں... بے نورن والی آنکھ۔''

''بے نور آنکھیں۔'' میں نے اصلاح کی۔

''ہاں وہی۔ تم نے موسی پر اس میں کچھ لکھا ہے نا!''

''ارے بابا، ہجڑوں پر میری کئی کہانیاں ہیں، لیکن بے نور آنکھیں... بھٹیا والی کہانی''

''ہاں! بھٹیا ہی تو میری موسی تھی... میرے کل کی سردارنی!''

''تم کیا کروگی اسے لے کر؟''

''موسی نے کہا کہ اسے فریم میں چڑھوا کر دیوار میں لٹکانے کو... او میری اماں... سنہرے گوٹے میں... بج رہی...''

کہانی لے کر وہ لوگ چلی گئیں لیکن میں کھڑا سوچتا رہ گیا... کہ انھیں اپنے پروجوں سے کتنی عقیدت ہے... اے کاش...''

اس طرح کی کئی اور کہانیاں ہیں جو انھوں نے تخلیق کیں ہیں۔

ایک دوسرا معتبر نام ڈاکٹر مشتاق انجم کا ہے۔ وہ بھی 80 کی دہائی سے افسانہ لکھ رہے ہیں اور اب تک ان کے کئی ایک افسانوی مجموعے منظر عام پر آچکے ہیں۔ انھوں نے بیانیہ افسانے بھی لکھے، علامتی اور استعاراتی افسانے اور اب بھی لکھ رہے ہیں۔ ان کے افسانوں میں اعتدال پسندی مکمل طور پر غالب نظر آتی ہے۔ وہ اپنے بیانیہ پن میں ہی علامت اور استعاروں کو استعمال کر دیتے ہیں اور افسانے کے اندر افسانہ پن بھی برقرار رہتا ہے۔ ان کا ایک افسانہ 'آب گزیدہ' جو سہ ماہی ذہن جدید دسمبر، فروری 2011 میں شائع ہوا، اسے پڑھ کر بخوبی اندازہ لگایا سکتا ہے کہ ان کے افسانے میں بیانیہ پن بھی ہے، کردار بھی ہے ساتھ ہی سہل علامتوں کا استعمال بھی ہے ملاحظہ کیجیے:

''پانی میں رہ کر مگر مچھ سے بیر''

اس میں کس قدر مفہوم چھپا ہوا ہے۔ علامت کا سہل استعمال۔ یعنی ایسا ماحول جو اس انسان کے مزاج کے بالکل برعکس ہو وہاں اپنی مرضی سے کچھ نہیں کیا جا سکتا ہے، بلکہ اس کے رحم و کرم پر رہنا پڑتا ہے۔ یہاں اذیت کو بطور علامت استعمال کیا گیا ہے۔ لیکن اسی افسانے میں ایک کوا گویا ہوتا ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

''خودداری کو مٹھی میں بند کر کے پانی کے قریب جایا جا سکتا ہے۔''

آج کے ماحول میں خوددار ہونا اور حساس ہونا مشکل میں پھنسنا ہے۔ کہانی جب آگے بڑھتی ہے تو ایک عمر دراز شخص کہانی کے کینوس پر ابھرتا ہے۔ اس کے ہاتھ میں ایک فریم ہے، کہانی کار اس فریم کو دیکھتا ہے۔ پہلے تو اسے کچھ سمجھ میں نہیں آتا ہے اور اس کو بکواس آرٹ سمجھتا ہے لیکن بعد میں اسے احساس ہوتا ہے کہ موجودہ سماج کے نظام کا ڈھانچہ ہی یہی ہے۔ ملاحظہ کیجیے:

''اس نے ایک بار فریم پر نظر ڈالی۔

ڈاکٹر کی کرسی پر ڈاکو، وکیل کی کرسی پر پاکٹ مار، جج کی کرسی پر جلاد، وزیر کی کرسی پر لومڑی، راجہ کی کرسی پر گدھا، چوہے کی کرسی پر شیر، افسر کی کرسی پر سور...

اس نے نظریں اٹھا کر بزرگ کی طرف دیکھا

''ارے بڑے میاں کہاں گئے؟''

دفعتا کانوں میں آواز آئی۔

''پانی میں رہ کر مگر مچھ سے بیر''

گھڑیال کا چہرہ نظر نہیں آیا لیکن پانی میں ہلچل اس کی موجودگی کا احساس دلا رہی تھی!

تب دور سے ایک آواز ابھری

''خودداری کو مٹھی میں رکھ کر پانی کے قریب جایا جا سکتا ہے۔''

2000 کے بعد کے افسانوں میں ایک افسانہ 'انتقام' ہے جس کے خالق خورشید فرازی ہیں وہ بھی ایک منجھے ہوئے افسانہ نگار ہیں۔ انھوں نے اخلاقی قدروں کا گرتا ہوا معیار، زمانے کے شکست و ریخت کی باتوں کو نہایت ہی سہل زبان میں افسانوی رنگ عطا کر دیا ہے۔ ان کا افسانہ 'انتقام' 2007 میں سہ ماہی رسالہ مژگاں میں شائع ہوا۔ اس افسانے میں موصوف نے انسانی فطرت کی خوبصورت عکاسی کی ہے۔ انسان کی فطرت کبھی تبدیل نہیں ہو سکتی ہے لیکن اس کا احساس بعد میں ہوتا ہے۔ افسانے کے دو کردار ہمارے سامنے ہیں۔ پہلا کردار عادل نواب کا دوسرا احمر امن کا۔ پہلا کردار ایک اسکول کے ہیڈ ماسٹر ہونے کے ساتھ ایک ادیب و افسانہ نگار بھی ہے۔ دوسرا کردار احمر امان ایک صحافی ہے۔ موصوف نے ان دونوں کرداروں کے ذریعے انسان کے منفی اور مثبت پہلوؤں کو اجاگر کرنے کی کوشش کی ہے۔ عادل نواب ہمیشہ احمر امان کو نقصان پہنچانے کی کوشش کرتا رہا لیکن احمر امان نے ہمیشہ اپنی مثبت سوچ کے ساتھ کام کرتے ہوئے عادل نواب کو اس کی شخصیت کو اوپر کرتا رہا۔ نتیجے میں بعد میں عادل نواب کو اس بات کا احساس ہوا اور اس نے بھری محفل میں اپنی غلطی کا اقرار کیا جس سے اس کا قد چھوٹا نہیں بلکہ اور بڑا ہو گیا اور احمر امان کی عظیم شخصیت میں عظمت کے مزید چاند ستارے ٹانک دیے گئے۔ 2000 کے بعد ہمارے سماج میں گرتی ہوئی اخلاقی قدروں کا مسئلہ درپیش تھا اور اب بھی ہے لیکن ہمارے افسانہ نگاروں نے ہمیشہ اس بات کو محسوس کیا اور ان موضوعات پر افسانے لکھے۔

انیس النبی کا افسانہ 'بھرت راج' ہندوستان کی موجودہ سیاسی صورت حال کی بہترین عکاسی کرتا ہے جہاں اقتدار کی حصولیابی کے لیے مذہبی ہتھکنڈے اپنائے جاتے ہیں اور ملک کے سیدھے سادے عوام کو الٹی سیدھی

باتیں کر کے اپنا الو سیدھا کیا جاتا ہے۔ شبیر احمد کا افسانہ ''بشر جن'' انسانی نفسیات کی بہترین ترجمانی کرتا ہے۔ انسان نفسیاتی طور پر بہت کمزور پیدا ہوتا ہے۔ اس کو تقویت اس کے اندر کی خود اعتمادی بخشتی ہے تب جا کر وہ اس نفسیات سے نکل پاتا ہے۔ انسان کے ذہن میں جو بات بیٹھ جاتی ہے اسے نکالنا بہت مشکل ہو جاتا ہے اور یہ کام ماہر نفسیات ہی کر سکتے ہی۔ ڈاکٹر شاہد فروغی کا افسانہ 'سڑا ہوا ہاتھ' ایک اچھا افسانہ ہے۔ کبھی کبھی انسان اپنی زندگی سے تنگ آ کر خودکشی کا ارادہ کرتا ہے اور اس کام کے لیے وہ پوری تیاری بھی کر لیتا ہے لیکن اسی لمحے جب دوسرے کا خیال اسے آتا ہے تو وہ خودکشی کا ارادہ ترک کر دیتا ہے اور دوسرے کی خاطر زندہ رہنے کا عہد کر لیتا ہے اس طرح اس کی زندگی غلط عمل کرنے سے بچ جاتی ہے۔ افسانہ 'سڑا ہوا ہاتھ' اسی خیال کو پیش کرتا ہے۔۔ دہشت گردی کا کوئی مذہب نہیں ہوتا ہے اور دہشت گرد نہ ہندو ہوتا ہے نہ مسلمان بلکہ وہ صرف اور صرف ایک دہشت گرد ہوتا ہے جس کا مقصد لوگوں کے امن و سکون کو غارت کرنا ہوتا ہے، لوگوں کے چہروں سے خوشی چھیننا ہوتا ہے اس کے علاوہ اس کا اور کوئی مقصد نہیں ہوتا ہے۔ ڈاکٹر عظیم اللہ ہاشمی کا افسانہ 'نیل گگن کے تارے' اسی خیال کو ظاہر کرتا ہے۔ معاصر اردو افسانہ آج ایسے موضوعات سے بھرا پڑا ہے۔

سائنس اور ٹکنالوجی کی بے پناہ ترقی کے مثبت اور منفی نتائج سے بے خبر آج کا انسان اس کے پیچھے اس لیے بھاگا جا رہا ہے کہ لوگ اسے ترقی یافتہ سمجھیں۔ حالانکہ سائنس اور ٹکنالوجی کی ایجاد سے جتنا فائدہ انسان کو ملا ہے اس سے کہیں زیادہ نقصان پہنچا ہے اور ہوش انسان کو اس وقت آتا ہے جب بہت دیر ہو جاتی ہے۔ عصر حاضر میں موبائل ٹاور اور نت نئے قسم کی ایجادات نے انسانوں کو فائدہ پہنچایا ہے لیکن اس سے کہیں زیادہ نقصان پہنچایا ہے۔ ارشد نیاز کا افسانہ 'ای وائرس' ایک ایسا افسانہ ہے جس میں یہ خیال پیش کیا گیا ہے۔ اس وائرس کی ایجاد سے ذہنی طور پر مفلوج انسانوں کو ٹھیک کیا جا سکتا ہے اور افسانہ نگار اس کا موجد ہے اور اس کا تجربہ اپنے ہی بچے پر کرتا ہے جس کا مثبت اثر بھی دیکھنے کو ملتا ہے، لیکن اسی لمحے اس کے منفی اثرات کا خیال اس کے ذہن میں آتا ہے اور اسے اینٹی وائرس سے اس ای وائرس کو ختم کر دیتا ہے۔ نسیم اشک کا افسانہ 'گم شدہ' عصر حاضر کے بدلتے انسانی چہروں کی کہانی ہے۔ انسان وقت کی تیز رفتاری کے ساتھ چل رہا ہے اور تیزی سے اپنے چہرے وقت کے تقاضے کے مطابق بدل رہا ہے۔ خوف خدا سے خالی دل ایک پل کو بھی یہ سوچ کر نہیں ٹھہراتا ہے کہ اتنے چہرے بدلتے بدلتے اس کا اپنا چہرہ بھی مسخ ہو گیا ہے۔ آج کا انسان اتنا ترقی یافتہ ہو گیا ہے کہ وہ یہ بات بھول گیا ہے کہ ایک روز اسے اپنے رب کے پاس لوٹنا بھی ہے۔ ملاحظہ کیجیے یہ جملے...

''اب اسے ذرہ برابر بھی ملال نہ تھا کہ اس کا چہرہ کھو گیا ہے، دوسروں کے پاس بھی ان کے چہرے نہیں ہیں اور وہ بھی خوش ہیں تو پھر وہ کیوں چہرے کے نہ ہونے کا غم کرے۔'' (افسانہ: گم شدہ)

یہ انسانی زندگی کا المیہ ہے کہ وہ حقیقت سے اس قدر بیگانہ ہو چکا ہے کہ خود اپنے آپ کو پہچان نہیں پا رہا ہے۔

نسیم اشک کا دوسرا افسانہ 'مٹی تصویریں' ہے۔ یہ ایک کہانی کار کی کہانی ہے۔ جب وہ اپنی کہانی ختم کرنے کے لیے ایک شہر جاتا ہے تو وہاں کی زندگی دیکھ کر حیران ہو جاتا ہے۔ ملک اور سماج میں ابھرتے نئے مسائل کو دیکھ کر گھبرا جاتا ہے۔ حقیقی زندگی کو قریب سے دیکھنے کے بعد وہ سوچتا ہے کہ کیا وہ جو کہانی کہہ رہا ہے اس کا حقیقت سے واسطہ بھی ہے؟ مفلسی، تنگدستی، لاچاری جیسے مسائل سے قطع نظر کہانی کا آخر کیا وجود ہے؟ ملاحظہ کیجیے:

''اس نے مجھے روک کر کہا، بابو وہ بڑے صاحب بھی یہاں آتے ہیں وہ ہماری زندگی کی ترجمانی کرتے ہیں وہ بہت بڑے فنکار ہیں جب بھی یہاں آتے ہیں منھ پر کپڑا اور ایک منرل واٹر کی بوتل ضرور ہاتھ میں رکھتے ہیں لوگ کہتے ہیں ان کے دل میں غریبوں کا بڑا درد ہے۔''

(افسانہ مٹی تصویریں)

اس کے علاوہ ان کا افسانہ 'اندھی روشنی' ملک میں تیزی سے بڑھتے فرقہ وارانہ فساد کی تصویر پیش کرتا ہے۔ چند مفاد پرست لوگ کس طرح خوشحال لوگوں کی زندگی میں نفرت کی آگ بھڑکاتے ہیں جس میں ذات و مذہب سے بالاتر انسانیت جل جاتی ہے۔ عصر حاضر میں معاصر ادب ایسے ہی موضوعات کو اپنے افسانوں میں شامل کر رہا ہے۔

ایسے بہت سے موضوعات لیے ہمارے افسانہ نگار آج بھی اردو ادب کی خدمت میں مصروف ہیں۔ شہیرہ مسرور کا افسانہ 'نسلوں کی کیل پر ٹنگا رشتہ'، نئی نسل کی بازیابی اور اس کے اندر اپنی تہذیب کو بچانے کا پیغام دیتا ہے۔ شہناز نبی کا افسانہ 'کبڑوں کی بستی' ایک علامتی افسانہ ہے لیکن علامت کے استعمال میں سہل پسندی ہے جو قاری کی ترسیل تک ہے۔ جاوید نہال حشمی کا افسانہ 'جڑوں کی تلاش' موجودہ صورت حال کی بہترین نمائندگی کرتا ہے۔ شبیر احمد کا 'بشر جن' انیس النبی کا 'ہجرت راج'، راقم الحروف کا 'کرچیوں میں بٹا انسان'، شبیر اصغر کا 'چار انگلیوں والا آدمی' عظیم اللہ ہاشمی کا ''نیل گگن کے تارے' شکیل افروز کا 'سیاہ تاج'، ریاض دانش کا 'گھڑی'، نسیم اشک کا 'مٹی تصویریں اور گم شدہ' وغیرہ ایسے افسانے ہیں جو 2000 کے بعد اخبارات و رسائل میں شائع ہوئے۔ یہ تمام افسانے عصر حاضر کے مسائل کی نمائندگی کرتے ہیں۔

ایک بات اور ہے کہ یہ تمام افسانے نہ صرف مسائل کی طرف توجہ مبذول کراتے ہیں بلکہ ان مسائل کے حل کے راستے بھی نکالتے ہیں۔ یہ ایک خوش آئند بات ہے کہ معاصر اردو افسانہ نے روایت کا احترام بھی کیا ہے، حالات پر کاری ضرب بھی لگایا ہے اور اس میں بیانیہ پن کا خیال بھی رکھا ہے تو کردار کی اہمیت کو اجاگر بھی کیا ہے، ساتھ ہی اس میں فنی ستارے بھی ٹانکے ہیں اور علامتوں اور استعاروں کا خوبصورت استعمال بھی کیا ہے۔ معاصر اردو افسانہ اب رومان پسندی کو راہ نہیں دیتا بلکہ مسائل کو سامنے لاتا ہے اور اس کے حل کے راستے بھی تلاش کرتا ہے تاکہ پریشان حال انسان ان تمام مسائل سے نبرد آزما ہو کر اس کے حل کی طرف مراجعت کرے اور اطمینان و سکون کی زندگی بسر کرے۔ اس کے علاوہ سماج میں پھیلی منافرت کی دیواروں کو بھی ڈھا دے تاکہ سماج کا ہر فرد ایک دوسرے کو اپنا سمجھ سکے، ایک دوسرے کے درد کو اپنا درد محسوس کرے۔ آج کا افسانہ منظر نگاری سے زیادہ واقعات نگاری پر زور دیتا ہے تاکہ مسائل کا حل تلاش کیا جا سکے۔ معاصر اردو افسانہ انہی تمام باتوں کا متقاضی ہے۔ مغربی بنگال کی سرزمین نے ہمیشہ ملک کے اتحاد کی بات کی ہے یہاں کے افسانہ نگاروں نے ہمیشہ ایسے افسانے کی تخلیق کی ہے جس سے نفرت کی دیوار مسمار ہوئی ہے۔

مختصر یہ کہ معاصر اردو افسانہ اپنے انداز میں خوب سے خوب تر کی رفتار سے آگے بڑھ رہا ہے۔ انسانی مسائل، سماجی مسائل، ڈیجیٹلائز ورلڈ کی برق رفتاری، انسانوں کی بے سمت پرواز، اخلاقی قدروں کا گرتا معیار، ہندوستانی تہذیب کا نکلتا جنازہ کے علاوہ قومی شناخت کے مسئلے کو بھی اجاگر کرتا ہے جس سے سماج میں کافی اتار چڑھاؤ دیکھنے کو ملتا ہے۔ ان تمام موضوعات کے اظہار میں معاصر اردو افسانہ اعتدال رویے مثبت رجحان کے ساتھ آگے بڑھ رہا ہے اور آنے والی نسلوں پر اس کی ذمے داری دیے جا رہا ہے جو ناممکن تو نہیں لیکن مشکل ضرور ہے اور چنوتی بھرا بھی ہے۔

■

Dr. Mohd Ali Husain Shaiq
Kashan-e-Mustafa
Gali No.: 3, Kamra No.: 1/2
Post: Jagtdal
Distt.: 24 Pargana (Shimal) - 743125(W.B)

تمل ناڈو میں اردو افسانہ

اسانغنی مشتاق رفیقی

تمل ناڈو میں اردو زبان کی تاریخ پانچ صدیوں پر محیط ہے، نثر نگاری کے ابتدائی نمونے سترہویں صدی میں مل جاتے ہیں، لیکن افسانہ نگاری کی شروعات بیسویں صدی کے نصف بعد ہی ہوئی ہے۔ بہ نسبت شاعری کے افسانہ نگاری کی طرف تمل ناڈو کے مشاہیر ادب کی توجہ ایک عرصے تک نہ ہونے کے برابر رہی۔ شروعاتی دور میں یہاں جو افسانے لکھے گئے ان میں سطحی رومانیت کا عنصر غالب رہا پھر دھیرے دھیرے اس روش میں تبدیلی آئی۔ اعلیٰ درجے کی رومانیت کے ساتھ حقیقت نگاری کا رجحان بڑھتا گیا اور یہ سفر ہنوز جاری ہے۔

تمل ناڈو سے وابستہ جن افسانہ نگاروں نے عالمی پہچان بنائی ان میں پہلا نام حجاب امتیاز علی کا آتا ہے۔ علیم صبا نویدی نے اپنے ایک تحقیقی مضمون میں حجاب امتیاز علی کی پیدائش 1907 شہر وانم باڑی بتائی ہے۔ حجاب کی پیدائش کے بعد اُن کے والد کو حیدرآباد میں ملازمت مل گئی اور وہ اہل وعیال کے ساتھ وانم باڑی سے حیدرآباد منتقل ہو گئے۔ اُنہی دنوں حیدرآباد میں طاعون پھیلا تو انھوں نے بیگم اور بچوں کو مدراس بھیج دیا۔ حجاب کی والدہ عباسی بیگم اپنے دور کی ایک نامور اہل قلم خاتون تھیں، ان کا انتقال شہر وانم باڑی میں ہوا اور وہ یہیں مدفون ہوئیں۔ حجاب امتیاز علی تقسیم کے بعد پاکستان منتقل ہو گئیں۔ اردو کی فکشن نگار خواتین میں حجاب کا نام صف اول میں لیا جاتا ہے، اُن کے افسانوں میں رومانیت کا عنصر زیادہ ہے، بقول سجاد حیدر یلدرم ''حجاب کے تخیل نے ایک نئی دنیا خلق کی ہے اور اس دنیا میں ایک نئی اور نہایت دلکش مخلوق آباد کی ہے۔ یہ دنیا جس میں ہم اور آپ رہتے ہیں اس سے علیحدہ ہے، گو اُس سے ملتی جلتی ہے اور جو لوگ اس دنیا میں آباد ہیں وہ ہم سے مشابہ تو ضرور ہیں مگر بالکل ہماری طرح نہیں ہیں۔'' (حجاب امتیاز علی، آزاد دائرۃ المعارف وکیپیڈیا)

حجاب امتیاز علی کے بعد تمل ناڈو سے وابستہ کسی ادیب نے اگر اپنی الگ پہچان بنائی ہے تو وہ علیم صبا نویدی ہیں۔ ایک کامیاب ادیب، شاعر اور نقاد ہی نہیں شعر و نثر کی ہر صنف پر مکمل دسترس رکھنے والی تمل ناڈو کی شخصیت۔ بحیثیت افسانہ نگار علیم صبا نویدی کی پہچان 1967 میں ہوئی جب ان کا پہلا افسانوی مجموعہ ''روشنی کے بھنور میں'' جس میں زیادہ تر روایتی انداز میں لکھے گئے افسانے تھے، شائع ہوا۔ اس کے بعد علیم صبا نویدی کی فکر میں واضح تبدیلی آتی گئی اور وہ ایک جدید لب و لہجے کے علامتی اور تجریدی انداز کے ساتھ باغی افسانہ نگار کی حیثیت سے اپنی پہچان منوانے میں کامیاب رہے۔ منٹو، عصمت اور وہی وہانوی کے طرز پر علیم صبا نویدی کے افسانوں میں بھی جنسی مسائل اور جنسی تلذذ کا اظہار بڑی بے باکی سے ملتا ہے۔

تمل ناڈو میں حجاب امتیاز علی اور علیم صبا نویدی کے علاوہ بیسویں صدی کے نصف آخر اور اکیسویں صدی کے اوائل میں افسانہ نگاروں کی ایک طویل فہرست سامنے آتی ہے۔ جن کے یہاں روایتی اور سطحی رومانیت پائی جاتی ہے۔ صرف چند ہی ممتاز افسانہ نگار ایسے ہیں جن کے یہاں اعلیٰ رومانیت کے ساتھ ساتھ حقیقت نگاری کا عنصر بھی پایا جاتا ہے، ان میں سرفہرست شروعاتی دور میں شاکر نائطی، ارشد حیدری، حبیب خان سروش، ریاض جنیدی، سید موسیٰ کلیم یداللہی، دوسرے دور میں محمد حبیب اللہ، مصباح الزماں، محمد عباس، شاہ ضیاء میر، خورشید حسن نقوی، حبیب اللہ باشاہ، سید امان اللہ عباسی، علی اکبر آمبوری، تیسرے دور میں ادیب بھارتی، فرحت کیفی، راجی صدیقی، راز امتیاز، نورس خیامی، ایس ایم حیات، دانش فرازی، انور ربانی، عابد صفی، مہر طلعت آمبوری، رشید احمد فاروقی، عزیز تمنائی، رشید مدراسی، ساحل رشید، فیضی صدیقی کے نام آتے ہیں۔

1960 کے بعد افسانہ نگاروں کی ایک نئی پود منظر عام پر آئی جن میں فضل جاوید، حسن فیاض، نکہت اقبال، وہاب نازش، صلاح الدین برق، علیم صبا نویدی، نثار احمد ریحان، سہیل عرفان، اعجاز شاکری، ظہیر آفاق، کاظم نائطی، فخر اعجاز، عبداللطیف نازی، فیاض حسین، احمد علی اعجاز، متین ہوش، میر مومن علی، جہاں آرا، فاطمہ رئیس، نذیر احمد مشعل، منیر احمد نیازی قابل ذکر ہیں۔ اس کے بعد ساتویں اور آٹھویں دہائی میں افسانہ نگار کے طور پر قبولیت پانے والوں میں محمد یعقوب اسلم، انور کمال، ڈاکٹر جلال عرفان، وی رحمت اللہ، مختار بدری، اکبر زاہد، شعیب احمد کاف، امین الماس، امیر النساء، شاکر قدسی، شاذیہ مسرور، نسرین جمیل، منور رشید، صبا مصطفےٰ، حوا ما رشیدی، نگار سلطانہ جلیلی، عرفانہ تزئین شبنم، نزہت نازنین، شاذیہ نازنین، غزالہ پروین بڑی اہمیت کی حامل ہیں۔ موجودہ دور میں افسانہ نگاروں کے اس کارواں میں جو نئے نام شامل ہوئے ہیں ان میں محمد جان وفا اعظمی، فرحت جبین، غیض الدین، اشفاق اسانغنی، ایم این عبداللہ باشاہ، مدورے منیر، ڈاکٹر طیب خرادی اور خاکسار کے نام قابل ذکر ہیں۔ ان میں سے اکثر کے لکھے ہوئے افسانے ملک کے معتبر ادبی رسالوں میں چھپتے رہے ہیں۔

ڈاکٹر عابد صفی، تمل ناڈو کے افسانوی ادب میں ایک خاص مقام رکھتے ہیں۔ ان کے لکھے افسانے ملک کے معتبر جرائد میں شائع ہوتے رہے ہیں۔ ہلکی سی رومانیت لیے ان کے افسانے سطحیت سے ماورا ہوتے ہیں۔ کہانیوں کو پیکر نگاری اور منظر کشی کے ذریعے دلچسپ بنانا انھیں خوب آتا ہے۔ ڈاکٹر جلال عرفان ان پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں، ''آپ تمل ناڈو کے نمائندہ افسانہ نگار ہیں، ابتدائی دور کے افسانوں میں ترقی پسندی کا رنگ غالب تھا۔ لیکن آگے چل کر موضوعات میں وسعت اور تنوع پیدا ہو گیا۔ مجروح انسانی جذبات کی عکاسی اور نفسیاتی مسائل کی پیش کش بڑے موثر اور دلکش انداز میں کرتے ہیں۔''

(تملناڈو میں اردو افسانے کا ارتقا: ڈاکٹر عابد صفی، مشعل وانم باڑی شمارہ 43 ص 49) بقول ڈاکٹر سجاد حسین، ''عابد صفی کی بہترین کہانیاں صنف نازک کی نفسیات اور مسائل کی ترجمان ہیں۔ ان کا مشاہدہ گہرا اور احساس نہایت تیز ہے۔ اس لیے وہ کسی بھی چیز کی تصویر کشی میں باریک بینی سے کام لے کر اس کے خد و خال روشن کر دیتے ہیں۔''

(شہر مدراس میں اردو افسانہ نگاری: ڈاکٹر سید سجاد حسین، مشعل وانم باڑی شمارہ 43، ص 40)

محمد یعقوب اسلم کے افسانوں کا مجموعہ 'چہروں کی دیوار' تمل ناڈو کے افسانوی ادب میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ اس میں کل دس افسانے ہیں اور یہ 1986 میں شائع ہوا۔ روایتی اسلوب میں حقیقت نگاری، بے ساختہ پن، فکر کی بلندی، قدروں کی منظر کشی، اُن کے افسانوں کا طرہ امتیاز ہے۔ بقول ڈاکٹر عزیز تمنائی ''ایک اچھا افسانہ نگار روزمرہ کے مشاہدات کو کہانی کا روپ دیتا ہے۔ خلوص اور سچائی کے زیورات سے آراستہ کرتا ہے اور سطحی رنگ آمیزیوں سے انھیں پاک صاف رکھتا ہے۔ یہ ساری خوبیاں یعقوب اسلم کے افسانوں میں یک جا ہو گئی ہیں۔''

(چہروں کی دیوار، افسانوں کا مجموعہ: محمد یعقوب اسلم)

مختار بدری، تمل ناڈو میں اردو زبان و ادب کے خاموش اور پُر خلوص خدمت گاروں میں ایک نمایاں نام

ہے۔ تمل اور اردو زبان وادب پر یکساں قدرت ومہارت کے حامل کئی کتابوں کے مصنف مختار بدری نے اردو زبان کے کئی معروف ادیبوں کی تخلیقات کا تمل زبان میں ترجمہ کرا کے انھیں تمل دنیا سے متعارف کرایا ہے۔ اردو تمل، تمل اردو ڈکشنری آپ کا بہت بڑا کارنامہ ہے۔ بحیثیت افسانہ نگار مختار بدری ایک منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ بیک وقت ترقی پسند اور روایتی فکر سے متاثر آپ کے افسانے سادگی اور حقیقت نگاری سے مرصع ہوتے ہیں۔ لفظوں کو برتنے کا فن آپ کو خوب آتا ہے، بقول علیم صبا نویدی، ''مختار بدری کے یہاں اکثر اوقات الفاظ کی شان وشوکت اور ان کا جاہ وجلال بھی بہت مزہ دے جاتا ہے اور بڑی دیر تک سماعت میں ایک حسین گونج قائم رہتی ہے۔ الفاظ کی یہ گہما گہمی انھیں روایت کے بالکل قریب لے جاتی ہے۔'' (روشن چہرے۔ علیم صبا نویدی ص 148)

صبا مصطفی، مدراس کی افسانہ نگار خاتون ہیں جنھوں نے بطور فن صنف افسانہ اختیار کیا۔ انھوں نے اپنے افسانوں میں عورتوں کی نفسیات اور مصیبت زدہ پریشان حال مسلم گھرانوں کے مسائل کو بڑی شائستگی کے ساتھ صاف اور سلیس زبان میں پیش کیا ہے۔ اپنا نقطۂ نظر قاری تک، اُسے الفاظ کی بھول بھلیوں میں بھٹکائے بغیر عام فہم انداز میں کامیابی کے ساتھ پہنچاتی ہیں۔ روایت کی پاسداری اور اصلاحی پہلو اُن کے افسانوں میں بڑی اہمیت رکھتے ہیں۔

علی اکبر آمبوری کا شمار تمل ناڈو کے صف اول کے افسانہ نگاروں میں ہوتا ہے۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ 'برف سی اجلی' 1965 میں شائع ہوا۔ انسانی نفسیات کا گہرا مشاہدہ اور بلند تخیل کے ساتھ آپ بیتی کو جگ بیتی بنا کر اپنے ماحول اور معاشرے کو افسانوں میں پیش کرنے کی کوشش ان کی پہچان ہے۔ قاضی حبیب ان کے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''علی اکبر اپنے افسانوں کے لیے خام مواد اپنے اطراف سے حاصل کرتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ اُن کے افسانوں میں جنوبی ہند کے لوگوں کی تہذیب اور نفسیات کی گہری چھاپ موجود ہے۔''
(آمبور اور پرنامبٹ میں افسانہ نگاری: قاضی حبیب احمد، مشعل وانم باڑی شمارہ 43، ص 30)

امیر النساء، جن کا تعلق ایک سرمایہ دار روایتی گھرانے سے ہے، حقیقت نگاری اور عورت کو موضوع بنا کر اصلاحی افسانہ نویسی میں اپنا ایک خاص مقام رکھتی ہیں۔ ان کی زبان عام فہم اور تصنع سے پاک ہونے کے باوجود مشاہدات کی گہرائی سے آراستہ ہے۔ اخلاق اور مذہب ان کے افسانوں میں بنیادی حیثیت رکھتے ہیں۔ 'بند عورت' ان کے افسانوں کا مجموعہ ہے جس میں کل پندرہ افسانے ہیں۔

مہر طلعت، مقصدی ادب کی تخلیق کا رجحان رکھنے والی ایسی افسانہ نگار ہیں جن کے افسانوں میں حقیقت نگاری اور کردار سازی کمال کو پہنچی ہوئی ہوتی ہے۔ فطری مکالمے، کرداروں کی حقیقت پسندی، صاف ستھری عبارت، مربوط جملے ان کے افسانوں کی دیگر خصوصیات ہیں۔ ان کے لکھے افسانے خواتین کے رسالوں میں کثرت سے چھپتے رہے ہیں۔ ڈاکٹر عابد صفی ان کے افسانوں پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں ''مہر طلعت کے افسانوں کی فضا بڑی دلکش اور انداز بیان بڑا دل فریب ہوتا ہے۔ ان کے افسانے زیادہ تر رومانی ماحول میں سانس لیتے اور سماجی پہلوؤں کے اردگرد چکر لگاتے ملتے ہیں۔''
(تمل ناڈو میں اردو افسانے کا ارتقا: ڈاکٹر عابد صفی، مشعل وانم باڑی شمارہ 43 ص 49)

شعیب احمد کاف، تمل ناڈو کے جواں مرگ افسانہ نگار جنھوں نے مختصر عرصے میں ایسے شہ پارے تخلیق کیے کہ ایک دنیا اُن کی گرویدہ ہو گئی۔ شعیب احمد کاف، وانمباڑی میں 1955 میں پیدا ہوئے۔ 1982 سے انھوں نے لکھنا شروع کیا، ایک اندازے کے مطابق سو کے قریب افسانے لکھے، 1991 میں ان کا انتقال ہوگیا۔ اس حساب سے ان کی ادبی زندگی آٹھ نو سال کی رہی۔ ان کے افسانوں کا مجموعہ 'حق تو یہ ہے' ان کی وفات کے بعد ان کی اہلیہ نے 1992 میں شائع کیا۔ شعیب احمد کاف کے افسانوں میں اصلاحی پہلو سب سے نمایاں ہے، ان کے افسانوں کی زبان صاف اور شستہ، ان کا اسلوب منفرد، ان کا بیانیہ تاثیر سے پُر ہوتا ہے۔ ڈاکٹر حیات افتخار اُن کے متعلق لکھتے ہیں'' سماج کے ایک ذمہ دار اور حساس فرد کی حیثیت اپنے اردگرد کی معاشرت کی سچی تصویر پیش کی ہے اور ایک سچے فنکار کی طرح اپنے نقطۂ نظر کو عام طور پر بالواسطہ نہیں بلکہ باواسطہ طور پر پیش کیا ہے۔''

انور کمال تمل ناڈو کے ایسے افسانہ نگار ہیں جنھوں نے اپنے فن کے اظہار کے لیے علامتی طرز نگارش اختیار کی۔ ابتدائی دور میں سماجی مسئلوں کو موضوع بنا کر لکھے چند افسانوں کے بعد انھوں نے اپنی پوری توجہ علامتی افسانہ نگاری کی طرف پھیر لی۔ زبان وبیان پر مکمل گرفت اور تہہ داری لیے ان کے افسانے سحر پیدا کر دیتے ہیں۔ ڈاکٹر جلال عرفان اُن کے افسانوں کا تجزیہ کرتے ہوئے لکھتے ہیں''انور کمال کے علامتی افسانوں میں ایک دیو مالائی فضا ملتی ہے۔ دھندلے اور نیم خوابیدہ جہانوں کی غیر یقینی کیفیت اور کسک ملتی ہے۔ رہ گم کردگان کے بے نتیجہ اور لامتناہی سفر کی تھکن ملتی ہے۔ علامتی انداز نگارش نے انور کمال کے افسانوں میں ایک ایسی تہہ داری پیدا کر دی ہے جو اشعار غالب کا وصف ہے۔''
(انور کمال کا تخلیقی سفر: ڈاکٹر جلال عرفان، مشعل وانم باڑی شمارہ 32 ص 15)

اکبر زاہد منفرد اسلوب میں جذبات ومحسوسات کو وضاحت کے ساتھ پیش کرنے کا فن رکھتے ہیں۔ ان کے افسانوں میں علامتی فضا اور حقیقت نگاری ساتھ ساتھ چلتی ہے۔ اُن کا کمال یہ ہے کہ جانے پہچانے کردار تراش کر قاری کو اپنائیت کا احساس دلاتے ہوئے اُسے خود بھی اپنی کہانی کا ایک کردار بنا لیتے ہیں۔ وہ معاشرے کو آئینہ تو دکھاتے ہیں لیکن اصلاح کے نام پر اپنے افکار ونظریات اس پر تھوپنے کی کوشش نہیں کرتے۔ بقول ڈاکٹر جلال عرفان'' اکبر زاہد افسانے میں وعظ ونصیحت بالکل نہیں کرتے مگر افسانے کی تاثیر ایسی ہوتی ہے کہ قاری کا سارا وجود احساس کے شعلوں کی لپیٹ میں سما جاتا ہے اور اس کا نفس پاک ہونے لگتا ہے۔'' (ایک نیزہ اونچا آسمان، افسانوں کا مجموعہ: اکبر زاہد، ص 21)، افسانوں پر مشتمل ان کے افسانوں کا مجموعہ 'ایک نیزہ اونچا آسمان' اپریل 1997 میں شائع ہوا۔

عرفانہ تزئین شبنم کا تعلق ایک مذہبی گھرانے سے ہے، ان کے والد ایک عالم دین اور کثیر المطالعہ شخصیت تھے، جن کی تربیت کی بازگشت ان کے لکھے افسانوں میں جا بجا سنائی دیتی ہے۔ بوجھل لفظوں سے پاک عام فہم زبان، رواں اسلوب، ان کے نگارشات کی پہچان ہے۔ انسانی زندگی کی الجھنیں اور نفسیاتی پیچیدگیاں ان کے افسانوں کا موضوع ہوتے ہیں۔ عرفانہ تزئین شبنم کے افسانوں کے دو مجموعے شائع ہو چکے ہیں، پہلا مجموعہ 'جائے پناہ' جس میں 16 افسانے ہیں، 1999 اپریل میں شائع ہوا، دوسرا مجموعہ 'شہر تخیل' جس میں دس افسانے ہیں نومبر 2007 میں شائع ہوا۔

تمل ناڈو کے اکثر افسانہ نگاروں کی تخلیقات میں وعظ ونصیحت کا رنگ غالب رہتا ہے۔ قاری کے ذہنوں پر یہ تخلیقات کوئی دیرپا اثر مرتب نہیں کر پاتیں۔ حالات کے بدلتے ہوئے منظرنامے میں امید کی جانی چاہیے کہ یہ جمود ٹوٹے گا اور یہاں سے ایسے فنکار ابھریں گے جو عالمی سطح پر اردو ادب میں اپنی کوئی منفرد پہچان بنا سکیں۔

اس مضمون کی تیاری میں درج ذیل کتابوں سے مدد لی گئی:

1. تمل ناڈو کے مشاہیر ادب از علیم صبا نویدی، فروری 1999
2. مدراس میں اردو مرتبہ ڈاکٹر جلال عرفان، دسمبر 1992
3. مٹی کی خوشبو (سوانحی اور تعارفی خاکے) از محمد یعقوب اسلم، نومبر 2010
4. چہروں کی دیوار از محمد یعقوب اسلم، 1986
5. اُجلی مسکراہٹ از علیم صبا نویدی مرتب پروفیسر عابد صفی، مئی 2020
6. ایک نیزہ اونچا آسمان از اکبر زاہد، اپریل 1997
7. شہر تخیل از عرفانہ تزئین شبنم، نومبر 2007
8. مشعل (اسلامیہ کالج، وانم باڑی) شمارہ 32 اور 43
9. میرا مطالعہ (تبصرے اور مضامین) از علیم صبا نویدی، دسمبر 2018

■

Asangani Mushtaq Ahmed
9/258, 2nd Street Basheerabad
Vaniyambadi - 635751, Tirupattur, (Tamilnadu)
Mob.: 989404606
Email.: asanganimushtaq@gmail.com

اردو میں افسانچہ نگاری کا تحقیقی و تنقیدی جائزہ

فردوس احمد بھٹ

اردو فکشن کی ایک نوزائیدہ اور جدید صنف 'افسانچہ' ہے۔ افسانچہ، کہانی کی مختصر ترین اور جدید ترین صورت ہے۔ اسے 'منی افسانہ' اور 'منی کہانی' بھی کہتے ہیں۔ افسانچہ دراصل افسانے کی ہیئت میں تبدیلی کا تجربہ ہے۔ جس طرح ناول سے ناولچہ نکلا اسی طرح افسانے کے بطن سے افسانچے نے جنم لیا۔ آج تک اس کی کوئی جامع تعریف متعین نہیں ہوسکی ہے۔ اردو کے ممتاز افسانہ نگار پروفیسر بیگ احساس نے افسانچے کی تعریف اور فن کے لیے چند عناصر اور شرائط کا ہونا ضروری قرار دیا۔ افسانچہ کے اجزائے ترکیبی کے بارے میں اپنے خیال کا اظہار کرتے ہوئے لکھتے ہیں:

''منی افسانہ... میں تخلیقیت پہلی شرط ہونی چاہیے۔ دوسرے، منی افسانہ ایک تکمیلیت کا احساس دے۔ منی افسانے کا، اختتام پر کوئی تاثر ابھر کر سامنے آئے.. منی افسانہ نگار کو اس بات کا خیال رکھنا چاہیے کہ موضوع طاقتور ہو، پیش کش اور اختتام موثر ہو، اور اس چھوٹی صنف میں کہیں نہ کہیں نقطۂ عروج بھی ہو۔ منی افسانے میں کسی ماجرا کا ہونا بے حد ضروری ہے۔''

(اردو میں منی افسانہ، آمنہ آفرین ،ص 8)

ڈاکٹر عظیم راہی نے اردو میں پہلی بار اس صنف پر تحقیقی و تنقیدی کام انجام دیا۔ انھوں نے پہلی بار افسانچہ کو اردو میں موضوع بحث بنایا اور اس کے تاریخی اور فنی پہلوؤں کو اجاگر کیا۔ اُن کے مطابق کم لفظوں او رکم سطروں میں کہانی بیان کرنا افسانچہ ہے۔ وہ لکھتے ہیں:

''افسانچہ ادب کی وہ نثری صنف ہے جس میں کم سے کم لفظوں میں کم سے کم سطروں میں ایک طویل کہانی مکمل کرلیں۔ افسانچہ زندگی کے کسی چھوٹے سے لمحے کی تصویر دکھا کر ایک مکمل کہانی قاری کے ذہن میں شروع کر دینے کا نام ہے۔'' (اردو میں افسانچے کی روایت، عظیم راہی ،ص 59)

اس صنف کو اکثر لکھنے والوں نے مختلف ناموں سے لکھا ہے۔ مثلاً مختصر افسانہ' منی کہانی' منی افسانہ' مختصر ترین افسانہ اور افسانچہ وغیرہ۔ لیکن اس نئی نثری صنف نے 'افسانچہ' کے نام سے اپنی صنفی شناخت اردو ادب میں تسلیم کرالی ہے۔ ممتاز فکشن نگار جوگندر پال کی کوششوں کے بعد اس صنف کو 'افسانچہ' جیسا دلکش ،خوبصورت اور اردو مزاج کے مطابق یہ اصطلاح عطا ہوئی۔ انھوں نے کہا جب اردو زبان میں لفظ افسانچہ اس نئی صنف کے لیے موجود ہے تو کسی غیر زبان کا لفظ (منی، mini) کیوں استعمال کریں۔ اسی نام سے اب افسانچہ نگار اپنے افسانچے تحریر کرتے ہیں۔ اردو ادب میں یہ ایک نئے تجربے کے طور پر وجود میں آنے والی صنف ہے۔ اس صنف کا پچھلی کچھ دہائیوں سے اردو ادب میں تجربہ ہو رہا ہے۔ 1947 کی جنگِ آزادی کے دوران سعادت حسن منٹو نے پہلی بار منی افسانے کا تجربہ کیا ہے۔ بعد میں افسانہ نگاروں نے اس صنف کی طرف توجہ کی اور اس نئی صنف کو وقار اور اعتبار بخشا۔ اکثر قلم کاروں کی رائے یہی ہے کہ یہ صنف مختصر افسانے کے بطن سے نکلی ہوئی صنف ہے یا افسانے کے ہیئت کی تبدیلی میں وجود میں آنے والی صنف ہے۔ کچھ ناقدین کا کہنا ہے کہ یہ مشینی یا صنعتی دور کی وجہ سے وجود میں آئی صنف ہے۔ کیونکہ دورِ حاضر کے انسان کے پاس اب اتنا وقت ہی نہیں ہے کہ وہ طویل کہانیوں کو پڑھے۔

اردو ادب میں دوسری اصناف کے مقابلے میں افسانے کی عمر بہت کم ہے۔ لیکن تمام اصنافِ ادب میں افسانہ ہی واحد صنف ہے جس نے ہر اعتبار سے ترقی کی ہے اور شاعری کے مدمقابل کھڑے ہونے میں کامیاب ہوا ہے۔ ترقی پسند تحریک کا دور اردو افسانے کا سنہرا دور بھی کہلایا اور پھر جب جدید افسانے کا دور شروع ہوا تو علامتی' تجریدی اور تمثیلی افسانے لکھے گئے جو خاص طور پر تکنیک اور ہیئت کے اعتبار سے بے حد کامیاب رہے جبکہ غزل ہیئت کے تجربوں کی زد میں آکر آزاد غزل کی شکل میں بُری طرح ناکام رہی۔ لیکن افسانہ طویل مختصر افسانے سے مختصر افسانہ بن کر نہ صرف کامیاب رہا بلکہ اب مسلسل پچھلی چند دہائیوں سے مختصر ترین افسانہ یعنی منی افسانہ یا افسانچہ کے نام سے ہیئت کی تبدیلی کا بین ثبوت بن کر' ایک صنف کی حیثیت سے تسلیم کرلیا گیا ہے۔ افسانے کی ہیئت میں تبدیلی کو افسانچے کا تجربہ قرار دیتے ہوئے ڈاکٹر عصمت جاوید لکھتے ہیں:

''جہاں تک فکشن کا تعلق ہے کہانی کو لیجیے تو وہ مختلف ہیئتوں میں ہمارے سامنے آتی رہی ہے جہاں تک مختصر افسانے کا تعلق ہے تو وہ لمبائی میں کبھی طویل مختصر افسانہ بن کر ناولٹ میں ضم ہوگیا تو کبھی طویل مختصر افسانہ بنا ناولٹ سے الگ اپنی شناخت قائم رکھی۔ کم ہونے کی طرف مائل ہوا تو افسانچہ بنا۔'' (ایضاً،ص 67)

کہانی نے گزرتے ہوئے ایام کے ساتھ اپنا روپ بھی تبدیل کیا ہے۔ ایک زمانے میں داستان بن کر محظوظ کیا اور کبھی ناول اور افسانے کے ذریعے زندگی کی حقیقت کو سمجھایا۔ اب ان طویل کہانیوں کا افسانچہ کے خول میں سمٹ جانا وقت کا تقاضا ہے۔ اس سلسلے میں نثار اعظمی رقم طراز ہے:

''جس طرح داستانوں کے بعد ناول' ناول کے بعد مختصر افسانہ وقت کی ضرورت ثابت ہوئے اسی طرح منی افسانہ بھی افسانہ کے بعد موجودہ دور میں زندگی کی ایک ضرورت اور حقیقت کی حیثیت رکھتا ہے۔''

(رسالہ ادیب، جلد 1، شمارہ 10)

افسانچہ لکھنا ایک مشکل فن ہے کوئی کہتا ہے کہ یہ چاول کے دانے پر قل ھواللہ لکھنے کا فن ہے اور بعض کہتے

ہیں کہ یہ تلوار کی دھار پر ننگے پاؤں چلنے کے مترادف ہے۔ افسانچہ نگار کی ذرا سی لغزش اسے خبر یا لطیفے میں تبدیل کر دیتی ہے۔ عظیم راہی بھی افسانچے کی صنف کو مشکل فن مانتے ہیں۔ ان کے مطابق افسانچے میں مزاح کو رد کرتے ہوئے طنز برقرار رکھنا پڑتا ہے ورنہ افسانچہ لطیفہ بن جاتا ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

''افسانچہ ایک نہایت ہی مشکل صنف ادب ہے۔ جس میں مزاح کو رد کرتے ہوئے طنز کو برقرار رکھنا پڑتا ہے۔ اگر اس میں مزاح شامل ہوجائے تو وہ لطیفہ بن جاتا ہے۔'' (روزنامہ اردو ٹائمز، ممبئی 22، نومبر 2011،ص 10-8)

افسانچے کا المیہ یہ رہا ہے کہ چند بڑے افسانہ نگاروں مثلاً سعادت حسن منٹو، رتن سنگھ، جوگیندر پال وغیرہ کو چھوڑ کر کسی نے بھی اس نئی صنف میں طبع آزمائی نہیں کی۔ دوسری طرف اردو کے معتبر نقادوں نے افسانچہ کو بطور صنف ماننے سے انکار کیا۔ اسے لطیفہ، چٹکلہ اور حکایت کے اصناف کے قریب ٹھہرایا جن میں محمد حسن عسکری، ممتاز حسین، خلیل الرحمٰن اعظمی، شمس الرحمٰن فاروقی

افسانچہ لکھنا ایک مشکل فن ہے کوئی کہتا ہے کہ یہ چاول کے دانے پر قل ھو اللہ لکھنے کا فن ہے اور بعض کہتے ہیں کہ یہ تلوار کی دھار پر ننگے پاؤں چلنے کے مترادف ہے۔ افسانچہ نگار کی ذراسی لغزش اسے خبر یا لطیفے میں تبدیل کر دیتی ہے۔ عظیم راہی بھی افسانچے کی صنف کو مشکل فن مانتے ہیں۔ ان کے مطابق افسانچے میں مزاح کو رد کرتے ہوئے طنز برقرار رکھنا پڑتا ہے ورنہ افسانچہ لطیفہ بن جاتا ہے۔

وغیرہ شامل ہیں، اور سچ بھی ہے کہ ایسے بھی افسانچے لکھے گئے جن کی سرحد لطیفہ اور حکایت کی اصناف سے جا ملی۔ کیونکہ اس کے فن کو آسان سمجھ کر لکھنا شروع کیا۔ جب کہ افسانچہ کا فن ذہن و دل کو جھنجھوڑتا ہے۔ اپنے چھوٹے چھوٹے اور آدھے ادھورے جملوں سے قاری کو غور وفکر کا عادی بناتا ہے۔ ہنسنا ہنسانا اس کا کام نہیں بلکہ فکر کو مہمیز لگانا اس کا کام ہے۔ اور قاری کی سوئی ہوئی فکر کو جگانا اس کے فن کی خوبی ہے۔ جس سے اس صنف کو اردو میں اپنی صنفی شناخت تسلیم کروانے میں بہت وقت لگا۔

اردو میں افسانچے کی تاریخ پر نظر ڈالیں تو برصغیر کے مشہور و معروف اور بیباک افسانہ نگار سعادت حسن منٹو اردو میں اس صنف کے بنیاد گزار مانے جاتے ہیں۔ اردو میں افسانچوں کے مجموعے جتنے بھی منظر عام پر آئے ہیں۔ ان کی روشنی میں یہ نتیجہ اخذ کیا جاسکتا ہے کہ اردو میں افسانچے کا آغاز منٹو نے ہی کیا ہے۔ منٹو نے سب سے پہلے 'سیاہ حاشیے' کے عنواں سے مختصر ترین افسانے لکھ کر اس صنف کی بنیاد ڈالی۔ 'سیاہ حاشیے' منٹو کے افسانچوں کا مجموعہ ہے۔ یہ مجموعہ 1948 میں شائع ہوا تھا۔ 'سیاہ حاشیے' کا پہلا افسانچہ 'ساعتِ شیریں' کے نام سے ملتا ہے۔

اس ضمن میں معروف ناقد اور ادیب و شاعر ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی رائے بھی اہم ہے۔ وہ رقمطراز ہیں:

''افسانچوں کی تاریخ پر نظر ڈالی جائے تو یہ صنف خلیل جبران سے شروع ہوتی ہے۔ اردو میں باضابطہ طور پر اس کی روایت منٹو سے شروع ہوتی ہے۔ منٹو کے بعد جوگیندر پال نے اس صنف کی طرف خصوصی توجہ دی ہے۔'' (قوس قزح، مناظر عاشق ہرگانوی، ص 4)

سید محمد عقیل بھی منٹو کو افسانچے کا موجد مانتے ہیں۔ وہ لکھتے ہیں:

''بیسویں صدی میں نئی چھوٹی کہانیاں مجموعی طور پر سب سے پہلے منٹو نے شروع کیں جو جدید زندگی خصوصاً تقسیم ہند کے فسادات سے متعلق تھیں۔''

(اردو میں افسانچہ کی روایت، عظیم راہی، ص 37)

جدید فکشن نقاد پروفیسر مجید مضمر بھی منٹو کی مختصر کہانیوں کے مجموعے 'سیاہ حاشیے' کے تعلق سے کہتے کہ یہ اپنی قسم کا پہلا اور اہم مجموعہ ہے۔ وہ رقم طراز ہیں:

''سعادت حسن منٹو کے مختصر ترین افسانوں کا مجموعہ 'سیاہ حاشیے' اپنی نوعیت کا پہلا اور اہم مجموعہ ہے۔ اس کے تمام مشمولات فسادات کے موضوع سے متعلق ہیں۔ محمد حسن عسکری نے ان افسانچوں کو ''انسانی دستاویز'' سے تعبیر کیا ہے۔'' (مجید مضمر، اردو کا علامتی افسانہ، ص 70)

اس طرح ناقدین کی رائے اور صحت مند حوالوں سے یہ بات ثابت ہوجاتی ہے کہ اردو میں افسانچے کا موجد منٹو ہی قرار پاتے ہیں۔ 'سیاہ حاشیے' کا دیباچہ 'حاشیہ آرائی' کے عنوان سے محمد حسن عسکری نے تحریر کیا تھا۔ 'سیاہ حاشیے' میں جملہ 32 افسانچے شامل ہیں اور ہر افسانچے سے تقسیم ہند و پاک کے بعد جاری ہولناک فسادات کے منظر آنکھوں کے سامنے یوں گھومنے لگتے ہیں کہ اس بدترین تاریخ کی ہر تصویر زندہ ہوجاتی ہے۔ 'سیاہ حاشیے' میں سوری، رعایت، کرامات، کسرِ نفس، الہنا، جوتا، اشتراکیت، مناسب کاروائی، پیش بندی، صفائی پسند، ہمیشہ کی چھٹی وغیرہ قابلِ ذکر افسانچے ہیں۔

اردو افسانچوں کا پہلا انتخاب 'قوسِ قزح' تھا۔ یہ چار زبانوں اردو، ہندی، بنگلہ اور انگریزی میں ایک ساتھ شائع ہوا ہے۔ 'قوسِ قزح' کو مناظر عاشق ہرگانوی اور سوشوبھن سین گپتا نے مرتب کیا اور 1992 میں شائع کیا۔ 'قوسِ قزح' میں 20 افسانہ نگاروں کے 20 افسانچے شامل ہیں مثلاً منٹو (صفائی پسند)، خواجہ احمد عباس (جوگی)، جوگندر پال (سانپ)، رتن سنگھ (بلا عنوان)، رام لال (دوزخ سے واپسی)، الیاس احمد گدی (گھاؤ)، شمیم مظفر پوری (ایک پھوڑا اور)، عطیہ پروین (ماتم)، فاروق ارگلی (ثبوت)، بشیشر پردیپ (ڈرپوک)، افتخار ایلی (خیر خواہ)، مناظر عاشق ہرگانوی (آوارہ)، رضوان احمد (ایک ڈال کے پنچھی)، خسرو متین (بریک)، انجم عثمانی (پانچویں سمت)، سید احمد قادری (آگ)، بانو سرتاج (بڑے لوگ)، نینا جوگن (سچائی)، نوشاد عالم آزاد (''500*30=1500'')، سوشوبھن سین گپتا (بھائی) اس افسانچے کے انتخاب میں شامل ہیں۔ ڈاکٹر مناظر عاشق ہرگانوی کی افسانچہ دوستی دیکھیے ابھی حال ہی میں 2015 میں اور اس کے ایک سال بعد مرد اور خواتین قلم کاروں کے بالترتیب عالمی افسانچوں کے انتخاب بعنوان 'پرت در پرت' اور 'خواتین کے افسانچے (2016)' میں منظر عام پر لائے۔

افسانچے کی مقبولیت اور پذیرائی کا اندازہ اس بات سے بھی لگایا جاسکتا ہے کہ منی افسانہ کے مجموعوں کے ساتھ ساتھ اس صنف پر کئی خاص نمبر ملک گیر سطح پر شائع ہوئے۔ ان میں سب سے پہلے شائع ہونے والا ماہنامہ 'روبی' دہلی کا 'منی کہانی نمبر' (اپریل 1978) بڑی اہمیت کا حامل ہے جو انعامی مقابلے کے ساتھ شائع کیا گیا تھا جو اس رجحان کو بڑھانے میں کامیاب رہا۔ اس کے بعد اس قسم کے خصوصی نمبر نکلنے کا چلن عام ہوا۔ اخبارات کے ساتھ ساتھ رسائل و جرائد بھی اسے خوب چھاپنے لگے۔ رسالہ 'شاعر' نے کئی خاص نمبر اس صنف پر شائع کیے۔ کچھ سال قبل (جون 2012) میں اس رسالے کا افسانچہ نمبر آیا ہے۔

منٹو کے بعد صنف افسانچہ میں جوگیندر پال کا نام ایک خاص اہمیت کا حامل ہے۔ بقول نظام صدیقی ''جوگندر پال نے اعلیٰ سنجیدگی سے اس مختصر صنف کو اپنے بہترین تخلیقی لمحات ایک خاص تخلیقی رویہ اور برتاؤ کے ساتھ نذر کیے ہیں۔ افسانچہ کو باقاعدہ صنف کی شکل میں پیش کیا اور اس صنف کو 'افسانچہ' کا خوبصورت نام بھی عطا کیا۔

جوگندر پال نے اپنی بے پناہ تخلیقی صلاحیتوں کے باعث اسے خوب بارآور کیا اور بڑی جدت اور ندرت کے ساتھ اس صنف کو پروان چڑھانے میں اہم رول ادا کیا۔ ساتھ ہی نئی نسل کو اس سمت متوجہ کر کے ان کی مناسب حوصلہ افزائی بھی کی جس کے نتیجے میں آج کئی نئے لکھنے والوں نے اس صنف میں اپنا نام اور پہچان بنانے میں کامیابی حاصل کی۔ ہر چند انھوں نے منٹو کے مقابلے میں اس صنف کو شعوری طور پر فروغ دیا، تاہم افسانچے کی ایجاد کا سہرا منٹو ہی کے سر جانا چاہیے۔ کیونکہ زمانی اعتبار سے اس طرح کی صنف پہلے ہی وجود میں آچکی تھی بعد ازاں جوگندر پال نے اسے رواج دیا تھا۔ جوگیندر پال کے چار افسانچوں کے مجموعے شائع ہو چکے ہیں۔

جوگندر پال کے ابتدائی افسانچے ان کے افسانوی مجموعے 'میں کیوں سوچوں' میں ملتے ہیں جو 1962 میں شائع ہوا تھا اس کے بعد باقاعدہ ان کے افسانچوں کا پہلا مجموعہ 'سلوٹیں' 1975 میں منظر عام پر آیا جس میں 196 افسانچے شامل ہیں اسی سبب اکثر ناقدین جوگندر پال کو افسانچے کا خالق اور موجد قرار دیتے ہیں۔ اس کے بعد 'کتھا نگر' (1986) اور 'پرندے' (2000) شائع ہو چکے ہیں۔ جوگندر پال کے افسانچوں میں اسلوب و تکنیک کی جدّت کے ساتھ موضوعات کا زبردست تنوع ملتا ہے۔ خاص طور سے طبقاتی کشمکش، غریبی، ناداری، مشینی زندگی کے ہنگامے، نئی ٹکنالوجی کی ترقی سے پیدا ہوئے مسائل پر بڑے خوبصورت افسانچے ملتے ہیں۔

جوگندر پال کے بعد ان کے ہم عصروں میں اگر کسی نے سنجیدگی سے اس صنف کو برتا ہے تو وہ رتن سنگھ ہیں جنھوں نے افسانوں کے ساتھ افسانچے بھی خوب لکھے ہیں۔ ان کے افسانچوں کا مجموعہ 'مانک موتی' 1990 میں شائع ہوا جس میں 101 افسانچے شامل ہیں۔ رتن سنگھ کے افسانچوں میں کہانی پن کے ساتھ زندگی کے کئی رنگ ملتے ہیں جو اپنے اطراف کے ماحول سے عبارت ہیں۔

کرشن چندر، بیدی، خواجہ احمد عباس، الیاس احمد گدی، رام لعل، عطیہ پروین اور دیگر معتبر افسانہ نگاروں نے کبھی کبھار افسانچے ضرور لکھے ہیں لیکن مستقل طور پر اس صنف کو اپنی صلاحیتوں سے بارآور نہیں کیا۔

عظیم راہی افسانچہ نگاری کی تاریخ میں ایک اہم اور نمایاں مقام رکھتے ہیں۔ انھوں نے اس صنف پر تحقیقی کام بھی کیا ہے۔ ایم۔ مبین، عظیم راہی کے بارے میں فرماتے ہیں:

''عظیم راہی جس Commitment کے ساتھ منی افسانے لکھ رہے ہیں جب بھی اردو میں منی افسانوں کی تاریخ لکھی جائے گی۔ ان کے Contribution خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جائے گا۔''

(بحوالہ اردو میں منی افسانہ، آمنہ آفرین، ص 33)

عظیم راہی نے اس صنف کی طرف خاص توجہ کی ہے۔ آج بھی اس پر اپنی توجہ مرکوز کیے ہوئے ہیں۔ یہ اپنی تخلیقی زندگی کے آغاز ہی سے منی افسانے لکھتے رہے ہیں۔

عظیم راہی کا پہلا منی افسانوں کا مجموعہ 'پھول کے آنسو' کے نام سے اکتوبر 1987 میں شائع ہوا تھا۔ ہر افسانچہ زندگی کے مختلف پہلوؤں کو پیش کرتا ہے۔ اپنے اطراف کے حالات کی عکاسی ملتی ہے۔ ٹوٹتی قدروں اور تہذیب کی پامالی کا نوحہ اور مشینی زندگی کے نتیجے میں پیدا ہونے والی بے حسی ان کے منی افسانوں کے خاص موضوعات ہیں۔ ان کے افسانچوں کا دوسرا مجموعہ 'درد کے درمیان' منظر عام پر آچکا ہے جو 2002 میں شائع ہوا۔

1980 کے بعد نئی نسل کی ایک بڑی کھیپ نے اس صنف کو فروغ دینے میں اہم رول ادا کیا جس کے نتیجے میں اس صنف کو بڑی مقبولیت حاصل ہوئی۔ 1980 سے 1995 کے درمیانی عرصے میں افسانچے کی صنف کو خوب فروغ حاصل ہوا۔

اس پورے جائزے سے یہ معلوم ہوتا ہے کہ معروف و نامور افسانہ نگاروں نے افسانچے بہت کم لکھے ہیں اور زیادہ تر نئی نسل کے لکھنے والوں نے اسے بحیثیت صنف اپنایا اور اس پر اپنا پورا زور آزمایا ہے اور اس مطالعے سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ اردو میں افسانچے کی ابتدا منٹو نے کی اور بعد میں جوگندر پال نے اسے رواج دیا۔ اس کے بعد رتن سنگھ، محمد بشیر مالیر کوٹلوی، عظیم راہی، ڈاکٹر اشفاق احمد، رحیم انور، عارف خورشید، قاضی مشتاق احمد، کوثر صدیقی، ہرچرن چاولا، خالد سہیل، نواب رونق جمال، عبدالعزیز خان، نذیر فتح پوری، ڈاکٹر ایم۔ اے۔ حق، ساحر کلیم، دیپک بدکی، مناظر عاشق ہرگانوی، ارشد صدیقی، علیم صبا نویدی وغیرہ کے نام اردو افسانچے کے ارتقا میں نظر انداز نہیں کیے جا سکتے ہیں کیوں کہ ان افسانہ نگاروں نے نہ صرف اس صنف کو وقار اور اعتبار بخشا بلکہ اسے فروغ دینے میں ایک اہم رول انجام دیا ہے۔ ان افسانچہ نگاروں کے علاوہ اس صنف کی روایت کو آگے بڑھانے میں ایم۔ مبین، آئی۔ ایم ساجد، محمد طارق، م۔ ناگ، نورالحسنین، طفیل سیماب، ساحل احمد، اقبال انصاری، سالک جمیل وغیرہ کے نام بھی اہمیت کے حامل ہیں۔

■

Firdaus Ahmad Bhatt
Research Scholar, Dept of Urdu
University of Kashmir-190006 (J&K)

محمد علیم اسماعیل

اردو افسانوں میں خودکلامی کے عناصر

اردو افسانوں میں خودکلامی کے عناصر ابتدا سے ہی ملتے ہیں۔ پریم چند نے اپنے کئی افسانوں میں اس تکنیک کا استعمال کیا ہے۔ اس حوالے سے ان کا افسانہ 'شکوہ شکایت' کافی اہمیت رکھتا ہے۔ پریم چند کے بعد کے افسانہ نگاروں کے یہاں بھی خودکلامی کے عناصر پائے جاتے ہیں۔ اس تکنیک میں حاضر راوی کہانی بیان کرتا ہے۔ یہ راوی یا تو خود کی کہانی سناتا ہے یا پھر جس سے وہ مخاطب ہوتا ہے اس کی کہانی پیش کرتا ہے۔ یعنی راوی میں، ہم یا تم کی کہانی بیان کرتا ہے۔ ایسے افسانوں میں راوی خود بھی موجود ہوتا ہے۔

خودکلامی کی تکنیک اور واحد متکلم بیانیہ کی تکنیک ملتی جلتی تو ہے لیکن یکساں نہیں ہے۔ دونوں قسم کے افسانوں میں حاضر راوی 'میں' کہانی بیان کرتا ہے۔ خودکلامی میں راوی خود ہی سے باتیں کرتا ہے، خود ہی سے سوال کرتا ہے اور خود ہی جواب دیتا ہے، پیش ہو چکے واقعات کو دہراتا ہے اور اپنے آپ کو یا پھر مخاطب کو سناتا ہے۔ راوی جس سے مخاطب ہوتا ہے ضروری نہیں کہ وہ شخص اس کے سامنے موجود ہو اور زندہ بھی ہو۔ راوی کسی کردار کے خیالی وجود سے یا پھر مردے سے بھی باتیں کر سکتا ہے۔ جبکہ واحد متکلم بیانیہ میں حاضر راوی 'میں' براہ راست قاری کے روبرو کہانی پیش کرتا ہے۔ واحد متکلم بیانیہ کی کہانیوں میں جزوی طور پر خودکلامی ہو بھی سکتی ہے اور نہیں بھی۔ ویسے تو خودکلامی کے عناصر غائب راوی کے افسانوں میں بھی ہو سکتے ہیں لیکن حاضر راوی کے افسانوں میں اس کا تناسب زیادہ ہوتا ہے۔

اس تکنیک کی سب سے بڑی خوبی یہ ہے کہ کہانی میں بیان ہونے والے تمام واقعات ایک ہی شخص 'میں'، ہم یا تم' کے حوالے سے سنائے جاتے ہیں۔ مطلب ایک ہی شخص کہانی کا مرکز ہوتا ہے اور پوری کہانی اسی کے حوالے سے بیان ہوتی ہے۔ اس لیے اگر کوئی قاری کہانی کو درمیان سے یا کہیں سے بھی پڑھنا شروع کر دے تو اسے کہانی سمجھنے میں دشواری نہیں ہوتی۔ اور کہانی قاری کو اپنی گرفت میں لے لیتی ہے، لیکن اس کے برعکس کہانی اگر کوئی غائب راوی بیان کر رہا ہے تو قاری کو یہ سہولت نہیں ملتی۔ ایسی کہانی کو قاری اگر درمیان سے یا کہیں سے بھی پڑھنا شروع کر دے تو اُسے جلد یہ پتا نہیں چلتا کہ راوی کس کے بارے میں بات کر رہا ہے؟ اور افسانے کا مرکزی کردار کون ہے؟ حاضر راوی کے افسانوں میں کردار کی تعداد کم ہوتی ہے۔

(1) **شکوہ شکایت**: یہ افسانہ پریم چند کے افسانوی مجموعے 'واردات' میں شامل ہے اور مجموعے کا سب سے پہلا افسانہ ہے۔ کہانی خودکلامی کی تکنیک میں بیان ہوئی ہے۔ جس میں ایک عورت اپنے شوہر کی خامیوں کا ذکر کرتی ہے۔ اُسے شوہر سے کئی شکایتیں ہیں، اور وہ اُن شکایتوں کو یکے بعد دیگرے بیان کرتی چلی جاتی ہے، جس سے شوہر کے ساتھ ساتھ بیوی کا کردار بھی مکمل طور پر سامنے آتا ہے۔ اس افسانے کو کردار نگاری کا افسانہ بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ ایک عام سی گھریلو کہانی ہے جو قاری کو اپنی کہانی معلوم ہوتی ہے۔

بیوی کو اپنے شوہر سے جو شکایتیں ہیں وہ اس طرح ہیں:

شوہر کا ٹٹپونجیوں کی دکان سے سودا سلف لانا، زیور بنانے میں دھوکے باز سنار کا انتخاب کرنا، ہر وقت ضرورت مندوں کی مدد کرنا، دل کھول کر مہمان نوازی کرنا، نوکر سے ہمدردی رکھنا، بیوی کو کبھی کوئی تحفہ نہ دینا، بچوں پر سختی نہ کرنا، دفتر میں مروت اور رواداری سے کام لینا، رشتے داروں کو خوب اہمیت دینا لیکن کسی سے مدد نہ چاہنا، بیٹی کی شادی میں کنیادان کی رسم ادا نہ کرنا، جہیز کی مخالفت کرنا، اور دیگر سماجی رسم و رواج میں دلچسپی نہ لینا، وغیرہ۔

افسانے سے اقتباس دیکھیے جس میں سودا سلف لانے کے متعلق شکوہ کیا گیا ہے:

''باہر سے کوئی چیز منگواؤ تو ایسی دکان سے لائیں گے جہاں کوئی گاہک بھول کر بھی نہ جاتا ہو، ایسی دکانوں پر نہ چیز اچھی ملتی ہے، نہ وزن ٹھیک ہوتا ہے، نہ دام ہی مناسب، یہ نقائص نہ ہوتے تو وہ دکان بدنام ہی کیوں ہوتی، انھیں ایسی ہی دکانوں سے سودا سلف خریدنے کا مرض ہے۔ بارہا کہا کہ کسی چلتی ہوئی دکان سے چیزیں لایا کرو، وہاں مال زیادہ کھپتا ہے، اس لیے تازہ مال آتا رہتا ہے، مگر نہیں ٹٹپونجیوں سے ان کو ہمدردی ہے اور وہ انھیں اُلٹے استرے سے مونڈتے ہیں۔ گیہوں لائیں گے تو سارے بازار سے خراب، گھنا ہوا، چاول ایسا موٹا کہ بیل بھی نہ پوچھے، دال میں کنکر بھرے ہوئے، منوں لکڑی جلا ڈالو کیا مجال کہ گلے، گھی لائیں گے تو آدھوں آدھ تیل اور نرخ اصلی گھی سے ایک چھٹانک کم، تیل لائیں گے تو ملاوٹ کا، بالوں میں ڈالو تو چکٹ جائیں، مگر دام دے آئیں گے اعلی درجے کے چنبیلی کے تیل کے، چلتی ہوئی دکان پر جاتے تو جیسے انھیں ڈر لگتا ہے، شاید اونچی دکان اور پھیکے پکوان کے قائل ہیں، میرا تجربہ کہتا ہے کہ نیچی دکان پر سڑے پکوان ہی ملتے ہیں۔''

بہت ساری شکایتوں سے پرے بیوی آخر میں جو کہتی ہے اس سے وہ ایک مشرقی عورت کے روپ میں سامنے آتی ہے:

''مگر کچھ عجیب دل لگی ہے کہ ان ساری برائیوں کے باوجود میں اُن سے ایک دن کے لیے بھی جدا نہیں رہ سکتی، ان سارے عیوب کے باوجود میں انھیں پیار کرتی ہوں، ان میں وہ کون سی خوبی ہے جس پر میں فریفتہ ہوں، مجھے خود نہیں معلوم، مگر کوئی چیز ہے ضرور، جو مجھے اُن کا غلام بنائے ہوئے ہے۔ وہ ذرا معمول سے دیر میں گھر آتے ہیں تو میں پریشان ہو جاتی ہوں، اُن کا سر بھی درد کرے تو میری جان نکل جاتی ہے، آج اگر تقدیر ان کے عوض مجھے کوئی علم اور عقل کا پُتلا، حُسن کا دیوتا بھی دے تو میں اُس کی طرف آنکھ اُٹھا کر نہ دیکھوں۔''

(2) **بین**: افسانہ 'بین' میں پیش ہونے والی کہانی کو احمد ندیم قاسمی کے اسلوب نے خاص بنا دیا ہے۔ یہ افسانہ بھی مکمل طور پر خودکلامی کی تکنیک میں لکھا گیا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار رانو ہے۔ رانو خوبصورت اور جوان ہے، جب وہ تلاوت کرتی ہے تو اس کی آواز میں چاندی کی کٹوریاں بجتی ہیں۔ اللہ اور رسول کے بعد وہ سائیں دولے شاہ سے بے حد عقیدت رکھتی ہے۔ رانو مر چکی ہے۔ ماں اپنی مری ہوئی بیٹی سے مخاطب ہو کر بین کرتی جاتی ہے اور رانو کی پیدائش سے لے کر موت تک کی کہانی بیان کر دیتی ہے۔ زبان و بیان میں روانی اور جذبات نگاری ایسی ہے کہ قاری اس میں کھو سا جاتا ہے۔ افسانے سے اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''قرآن شریف تم نے اتنا پڑھا میرے جگر کی

ٹکڑی، کہ اب بھی جب چاروں طرف سناٹا اور صرف اِدھر اُدھر سے سسکی کی آواز آتی ہے، میں تمھارے آس پاس، تمھاری ہی آواز میں قرآن شریف کی تلاوت سن رہی ہوں۔ تمھارے ہونٹ تو نہیں ہل رہے، پر میں اپنے دودھ کی قسم کھا کر کہتی ہوں کہ یہ آواز تمھاری ہے۔ زمین پر ایسی نورانی آواز میری رانوں کے سوا اور کس کی ہو سکتی ہے۔''

اس کہانی کے ذریعے احمد ندیم قاسمی نے درگاہوں اور مزاروں پر ہونے والی بداعمالیوں سے پردہ اٹھایا ہے۔ افسانہ نگار نے کھل کر کچھ بھی نہیں کہا لیکن قاری سب کچھ سمجھ جاتا ہے کہ بچی کے ساتھ زنا بالجبر ہوا ہے اور یہ بدفعل سائیں دولہے شاہ کے مجاور سائیں حضرت شاہ نے کیا ہے۔

(3) **موم کی مریم**: افسانہ 'موم کی مریم' اپنوں کی ستائی ہوئی محبت کی ماری، بے سہاروں کی ہمدرد ایک دوشیزہ قدسیہ کی کہانی ہے۔ اسے زندگی کے ہر موڑ پر فریب، دھتکار اور پھٹکار کے سوا کچھ نہ ملا۔ اس نے اپنی چھوٹی خالہ کے لڑکے امجد کے رشتے سے انکار کیا۔ ریاض سے شادی کرنے کے لیے وہ ہر قیمت ادا کرنے کو تیار تھی۔ ریاض جو اُن کے گھر کے دستر خوان کے ٹکڑوں پر ہی پلا تھا۔ اُسے ابّا نے قبول نہ کیا۔ ابّا کی ایک ڈانٹ پر محبت اچھل کر دور جا پڑی اور ریاض اپنا بوریا بستر لے کر بھاگ گیا۔ وہ ماسٹر جو اُسے پڑھانے آتا تھا جس کی محبوبہ غربت کی وجہ سے اُسے دھوکا دے کر بھاگ گئی تھی۔ اُس نے اپنی بے چارگی اور دکھ کے افسانے سنائے تو قدسیہ نے ہمدردی سے اُس کا دکھ کم کرنا چاہا۔ وہ جہاں جہاں بھی گئی تاریکی نے اس کے گرد حلقے بنا لیے۔ حقارت بھری نظروں نے خودی کا احساس بیدار کیا۔ اس کے متعلق چاروں طرف بدنامیاں اور سرگوشیاں بڑھتی چلی گئیں اور وہ ہنس کر ہر زخم سہتی رہی۔ وہ اعلیٰ تعلیم حاصل کرنا چاہتی تھی اور ابّا اسے تنہا ہاسٹل میں چھوڑنے پر تیار نہ تھے۔ قدسیہ کو ہمیشہ بجھے ہوئے دل اور بیمار ذہنوں سے ہمدردی رہی۔ ایک روز اطہر اور قدسیہ اچانک غائب ہو گئے۔ بعد میں معلوم ہوا کہ دونوں لکھنؤ میں رہ رہے ہیں۔ پھر اچانک قدسیہ ایک معمولی بیماری سے مر گئی۔ قدسیہ کی کہانی کے ایک ایک لفظ میں درد پیوست ہے۔ خود کلامی کا انداز ایسا ہے کہ کہیں ٹھہرنے نہیں دیتا۔ قاری شروع سے آخر تک قدسیہ کو پڑھتا چلا جاتا ہے لیکن کہانی کا انجام اس کے دل میں بھی کہیں نہ کہیں ایک کسک پیدا کر دیتا ہے کہ جو دکھوں کا پہاڑ سہہ گئی آخر وہ اتنی آسانی سے کیسے مر گئی؟ یہی ادھیڑبن کافی دیر تک قاری کے ذہن پر چوکے لگاتا رہتا ہے۔ اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''آج صبح عائشہ کے خط سے مجھے تمہاری موت کی خبر مل چکی ہے مگر میں اس موت پر اظہار افسوس نہ کر سکا۔ روزانہ جانے کتنے بادل بنا برسے گزر جاتے ہیں۔ کتنے نغمے ساز کے اندر ہی دم توڑ دیتے ہیں۔ کتنے انسان ایک لمحہ کی خوشی ڈھونڈتے ڈھونڈتے مر جاتے ہیں۔ پھر تمھاری موت تو میرے سامنے کتنی بار ہو چکی ہے۔ اگرچہ مادی طور پر تم چلتی پھرتی نظر آتی تھیں۔ بالکل اسی طرح جیسے آج میرے کمرے میں آ بیٹھی ہو۔''

افسانے میں حاضر راوی 'میں' خود کلامی کی تکنیک میں سیکنڈ پرسن 'تم' کی کہانی بیان کر رہا ہے۔ افسانے میں 'میں' بھی شامل ہے لیکن مرکزی کردار 'تم' ہے۔ کہانی کا راوی احمد ہے جو مرکزی کردار قدسیہ کا تایازاد بھائی ہے۔

(4) **آواز گریہ**: 'آواز گریہ' سلام بن رزاق کا افسانہ ہے۔ افسانہ حاضر راوی کی خود کلامی کے ذریعے آگے بڑھتا ہے۔ افسانے کا مرکزی کردار جو افسانے کا راوی بھی ہے، وہ اپنی بیوی کے حوالے سے اپنی زندگی کی کہانی بیان کر رہا ہے۔ راوی مر چکا ہے۔ گھر میں اس کی لاش پڑی ہے۔ اس کی موت دراصل آدھی ادھوری موت ہے۔ وہ دیکھ سکتا ہے لیکن بول نہیں سکتا، محسوس کر سکتا ہے لیکن جنبش نہیں کر سکتا۔ تارِ نفس کٹ چکے ہیں لیکن بیرونی دنیا سے اس کا رشتہ ہنوز استوار ہے۔ کہانی کا راوی، اس کی بیوی زینب، بیٹیاں انوری اور نازو، بیٹا آصف اور ڈرائیور سلیمان افسانے کے اہم کردار ہیں۔

افسانے سے اقتباس دیکھیے:

''میں مر چکا ہوں۔ کم از کم لوگوں کا ایسا خیال ہے کہ میں مر چکا ہوں۔ ڈاکٹر نے بھی تصدیق کر دی ہے۔ گھر کے اندر اور باہر ایک کہرام مچا ہے۔ میری دونوں بیٹیاں انوری اور نازو رو رہی ہیں۔ میری بیوی زینب بال کھولے سینا کوبی کر رہی ہے۔ البتہ میرا بیٹا آصف دکھائی نہیں دے رہا ہے۔ حسبِ معمول اپنے لُچے لفنگے دوستوں کے ساتھ کہیں آوارہ گردی کر رہا ہوگا۔ زینب نے اپنی چوڑیاں توڑ دی ہیں۔ منگل سوتر نوچ کر پھینک دیا ہے۔ اس کا پلو اس کے سینے سے ڈھلک گیا ہے۔ بلاوز کے اوپر کا بٹن کھل گیا ہے اور جب وہ سینے پر ہاتھ مار کر بین کرتی ہے تو اس کی گداز چھاتیاں اچھل اچھل پڑتی ہیں......

تارِ نفس کٹ چکے ہیں مگر جسم کے اندھے غار میں وہ کون سا چراغ بجھنے سے رہ گیا ہے جس کے سبب بیرونی دنیا سے میرا رشتہ ہنوز استوار ہے۔ رہ رہ کر میرے اندرون میں یہ کیسی ٹیسیں اٹھ رہی ہیں؟ کیا عذابوں کا سلسلہ شروع ہو چکا؟ اے خدا! مجھے زندہ رہنے کے اس کرب ناک احساس سے نجات دے۔ میری آنکھوں کو بصارت کے عذاب سے بچا۔ میرے کانوں کو سماعت کی سزاؤں سے محفوظ رکھ۔ میری کشتی کو زندگی کے بھنور سے نکال۔ مجھے موت دے۔ مکمل موت......''

(5) **منجھلی**: محمد حمید شاہد کا افسانہ منجھلی میں خود کلامی کے بھرپور عناصر ملتے ہیں۔ یہاں حاضر راوی کہانی بیان کرتا ہے۔ اپنی منجھلی بیٹی کو اپنے بڑے بھائی اور بھابی کو گود دے دینے کے بعد گھر کے سبھی افراد، جس ذہنی کشمکش سے گزرتے ہیں، راوی نے اسے بڑے ہی پُراثر انداز میں بیان کیا ہے۔ راوی کے بھائی اور بھابی بڑی محبت کرنے والے ہیں لیکن ان کی کوئی اولاد نہیں۔

افسانے سے اقتباس ملاحظہ فرمائیں:

''اَب سوچتا ہوں کہ میں نے اتنا بڑا فیصلہ کیسے کر لیا تھا، تو حیرت ہوتی ہے۔ سچ تو یہ ہے کہ اِتنا بڑا فیصلہ میں نے نہیں کیا تھا، خود بخود ہو گیا تھا۔ دراصل بھائی اور بھابی دونوں اتنی محبت کرنے والے اور خیال رکھنے والے ہیں کہ اُن کے لیے کچھ بھی کیا جا سکتا ہے۔ بیگم نے بھی مخالفت نہ کی تھی۔ بس ہکا بکا مجھے دیکھتی رہی تھی۔ اگرچہ وہ کچھ نہ بولی تھی مگر اس کی آنکھیں نمی سے بھر گئی تھیں۔ اور اَب جب کہ میرے اَندر بھیگی آنکھوں کی فصل اُگ آئی ہے، سوچتا ہوں، میں نے اپنا فیصلہ بدل کیوں نہ دیا تھا۔ پھر یوں ہوا کہ اس نے میرا فیصلہ اپنا فیصلہ بنا لیا۔ سب کو کہتی پھرتی۔ 'دیکھو جی گڑیا ابھی دودھ پیتی ہے اور بڑی بھی تو نا سمجھ ہے، بات بے بات ضد کر بیٹھتی ہے تو سنبھالے نہیں سنبھلتی۔ میں منجھلی کو کیسے سنبھالوں گی؟ اَپنی دادی اور پھوپھی سے بہت مانوس ہے، بھابی اور بھائی بھی تو ماں باپ جیسے ہیں، پیچھے رہ لے گی۔' اور وہ پیچھے رہ گئی۔''

خود کلامی یعنی خود سے باتیں کرنا۔ بہت سے واحد متکلم بیانیہ افسانوں میں بھی خود کلامی کے عناصر ملتے ہیں۔ اس تکنیک میں لکھے گئے دیگر افسانوں میں خواجہ احمد عباس کا میری موت، پروفیسر طارق چھتاری کا نیم پلیٹ، سید محمد اشرف کا وہ لمحہ، عبدالصمد کا دم واپسیں، مشتاق احمد نوری کا چھت پر ٹھہری ہوئی دھوپ، پروفیسر اسلم جمشید پوری کا تم چپ رہو ہیر پال، صادقہ نواب سحر کا راکھ سے بنی انگلیاں، ڈاکٹر شاہد جمیل کا مہاجر، غیاث الرحمٰن کا ہم وطن، رضوان الحق کا زوال جسم سے پہلے، شبیر احمد کا شہرِ اماں کی تلاش، ڈاکٹر ریاض توحیدی کشمیری کا چھوڑ دو طاہر انجم صدیقی کا درندے، وسیم عقیل شاہ کا تعبیر، اور محمد علیم اسماعیل کا بھٹکنی، قابلِ ذکر ہیں، کچھ افسانوں میں مکمل تو کچھ میں جزوی طور پر خود کلامی سے کام لیا گیا ہے۔

■

Mohd Alim Ismail
Behind Police Station
Ward No. 13
Nandura - 443404) (Maharashtra)
Mobile No. 8275047415

سلیقے سے ہواؤں میں جو خوشبو گھول سکتے ہیں
ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جو اردو بول سکتے ہیں

ابوزرعبدالاحد فرقانی

کس کو اُردو زبان دے جاؤں

کہتے ہیں کہ کسی کے قول کو کہیں نقل کیا جائے تو دیانت داری کے ساتھ من وعن کرنا چاہیے۔ بالخصوص کسی مرحوم کا قول ورنہ گناہ کا ارتکاب ہوجائے گا۔ مرحومین کے سلسلے میں اس میں مزید احتیاط اس لیے لازم تصور کی جاتی ہے کہ مرحوم کی روح نہ تڑپے لیکن مرزا داغ دہلوی کے اس مشہور زمانہ شعر کے مصرعے میں جو تحریف یا شاعری کی اصطلاح میں برمحل تصرف کیا ہے اس کرم ظریفی سے تو اغلب گمان یہ ہوتا ہے کہ داغ صاحب کی روح داغ داغ ہرگز نہیں باغ باغ ضرور ہوئی ہوگی۔ داغ صاحب نے تو اپنی زبان کے افتخار پر یوں اظہار کیا تھا۔

اردو ہے جس کا نام ہمیں جانتے ہیں داغ　　　ہندوستاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے

لیکن بعد میں ملکی حدود سے بھی آگے اردو کی روز افزوں مقبولیت کو دیکھ کر مصرعہ ثانی میں نہایت موزوں تصرف کرکے ''سارے جہاں میں دھوم ہماری زباں کی ہے'' کردیا گیا اور اب یہ مذکورہ شعر اسی طرح زباں زد خاص و عام ہوگیا اور ہر جگہ پڑھا اور لکھا جانے لگا۔ داغ صاحب حیات ہوتے تو اس مصرعے کو خود بدل کر ایسے ہی کردیتے جیسے اب ہوگیا۔ اہل زبان کو اپنی زبان پر فخر کرنا ہی چاہیے۔

اردو شعر و سخن کی تاریخ:

برصغیر ہندوستان میں اردو کی آفرینش، نشوونما اور فروغ کی داستان پر نظر ڈالتے ہیں۔

'اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام' میں بابائے اردو ڈاکٹر عبدالحق نے شیخ فریدالدین مسعود گنج شکر کا ایک شعر لکھا ہے۔

وقت سحر وقت مناجات ہے　　　خیز درآں وقت کہ برکات ہے

جس سے اندازہ ہوتا ہے کہ پنجاب میں اس قسم کی بلیغ شاعری کی ابتداء ہوئی۔ کچھ لوگ امیر خسرو کو پہلا شاعر تسلیم کرتے ہیں، کچھ محققین کا کہنا ہے کہ اردو زبان کی آفرینش جنوبی ہندوستان میں ہی ہوئی ولی دکنی کو اردو شاعری کا موجد اعلی اور سب سے پہلا صاحب دیوان شاعر تسلیم کیا گیا ہے۔ یہ قلی قطب شاہ والیِ گولکنڈہ کی اولادوں میں تھے۔ حصول علم کے لیے گجرات گئے۔ فارغ التحصیل ہونے کے بعد جنوبی ہند میں دہلی آگئے۔ یہاں اردو کی نشو ونما اور آبیاری زیادہ ہورہی تھی اور میر شعر وسخن میر تقی میر امام الشعرا تھے۔ میر تقی میر نے اپنی اردو زبان پر جسے اس زمانے میں ریختہ بھی کہا گیا بہت فخر کیا، فرماتے ہیں۔

ریختے میں ہم سے گفتگو نہ کر　　　یہ ہماری زبان ہے پیارے

'یہ ہماری زبان ہے' میں جو فخر وتمکنت ہے اسے اہل زبان ہی سمجھ سکتے ہیں۔ میر تقی میر نے اپنے بیٹوں کو زبان کے تحفظ کی وصیت بھی کی تھی۔ میر نے یوں بھی کہا۔

کس کس ادا سے ریختے میں نے کیے ولے　　　سمجھا نہ کوئی میری زباں اس دیار میں

اور۔

کیا قدر ہے ریختے کی گو کہ میں　　　اس فن میں نظیری کا بدل تھا

فارسی کے غزل گو عظیم شاعر نظیری نیشاپوری سے ہمسری کا دعوی مولانا حسرت موہانی نے بھی کیا ہے۔

کیوں نہ ہوں حسرت ہم نظیری کے نظیر　　　ہے تعلق ہم کو آخر نیشاپور سے

مولانا حسرت کے آباء واجداد نیشاپور سے ہی سلطان شمس الدین التمش کے عہد میں 1215 میں ہندوستان آئے تھے۔

مرزا غالب اگرچہ اپنی فارسی شاعری پر بڑا فخر کرتے تھے لیکن اردو پر بھی کچھ کم ناز نہیں کیا ہے۔

جو یہ کہے کہ ریختہ کیونکر ہو رشک فارسی　　　گفتۂ غالب ایک بار پڑھ کر اسے سنا کہ یوں

دوسرے شعر میں بیدل کے حوالے سے یہ فرماتے ہیں۔

رنگ بیدل میں ریختہ لکھنا　　　اسد اللہ خاں قیامت ہے

اور خواجہ الطاف حسین حالی بھی اپنی زبان پر یوں ناز کرتے ہیں۔

شہد وشکر سے شیریں اردو زباں ہماری　　　ہوتی ہے جس کے بولے میٹھی زباں ہماری

بہرحال اردو سب سے زیادہ حیدرآباد اور دہلی میں خوب پھولی پھلی۔ پنجاب اور کشمیر میں سرسبز وشاداب ہوئی پھر سارے ہندوستان میں۔ یعنی شمالی ہند میں لکھنؤ اور

رام پور اور پورے اودھ اور روہیل کھنڈ میں، وسط ہند میں بھوپال، ٹونک، جاورہ میں، مشرقی ہند میں بنگال اور بہار میں، مغرب میں مہاراشٹر کے ممبئی، مالیگاؤں اور امراوتی میں غرض کہ ہندوستان کے گوشے گوشے میں سلاطین ونوابین کے شاہی درباروں اور امرا وروسا کی محفلوں میں بڑے ناز ونعم مگر عز و وقار کے ساتھ شباب کی دہلیز پر پہنچتے پہنچتے عوام الناس میں مقبول ومطلوب ہوگئی، مکاتب ومدارس جہاں بلاامتیاز مذہب وملت ابتدائی تعلیم سبھی حاصل کرتے تھے میں ذریعہ تعلیم یہی زبان ہوگئی۔ ان مدرسوں نے اردو کی تدریس میں مضبوط کردار ادا کیا اور ہنوز جاری ہے آج بھی مہاراشٹر اور جنوبی ہند کی ریاستوں کے بہت سے سرکاری اسکول اردو میڈیم میں بہتر کارگردگی کے ساتھ چل رہے ہیں۔

برطانوی حکومت کے قیام کے بعد سرکاری سطح پر اس کی ترویج واشاعت کا کام اعلی پیمانے پر شروع ہوگیا۔ جس میں فورٹ ولیم کالج کی اشاعتی خدمات سرفہرست اور ناقابل فراموش ہیں جہاں پہلی بار اردو کی لغت اور اردو قواعد کی کتابیں تیار کی گئیں نیز مخطوطات اور کلاسیکی کتابوں کی اشاعت کا اہتمام ہوا۔ اسی برطانوی دور میں جامعات اسکولوں اور کالجوں میں اردو کے الگ اور مستقل شعبے نیز دیگر ادارہ جات میں بھی اردو کے اشاعتی مراکز قائم ہوئے۔ خدا بخش لائبریری اور رام پور رضا لائبریری اہم ترین مراکز ہیں۔ جہاں اعلی پیمانے پر اشاعتی کام ہوتا ہے۔ الہ آباد یونیورسٹی اور مسلم یونیورسٹی علی گڑھ نے تو اس کی آبیاری اور نشوونما میں ایک ایسا سنگ میل قائم کیا کہ عدیم المثال ہے۔ دار العلوم دیوبند، جامعہ ملیہ اسلامیہ، ندوۃ العلماء، شبلی کالج، دار المصنفین، شبلی اکیڈمی، بھوپال میں برکت اللہ یونیورسٹی، جامعہ عثمانیہ حیدرآباد وغیرہ ادارہ جات سے فارغ التحصیل دانش وراور سخن ور اردو تہذیب وثقافت کے سفیر اور نقیب بن کر چہار دانگ عالم میں پھیل گئے یوروپ، امریکہ انگلینڈ، آسٹریلیا، کینیڈا اور جاپان غرض کہ دنیا کے تمام تہذیب یافتہ ممالک میں اردو زبان اور اردو تہذیب وثقافت کا والہانہ استقبال کیا گیا اور اردو کی نئی نئی کالونیاں ہر جگہ آباد ہوگئیں۔ اور یقیناً اسی لیے مرزا داغ دہلوی کے شعر کے مصرعہ ثانی میں تصرف کرکے اس شعر کو ثبوت کے طور پر بین الاقوامی مقبولیت کا آئینہ بردار بنا دیا گیا۔ حقیقت بھی یہی ہے کہ اردو زبان محض زبان ہی نہیں بلکہ ایک ترقی یافتہ تہذیب وثقافت کا مظہر بن کر سارے جہاں میں ہر دل عزیز اور فیض رساں ہوگئی۔ عصر حاضر کے ہی ایک غیر مسلم شاعر منیش کمار شکلا کے بقول

بات کرنے کا حسین طور طریقہ سیکھا ہم نے اردو کے بہانے سے سلیقہ سیکھا

اردو کی آفرینش یوں بھی بیان کی گئی ہے کہ مغلوں نے جب ارض ہند پر قدم رکھا تو ان کے ہمراہ ان کے جنگجو بھی تھے جو یہاں کی قدیم تہذیب اور بول چال سے واقف نہ تھے لیکن اپنی فتح کو برقرار رکھنے کے لیے یہاں قیام کرنا بھی ضروری تھا، اس لیے یہاں کے سماج میں رہنے سہنے اور آمیزش ولین دین اور ایک دوسرے کے مافی الضمیر کو سمجھنے کی سعی میں باہمی ارتباط سے جو زبان پیدا ہوئی اس کو اردو کا نام دیا گیا اور اس کے معنی ہی لشکری زبان طے پائے۔ یہ بات ہے یہاں آنے والے سب سے پہلے مغل شہنشاہ بابر کے عہد کی، چونکہ مغلوں کی اپنی زبان فارسی تھی اس لیے نوزائیدہ زبان میں اہم وکثیر جزو فارسی ہی رہا۔ اس کے علاوہ درباری یا بہ الفاظ دیگر سرکاری زبان بھی فارسی ہی رہی اور برطانوی عہد کے آخری ایام تک فارسی کا ہی غلبہ رہا۔

> یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی مادری زبان نہ کبھی تھی نہ ہے اور نہ ہو سکتی ہے- عربی دنیا بھر کے مسلمانوں کی مادری زبان نہیں ہو سکتی اور نہ ہی سنسکرت دنیا کے سبھی ہندوؤں کی مادری زبان، کسی بھی زبان کے پھلنے پھولنے کی اولین شرط یہ ہے کہ اسے قبولیت عام حاصل ہو-

ناظر کاکوری کے بقول: ”یہ امر مسلم ہے کہ ہماری زبان جو شیخ و برہمن کی مشترکہ ملکیت ہے اس کی عزت افزائی ہمایوں کے دور سے شروع ہوئی اور اکبری دور کے آتے آتے اس نے ایسی متحدہ صورت اختیار کرلی کہ اگر کسی بزم میں عرفی ونظیری سرگرم سخن نظر آتے تھے تو تلسی داس اور سورداس کی نغمہ سنجیاں بھی گرمی پیدا کرتی تھیں۔ اردو ادب اسی محبت کے سائے میں نشوونما پاتا رہا، حتی کہ ہندوستان کی سیاست کا نقشہ بدلا۔ باوجود اس انتشار کے شیخ و برہمن کا مسئلہ کہیں بھی رونما نہیں ہوسکا۔ اور اگر غالب کے خدنگ نے میر مہدی کو گھائل کیا تو مرزا گوپال تفتہ بھی اس سے بچ کر نہ نکل سکے۔ یہ ایک تاریخی حقیقت ہے کہ اردو صرف مسلمانوں کی مادری زبان نہ کبھی تھی نہ ہے اور نہ ہوسکتی ہے۔ عربی دنیا بھر کے مسلمانوں کی مادری زبان نہیں ہوسکتی اور نہ ہی سنسکرت دنیا کے سبھی ہندوؤں کی مادری زبان، کسی بھی زبان کے پھلنے پھولنے کی اولین شرط یہ ہے کہ اسے قبولیت عام حاصل ہو۔“

ذرا وسیع تناظر میں دیکھا جائے تو اردو صرف ایک زبان نہیں بلکہ ایک نہایت ترقی یافتہ تہذیب ہے کلچر ہے علم تمدن ہے جو آدمی کو انسان بناتا ہے آداب محفل اور حسن سلیقہ سکھاتا ہے۔ کلچر کسی ایک مذہبی گروہ کا پروردہ نہیں ہوتا بلکہ ایک خطۂ ارض پر بسنے والے مختلف العقائد افراد اور جماعتوں کی مشترک ذہنی وقلبی کیفیتوں اور باہمی ارتباط، انس و محبت کی آغوش میں غیر محسوس طور پر پروان چڑھ کر معرض وجود میں آجاتا ہے۔

آج بھی اردو کے غیر مسلم شعرا کی ایک معتد بہ فہرست ہے، جن میں کرشن بہاری نور، اشوک ساحل، منیش شکلا، کرشن کمار طور، نوجوان شاعر مدھم سکینہ، چراغ شرما، وجے تیواری، وپل کمار، کمار وشواس اور محترمہ لتا شرما حیا وغیرہ شامل ہیں۔

لتا کہتی ہیں۔

میں ہندی کی وہ بیٹی ہوں جسے اردو نے پالا ہے
اگر ہندی کی روٹی ہے تو اردو کا نوالہ ہے
مجھے ہے پیار دونوں سے مگر یہ بھی حقیقت ہے
لتا جب لڑکھڑائی ہے تو اردو نے سنبھالا ہے

اس کے علاوہ اقبال اشہر کی بڑی مقبول ومشہور نظم ’اردو ہے مرا نام‘ کا کیا خوب بند ہے۔

کیوں مجھ کو بناتے ہو تعصب کا نشانہ
میں نے تو کبھی خود کو مسلماں نہیں مانا
دیکھا تھا کبھی میں نے بھی خوشیوں کا زمانہ
اپنے ہی وطن میں ہوں مگر آج اکیلی
میں میر کی ہمراز ہوں غالب کی سہیلی
اردو ہے میرا نام میں خسرو کی پہیلی
میں میر کی ہمراز ہوں غالب کی سہیلی

اور ان سب سے بھی پہلے غالب ومیر اور حالی کے بعد شاعر آخر الزماں جوش ملیح آبادی جو شاعر انقلاب اور شاعر شباب کے خطابات سے ملقب ہیں، نے اردو کے خمیر، عناصر کی ترتیب اور حواس خمسہ کی تعریف ’اردو زبان‘ ایک معرکۃ الآراء نظم کہہ کر اردو شاعری کو

مالا مال کر دیا ہے۔

ندی کا موڑ چشمۂ شیریں کا زیر و بم — چادر شبِ نجوم کی شبنم کا رخت نم
موتی کی آب، گل کی مہک، ماہِ نو کا خم — ان سب کے امتزاج سے پیدا ہوئی ہے تو
کتنے حسین افق سے ہویدا ہوئی ہے تو — لہجہ ملیح ہے کہ نمک خوار ہوں ترا
صحت زباں میں ہے کہ بیمار ہوں ترا — آزاد شیر ہوں کہ گرفتار ہوں ترا
تیرے کرم سے شعر و سخن کا امام ہوں — شاہوں پہ خندہ زن ہوں کہ تیرا غلام ہوں

اردو کی غلامی میں حلقہ بگوش ہونے کے باوجود شعر و سخن کا امام ہونے کا دعویٰ حق بجانب کیا ہے افسوس کہ یہ نظم منظر عام پر اس لیے نہیں آسکی جو جوش صاحب کے غیر مطبوعہ کلام کے ذخیرہ میں دب کر رہ گئی۔ اس کے علاوہ اردو زبان کے حسن پر فریفتہ دیگر شعراء نے بھی اپنی زبان کی ثناخوانی کی ہے ملاحظہ ہوں درج ذیل اشعار

وہ کرے بات تو ہر لفظ سے خوشبو آئے — ایسی بولی وہی بولے جسے اردو آئے
(احمد وصی)

عجب لہجہ ہے اس کی گفتگو کا — غزل جیسی زباں وہ بولتا ہے
(نامعلوم)

اردو جسے کہتے ہیں تہذیب کا ہے چشمہ — وہ شخص مہذب ہے جسے اردو آئے
(روش صدیقی)

شستہ زباں، شگفتہ بیاں، ہونٹ گلستاں — ساری ہیں تجھ میں خوبیاں اردو زبان کی
(فرحت احساس)

اردو کی نشو و نما میں غیر مسلموں کے فعال ہونے کا ایک بین ثبوت یہ بھی ہے کہ جدید زمانے کے تقاضوں کو پورا کرنے کے لیے اردو کی مقبول ترین ویب سائٹ ریختہ کی تخلیق بھی ایک غیر مسلم سنجیو سراف کے دماغ کی اختراع ہے۔

اور غیر مسلم گلزار دہلوی کا زبان پر افتخار اور عرفان و آگہی یہ بھی ملاحظہ ہو

گلزار آبروئے زباں اب ہمیں سے ہے — دلی میں اپنے بعد یہ لطف سخن کہاں

اسی طرح دبستان رام پور کے مایہ ناز بین الاقوامی سطح پر مقبول شاعر جناب اظہر عنایتی کا یہ شعر

مری آواز کو محفوظ کرلو — کہ میرے بعد سناٹا بہت ہے

آواز سے مراد اظہر عنایتی کا مخصوص دل نشین ترنم ہی نہیں بلکہ مکمل اردو زبان اس کی ثقافت، لطافت و شیرینی اور اسلوب ادا کی دولت کا تحفظ ہے اور ساتھ میں وہی اندیشہ فردا ہے جس کا اظہار گلزار صاحب نے مذکورہ بالا آخری شعر میں کیا ہے۔ یا اظہر عنایتی کا یہ انتباہ

ساتھ میں مرجائیں گے تاریخ و تہذیب و ادب
ہم نے جو اپنی زباں اردو کو مرجانے دیا

ایسے ہی آنجہانی رگھوپتی سہائے فراق گورکھپوری الہ آباد یونیورسٹی میں انگریزی کے پروفیسر، لیکن عزت مآب ہوئے اپنی اردو عاشقی اور اس میں بیش بہا تخلیقی شاعری کی بدولت۔ صحیح صاف سلیس، شستہ و شائستہ اردو کے پرستار اور جاں نثار تھے۔ یہ سب غیر مسلم شعرا اردو کے ایسے عاشق زار تھے کہ غلط تلفظ ہی برداشت نہیں کر سکتے تھے، چہ جائیکہ رسم الخط کی تبدیلی۔

بس بات وہی منیش شکلا کی ع ہم نے اردو کے بہانے سے سلیقہ سیکھا
یا جیسا وصی احمد وصی نے کہا کہ ع ایسی بولی وہی بولے جسے اردو آئے
ان تمام روایتوں اور مباحث کے ذکر کا مقصد یہ ثابت کرنا ہے کہ اردو کی جائے پیدائش اور وطن مولود ہمارا یہی عظیم ہندوستان ہے جہاں مسلم و غیر مسلم سبھی کی مشترکہ مساعی سے اردو زبان کی پرورش ہوئی۔ یہی وہ زبان ہے جس کے ایک نعرہ نے برطانوی سامراج کو اکھاڑ پھینکنے میں جنگ آزادی کے جیالے جاں بازوں اور سرفروشوں میں وہ جذبہ وہ ولولہ اور جوش و جنون پیدا کیا کہ مقصد کو حاصل کر کے ہی دم لیا، اس نعرے کا متبادل آج تک تمام کاوشوں کے باوجود منظر عام پر نہیں آسکا اور نہ مستقبل میں آسکے گا۔ یہ نعرہ ہے۔

''انقلاب زندہ باد!'' ''زندہ باد!''

اس نعرے کے موجد حسرت موہانی ضرور تھے لیکن بلند کرنے والے تھے شہید بھگت سنگھ ایک پنجابی ہندو اور دوسرے ایک بنگالی پنڈت سبھاش چندر بوس، جنگ آزادی کے سپہ سالار۔

اسی طرح آج کسی بھی جماعت، کسی بھی تنظیم سے وابستہ سارے مزدور سنگٹھن جب اپنے مطالبات کے حصول کے لیے برسرپیکار ہوتے ہیں تو خود کو متحد کرنے کے لیے اکثر و بیشتر اس شعر سے کام لیتے ہیں۔

سرفروشی کی تمنا اب ہمارے دل میں ہے — دیکھنا ہے زور کتنا بازوئے قاتل میں ہے

دراصل اردو اپنے مفہوم اور مطلب کی مکمل ترسیل کے علاوہ اپنی لطافت اور شیرینی کے ساتھ نرم و نازک لہجہ اور طرز گفتگو سے بہت جلد ہی مقبول خاص و عام ہو گئی اور دیکھتے ہی دیکھتے اپنی رعنائیوں اور شباب کی منزلیں طے کرتی ہوئی تقریباً پورے ہندوستان اور پھر ساری دنیا میں پھیل گئی، سمجھی اور بولی جانے والی زبان بن گئی۔ اردو کے خمیر یا اس کی سرشت میں شیرینی و کشش کے علاوہ ایک وصف تمام رائج الوقت زبانوں کے الفاظ کی پذیرائی اور خود میں ضم کر لینا ہے اس طرح اس کا دامن وسیع سے وسیع تر ہو جاتا ہے اور مقبولیت کا سبب بھی۔ اب یہ دنیا کی Richest زبانوں میں سے ایک ہے۔ اس زبان کے غیر مسلم شاعروں نے غزل کے علاوہ حمد و نعت اور منقبت کے شاہکار بھی پیش کیے ہیں۔ جو زبان پر دسترس اور تاریخ اردو کی تکمیل کا ثبوت ہے۔

فلمی دنیا: بالی ووڈ کا تذکرہ

اردو زبان، شعر و سخن اور اس کی تہذیب و ثقافت کو وسعت دینے میں فلمی دنیا کی فعالیت کو نظر انداز نہیں کیا جا سکتا۔

فلمی دنیا نام ہی ہندوستانی شہریت اور اردویت کی شناخت کا تھا۔ شاعری کی طرح اداکاری و فنکاری بھی فنون لطیفہ کا حصہ ہے۔ اس کی قابل ستائش حصے داری کا تذکرہ نہ کرنا ناانصافی ہوگی۔ پہلے زمانے کے تخلیق کار، اداکارائیں اور اداکار، ہدایت کار، نغمہ نگار، موسیقار، مصنفین و معاونین غرض کہ فلمی دنیا سے وابستہ سبھی لوگ بڑے خلوص وجذبہ اور لگن سے متعلقہ خدمات میں مستعد نظر آتے تھے ان میں ہر شعبے سے متعلق بیشتر افراد زبان و بیان اور تہذیب و ثقافت کی تخم ریزی کرنے والے مکتبوں سے فارغ التحصیل ہوتے تھے۔ ان مکتبوں کے فارغ التحصیل لوگوں کی اہمیت زندگی کے ہر شعبہ میں نمایاں رہی۔

اظہر وہ مکتبوں کے پڑھے معتبر تھے لوگ — بیساکھیوں پہ صرف سند کی کھڑے نہ تھے

جی ہاں ہم یاد کر رہے ہیں گذشتہ صدی کے نصف اول تک اس دنیا میں قدم رکھنے والوں کو جنھوں نے اس دنیا میں اعلیٰ مقام حاصل کیا، کامیابیوں کے اعلیٰ سے اعلیٰ نشانات تک پہنچے، نئے نئے سنگ میل قائم کیے۔ شہرت کی ہمالیائی بلندیوں پر پرچم لہرائے۔ ان میں اکبر اعظم کو مغل اعظم کے کردار میں مجسم کر دینے والے بلند و بالا قامت والے آں جہانی پرتھوی راج کپور اور ان کی پیڑھیاں، بلراج ساہنی، شہنشاہ جذبات دلیپ کمار محمد یوسف خاں ('شہنشاہ جذبات' فاروق ارگلی کا دیا ہوا ہے، اس لقب کا ہندی، انگریزی یا

ملکی و غیر ملکی کسی بھی زبان میں ترجمہ کرلیا جائے لیکن مفہوم کی ترجمانی اردو کے اس لفظ کی ہمسری نہیں کرسکتی)، راج کمار، سنیل دت شستہ و شائستہ لب و لہجے والے سپرو، اشوک کمار، منفی کردار کو ممتاز کردینے والے پران صاحب جو رام پور کے حامد اسکول کے پڑھے ہوئے تھے، ہیرالال وغیرہ اداکاراؤں میں نرگس، ثریا، مدھوبالا، شاعرہ مینا کماری، وحیدہ رحمٰن، بیگم دلیپ کمار سائرہ بانو وغیرہ ان میں بیشتر اردو میڈیم اسکولوں کے پڑھے ہوئے تھے۔ زبان و تلفظ کی صحیح ادائیگی پر خاص توجہ ہوتی کہ جو اردو میڈیم سے نہیں تھے، انہوں نے اردو اساتذہ سے ٹیوشن لے کر با قاعدہ اور لازماً اردو سیکھی۔ ان میں منوج کمار، دھرمیندر، راجندر کمار، شتروگھن سنہا اور جنوبی ہند سے آئی ہوئی وجینتی مالا وغیرہ کے نام لیے جاسکتے ہیں۔ نغمہ نگاروں میں تو سبھی اردو والے تھے۔ قتیل شفائی، کیفی اعظمی، ساحرلدھیانوی، کیف بھوپالی، مجاز لکھنوی، شہریار، کمال امروہوی جو مصنف تھے اور ہدایت کار بھی۔ کے آصف مغل اعظم کے خالق، راہی معصوم رضا مکالمہ نگار، موسیقار نوشاد، مزاحیہ اداکاراؤں میں جانی واکر، مقری اور محمود ان کے بعد کے ہدایت کاروں میں بی آر چوپڑا، رمیش سپی، گلزار صاحب اور مہیش بھٹ نہایت سنجیدہ و معتبر ذی علم، یہ

فلم جگت سے متعلق اردو رسالوں میں روبی کے علاوہ شمع ایک نہایت اعلی قسم کا معیاری جریدہ بڑا مقبول خاص و عام تھا جس میں بڑے پایے کے ادیبوں اور مصنفوں مثلا کرشن چندر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور واجدہ تبسم وغیرہ کے مضامین اور افسانے شائع ہوتے تھے۔ مسافریعنی ادریس دہلوی کے قلم سے فلمی سفرنامہ اور شوٹنگ کی لوکیشنس کی روداد بڑی پابندی سے شائع ہوتی تھی۔

سب پردۂ سیمیں پر جو کچھ پیش کرتے تھے سب کچھ بامعنی اور زبان و ادب کے اعلیٰ معیار پر کھرا پیش کرتے تھے۔ کہیں کوئی رکاکت اور ابتذال نہیں، جس کا ثبوت یہ ہے کہ آج بھی پرانے نغموں میں وہی تازگی، شیرینی اور لطافت برقرار ہے۔ اتنی ہی توجہ مبذول کرانے کی صلاحیت موجود ہے دراصل ان سب کا مقصد تھا عوام میں ایک نفیس قسم کا ذوق اور حس لطیف پیدا کرنا محض پیسہ کمانا نہیں۔ فلمی دنیا کو بدل کر بالی ووڈ مہمل سا نام رکھ دیا گیا اور تبھی سے اس کے ہر شعبے کا معیار زوال پذیر ہوگیا۔ شاید اسکرین ٹیسٹ اور آڈیشن ٹیسٹ بھی ختم ہوگئے، مزاحیہ ہی نہیں سنجیدہ مکالموں میں اور نغموں میں مبتذل قسم کی ذومعنویت آگئی۔ لطیفے کثیفوں میں بدل گئے۔ غرض کہ بہت کچھ خرابی ہی خرابی رونما ہوتی گئی۔ فلم جگت سے متعلق اردو رسالوں میں روبی کے علاوہ شمع ایک نہایت اعلی قسم کا معیاری جریدہ بڑا مقبول خاص و عام تھا جس میں بڑے پایے کے ادیبوں اور مصنفوں مثلا کرشن چندر، عصمت چغتائی، قرۃ العین حیدر اور واجدہ تبسم وغیرہ کے مضامین اور افسانے شائع ہوتے تھے۔ مسافر یعنی ادریس دہلوی کے قلم سے فلمی سفرنامہ اور شوٹنگ کی لوکیشنس کی روداد بڑی پابندی سے شائع ہوتی تھی۔

مولانا محمد علی جوہر، مولانا امتیاز علی عرشی، مولانا شاہ وجیہ الدین احمد خاں اور مولانا محمد عبدالسلام خاں کے اس چھوٹے سے شہر کو دبستان رام پور سے معنون ہونے کا شرف یوں ہی نہیں ملا۔ شاد عارفی رازیزدانی، عندلیب شادانی، صبر تسلیمی، محشر عنایتی، محمد علی خاں اثر، شمس شادانی، واجد علی اشک، نرالے میاں شمس، استاد رشید، منے میاں صابر، جلیل خاں نعمانی، شوق اثری، خیال رام پوری، ہوش نعمانی، رئیس رام پوری وغیرہ اپنی شاعرانہ عظمت، فنی مہارت اور استادانہ رفعت کو ارباب نقد و نظر سے تسلیم کرا چکے تھے۔ باذوق نوجوان شعرا ان باوقار لوگوں کے سامنے زانوئے ادب تہہ کرکے استفادہ کررہے تھے مشق سخن شد و مد سے جاری تھی۔ یہ سب دبستان ہونے کا جزو لازم ہے۔ ان میں دبستان کی شان اور پہچان قائم کرنے والوں میں جناب محشر عنایتی کے شاگرد رشید اظہر عنایتی اور سعید رامش، خیال صاحب کے شاگردوں میں محمد علی موج، شکیل غوث اور عرفان دانش، شوق اثری صاحب کے تلامذہ میں شہزادہ گلریز طاہر فراز، نعیم نجمی اور س ش عالم، ہوش نعمانی صاحب کے شاگرد رشید عبداللہ خالد نمایاں نام ہیں۔ جو دبستان کی رفعتوں کو بام عروج تک پہنچا رہے ہیں۔ ہوش نعمانی نے اسی دور میں یہ شعر کہا۔

اے رام پُر مرے! تہذیب و تمدن کے دیار　　ہو مبارک تجھے اردو کا دبستان ہونا

ان کے علاوہ غیر مسلم شعراء میں ریاست کے دور کے جناب رگھونندن کشور شوق، آنند کمار جبین سرور عرفانی، بعد میں دواکر راہی ہری شنکر تمنا، منولال شرما عارفی، سنتوش کمار موج، گووند سروپ سکینہ، اوم پرکاش گپتا راز اور شاعرات میں بیگم رامپور رفعت زمانی بیگم عصمت، کشور آرا شبنم وغیرہ بے شمار نام ہیں جنھوں نے دبستان کی آبیاری کرکے اس کی خوش نمائی اور عزت و وقار میں اضافے کیے ہیں۔ دراصل بانیان ریاست رام پور روہیلے پٹھان اصلاً تو ایک جنگجو قوم تھے۔ لیکن فرماں روائی اور امور سلطنت میں نہایت صاف شفاف بے لوث منصف مزاج جمہوری اقدار کا لحاظ و پاس رکھنے والے اور اپنی رعایا کی بہترین ذہنی پرورش کرنے کا وصف رکھتے تھے۔ عمارت سازی کا ذوق اور شہر کی تزئین کاری میں طاق تھے۔ نواب حامد علی خاں تو رام پور کے شاہ جہاں کہلاتے تھے۔ ان کے دور حکومت میں تعمیر کی ہوئی عالیشان شاہانہ عمارتیں ثبوت ہیں۔ حامد منزل کی تعمیر و تزئین جمہوری اقدار، ہندو مسلم اتحاد اور قومی یکجہتی کا بہترین نمونہ ہے کہ اس کے گنبد کی ہر منزل اپنی رعایا کی الگ الگ عبادت گاہ کا استعارہ ہے۔ اس لیے یہاں کی فضاؤں میں محبت و اخوت اور رواداری رچی بسی ہوئی ہے۔ اسی رواداری کو فروغ دینے کے لیے ریاست رام پور کے آخری تاجدار نواب سر رضا علی خاں نے دارالخلافہ دہلی کے بعد دوسری گاندھی سمادھی کی تعمیر رام پور میں کرائی۔ رام پور میں سب شیر و شکر ہوکر رہتے ہیں۔ راہ و رسم میں بھی کوئی تصنع نہیں خلوص ہی خلوص ہے۔ اسی لیے زبان و بیان کی پاس داری و محافظت بھی سبھی نے کی، سخن وری کی آبیاری بھی خوب کی دبستان بنانے میں سبھی کی محبت اور حصے داری ہے۔

دبستان رام پور کے تمام اساتذہ اور تلامذہ نے زبان و ادب اور اردو ثقافت کو بڑی محنت و جاں کاہی سے ایک اعلیٰ ترین معیار تک پہنچایا ہے۔ زبان کے تقاضوں کی خدمت اور اطاعت، ماں کی اطاعت کی طرح کی ہے۔ اس کی ثنا خوانی بھی کی ہے۔ اور اس کی گرتی صحت پر رنج و ملال بھی کیا صحت مندی کی دعائیں بھی کیں اپنے سے چھوٹوں کو اس کی محبت و خدمت کی ہدایت بھی کی ہے۔ جوان کے اردو سے متعلق اشعار سے ہویدا ہے۔ زبان کی محافظت کی مساعی بھی ہے اور مستقبل کے وسوسوں کا اظہار بھی کیا ہے۔

مرحوم محشر عنایتی ایک کہنہ مشق استاد شاعر کے اشعار ملاحظہ ہوں جن میں ان کی دور اندیشی اور اس کے نتیجے میں مایوسی لیکن نسل نو کے لیے ایک انتباہ اور نصیحت بھی ہے۔

خوش ہیں بہت مزاج زمانہ بدل کے ہم　　لیکن یہ شعر کس کو غزل کے سنائیں ہم

غنیمت ہے محشر مری زندگی　　کہ روئے گی اردو زباں میرے بعد

ہوش نعمانی صاحب نے اردو کے مختلف انداز اور ہر پہلو پر نظر رکھتے ہوئے متعدد اشعار کہے جن میں چند یہ ہیں۔

اردو لکھے اوراق کس الجھن میں پڑے ہیں　　طاقوں میں سجے ہیں کبھی آنگن میں پڑے ہیں

اور مرحوم کا یہ شعر تو اردو کے حوالے سے بڑا لازوال لگتا ہے۔

جو کل کے بچے نے پائی کتاب اردو کی　　لگا کے آنکھوں سے مسجد میں رکھ کے آئے گا

اس شعر میں بظاہر تو اندیشہ فردا ہے لیکن آنے والی نسلوں کے لاشعور میں پیوست اردو کا تقدس، عظمت وطہارت کا عکس بھی بڑا نمایاں ہے۔

ہوش صاحب کے شاگرد رشید عبداللہ خالد نے اردو کی زبوں حالی اور اس کے تنزل کے پس منظر کا بڑا حقیقی سبب نہایت کڑوے اور کسیلے لہجے میں اپنے مزاج سے مشابہت دیتے ہوئے بیان کیا ہے۔

اغیار تنگ دل ہیں تو اپنے منافقین　　میرا بھی حال زار ہے اردو زبان سا

اور یہ حقیقت ہے کہ خود اردو والوں کی عدم دلچسپی بلکہ واقعتاً منافقانہ سلوک نے اردو کو اس حال پر پہنچایا ہے۔

دبستان رام پور کی امریکہ اور وسط ایشیا میں نمائندگی کرنے والے مشہور شاعر، آل انڈیا ریڈیو میں ڈائریکٹر رہے محمد علی موج مرحوم نے بھی اردو کے مستقبل کا تذبذب محسوس کیا۔

کس سے جا کر پڑھوائیں　　خط اردو میں لکھا ہے

اور سستی شہرت پر ایک یہ بڑا طنز کیا۔

نہ حق ملا کوئی اردو زبان کو لیکن　　زباں درازوں کو اردو اکیڈمی تو ملی

فخر دبستان رام پور، عظمت وشہرت اور مقبولیت کی بین الاقوامی سطح پر نام ثبت کردینے والے صرف مشاعروں کے اسٹیج کو زینت اور صدر نشینی بخشنے والے ہی نہیں بلکہ ارباب نقد ونظر سے اپنی حیثیت تسلیم کرانے والے متعدد مجموعہ ہائے کلام کے خالق جناب اظہر عنایتی بقول ڈاکٹر ابوسفیان اصلاحی جن کی شخصیت سے شاعری پھوٹتی ہے، غزل کو جوان کردینے کے حق بجانب دعویدار جنہوں نے نئی تشبیہات اور جدید استعاروں سے غزل کو دل کش اور دل آویز پیکر عطا کیا ہے یہ رومانی شاعر جس نے کہا۔

نیا خوں رگوں میں رواں کردیا　　غزل ہم نے تجھ کو جواں کردیا

وہی اردو کے حال و مستقبل سے کافی حراساں ہیں اور اردو والوں کو تنبیہ کرتے ہیں کہ۔

کل اسے کون پڑھے گا اظہر　　نام اردو میں لکھا ہے میرا

اپنی تخلیقات دیوناگری میں لکھ کرلانے والے آج کے شعراء وشاعرات کے لیے ان کا مخلصانہ مشورہ ہے کہ۔

پڑھے بغیر یہ اردو بہت چلے گا نہیں　　اگر غزل کا تمہیں کاروبار کرنا ہے

اور پھر زیادہ مایوسی کے عالم میں کہتے ہیں۔

میر زادوں سے کیا ہوا اظہر　　کس کو اردو زباں دے جاؤں

حیرت واستعجاب یہ بھی ہے کہ۔

مٹ رہی ہے یہاں زبان و غزل　　اور غالب کا جشن جاری ہے

اور حد ملال تو یہ ہے کہ۔

یہ قبریں اہل اردو کی ہیں جن پر　　ہم اب ہندی کے کتبے دیکھتے ہیں

دبستان رام پور کا سفیر ایک نوجوان رومانی شاعر طاہر فراز جو دنیا بھر میں پہچانا جاتا ہے اور ہر طبقے میں بے حد مقبول ہے وہ اردو زبان کے تحفظ کا یوں مشورہ دیتا ہے۔

زندہ تمھیں رکھنا ہیں اگر اپنی کتابیں　　بچوں کو گھر میں ہی سہی اردو پڑھاؤ

سید شکیل غوث پیشے سے انجینئر کے طور پر ایسے محکمہ سے وابستہ رہے جو ہر گھر کو روشن رکھتا ہے مگر زندگی کا نصب العین دماغوں کو تہذیب وثقافت اور شعر وسخن سے منور رکھنا پہلے ہی بنا چکے تھے۔ یہ بڑی معیاری شاعری ہی نہیں کرتے بلکہ ملک زادہ منظور احمد اور انور جلال پوری ومنصور عثمانی جیسے ناظمان مشاعرہ کی طرح مقامی وبیرونی مشاعروں کو کامیابیوں کی بلندی تک پہنچانے میں ماہر ہیں۔ دہلی میں جشن غالب جیسے مشاعرے کی نظامت کا اعزاز سید شکیل غوث کو حاصل رہا، لکھنؤ میں گورنر ہاؤس میں بھی شعری نشست کی نظامت کی ہے۔ اپنی زبان پر فخر وانبساط اس طرح کرتے ہیں۔

ہمیں اردو وراثت میں ملی ہے　　سلیقہ ہم سے سیکھیں گفتگو کا

نام اردو ہے عشق میرا مزاج　　ایک تہذیب کی اساس ہوں میں

اور یہ قطعہ بھی۔

اہل ادب کے ہونٹوں پہ جاری بیان ہے　　شیریں بھی اور لطیف بھی اردو زبان ہے

حضرت ولی سے آج تک یہ عزوشان ہے　　"دوسو برس کے بعد بھی غالب جوان ہے"

دہلی میں دوسو سالہ جشن غالب کے مشاعرے کی دسمبر 1997 میں نظامت کرتے ہوئے جب یہ قطعہ پڑھا تو مشاعرے کا پورا ہال داد وتحسین سے گونج اٹھا۔

عرفان دانش سکندری: کسب معاش کے سلسلے میں برسوں امریکہ میں رہے لیکن ساتھ ہی پرورش لوح وقلم بھی کرتے رہے۔ گہرائی اور گیرائی ان کے کلام کا خاصہ ہے۔ رقص غبار نام کا مجموعۂ کلام امریکہ کے قیام کے دوران شائع ہوا۔ جس کی کاپی وہائٹ ہاؤس کی لائبریری میں بھی محفوظ رہی۔ زبان اردو سے متعلق ان کے اشعار ملاحظہ ہوں۔

پرکھوں کی تہذیب ہے اردو　　اس میں میری خوبو ہے

گنگا جمنی رنگ ہیں اس کے　　میرے وطن کی خوشبو ہے

دنیا بھر میں دھوم ہے اس کی　　اس کا اپنا جادو ہے

عبدالوہاب سخن: فراق صاحب کی طرح انگریزی ادبیات کی تدریس میں ایک عرصہ سعودی عرب میں گذارا لیکن دبستان رام پور سے وابستہ رہ کر سخن پروری کرتے رہے اور اردو زبان کے سپاس گذار رہے۔ آپ کے اشعار۔

اس رنگ میں لائی ہمیں تہذیب عشق　　لفظوں نے بتائی ہمیں تہذیب عشق

اردو کا ہی احساں ہے سخن یہ ہم پر　　اردو نے سکھائی ہمیں تہذیب عشق

اردو ہے اک حسینہ ادا شوخ وشنگ ہے　　ہے معنی آفریں بھی او ہفت رنگ ہے

خوشبو کی طرح پھیل گئی ہے یہ چارسو　　تشہیر اس کی دیکھ کے عالم بھی دنگ ہے

نعیم نجمی: آبپاشی کے محکمہ میں انتظامی افسر ہوکر کھیت کھلیانوں کو لہلہاتے رکھنے کے ساتھ شعر وسخن سے عوام کے ذہنوں کو بھی شاداب کرتے رہے ترنم بھی بہت اچھا ہے اردو کے بارے میں ان کا خیال ہے۔

میر وغالب داغ اور مومن جن کے لبوں پر روشن ہے

ان کی زباں کے اک اک حرف سے پیار کی خوشبو آتی ہے

میری چاہت میری غزلیں میرے گیت　　وہی سمجھ سکتا ہے نجمی جس کو اردو آتی ہے

حسان آفندی: محکمۂ مالیات میں محتسب یعنی Auditor رہے لیکن شعر وسخن کی Balance Sheet بھی متوازن ودرست رکھی۔ شاعری کے قدیم اسلوب اور جدید تقاضوں کو ملحوظ رکھتے ہیں۔ نظم گوئی میں بھی مہارت ہے۔ اردو کے حوالے سے رامپور کی تہذیب و معاشرت کے بارے میں فرماتے ہیں۔

یہاں نفرت کی گنجائش نہیں ہے　　یہاں سب لوگ اردو بولتے ہیں

کسی بھی قبر پر کتبہ نہیں ہے　　مگر اردو کی خوشبو آرہی ہے

یہ شاہراہ غزل ہے یہاں سنبھل کے چلو　　قدم قدم پہ یہاں اک نشان اردو ہے

ڈاکٹر جاوید نسیمی: قلم کے سپاہی، جوش ملیح آبادی کے پرستار، شاعری کے ساتھ افسانہ نگاری اور دیگر تحقیقی کارنامے انجام دینے والے شاہ جہاں پور کے پٹھان نے رام پور کو وطن ثانی بنالیا۔ دوست ساز اور دوست نواز ہیں۔ اردو کے لیے بڑے جمالیاتی احساسات رکھتے ہیں۔

واقف ہر راز سے ہے اردو زباں　　عشق کی دم ساز ہے اردو زباں
یہ امین مایۂ تہذیب ہے　　قابل صد ناز ہے اردو زباں
اہل دل کی ہے رفیق معتبر　　حسن کی ہمراز ہے اردو زباں
آج بھی اظہار الفت کے لیے　　معتبر آواز ہے اردو زباں
میر سے جاوید تک اس کے اسیر　　سحر ہے اعجاز ہے اردو زباں

ڈاکٹر معظم علی خاں معظم: حصول علم کے لیے علی گڑھ مسلم یونیورسٹی گئے اور وہیں کے ہوکر رہ گئے۔ ریاضی کے مدرس، اقلیدس کے ماہر، شاعری کے تمام زاویے درست رکھنے والے، یونیورسٹی کے مجاز ثانی۔ علی گڑھ اور رام پور کی تہذیب و ثقافت نے شخصیت اور شاعری کو چار چاند لگادیے۔ اردو کے سلسلے میں کہتے ہیں۔

ہے ریاضی سے محبت عشق اردو سے مجھے　　مشغلہ شعر وسخن تدریس میرا کام ہے
پھولوں کی طرح لفظ مہکتے ہیں معظم　　ہونٹوں پہ ترے نغمۂ اردو تو نہیں ہے

طالب رام پوری: تمام فنون لطیفہ کے ماہر، کہانی کار، ہر کینوس کو رنگوں سے کیف و جاذبیت بخشنے والے، اردو اور ہندی کے مختلف اخبار ورسائل کے مدیر، فلم اور ٹی وی کے اسکرپٹ رائٹر دارالخلافہ دہلی میں مستقل متوطن، اردو کے سلسلے میں اظہار کرتے ہیں۔

اجنبی چہرہ تھا بس دیکھا کیا　　دیر تک وہ میری آنکھوں میں جیا
کررہا تھا خوبصورت گفتگو　　میں نے اس کا نام اردو رکھ دیا

حسین افسر سنبھلی: تہذیب وتمدن کی ایک قدیم ترین بستی سنبھل کے رہنے والے ہیں لیکن رام پور سے ادبی، ذہنی وقلبی اور جذباتی رشتوں کو استوار رکھتے ہیں، انتہائی ملنسار اور روادار، ہر دلعزیز شخصیت، بہت ناپ تول کر شاعری کرنے والے اردو سے اردو والوں کی بے توجہی اور بے رغبتی پر حیرت زدہ ہیں۔

'جشن اردوزباں' کا نامہ　　ہندی بھاشا میں لکھ کے آیا ہے
سچ تو یہ ہے زبان اردو کو　　اردو والوں نے ہی مٹایا ہے
اپنی تہذیب کے مٹانے کو　　ایک نیا گل کھلا رہے ہیں ہم
لکھ کے اردو زباں کو ہندی میں　　جشن اردو منا رہے ہیں ہم

حالانکہ اردو کی اصل تعریف یہ ہے۔

کل زبانوں کی جان ہے اردو　　اور سہل البیان ہے اردو
جس کا ثانی نہیں حلاوت میں　　ایسی شیریں زبان ہے اردو

ڈاکٹر ممتاز عرشی: رام پور کی ایک عبقری اور یگانۂ روزگار شخصیت، ماہر غالبیات مولانا امتیاز علی عرشی کے صاحبزادے علوم سائنس کے مدرس محکمہ تعلیمات کے ڈائریکٹر اور اپنے نام کی طرح ایک ممتاز شاعر بلکہ شاعر ابن شاعر اردو کے بارے میں فرماتے ہیں۔

اردو کا ذکر لکھنؤ والوں کے سامنے　　تعریف مشک وہ بھی غزالوں کے سامنے
اردو زبان ہی نہیں تہذیب کا ہے نام　　جس کو نہ آئے اردو وہ توسن ہے بے لگام

س ش عالم اور شہزادہ گلریز دبستان رام پور کے ممتاز شعراء میں اہم مقام رکھتے ہیں اول الذکر ادبی، سماجی اور سیاسی لحاظ سے بھی ایک اہم شخصیت ہیں صولت پبلک لائبریری کے چیئرمین اور بڑی فعال جاذب نظر شخصیت لائبریری میں اور لائبریری کے باہر بھی ادبی محفلیں آراستہ کرکے شاعروں اور ادیبوں کو اعزازات بھی دینے کا اہتمام کرتے ہیں اردو کے عنوان سے دو اشعار فراہم ہوئے۔

ہر ایک لفظ میں ہندوستان بولتا ہے　　کچھ اس ادا سے وہ اردو زبان بولتا ہے
شکست خوردہ ہیں لیکن ہمارے لہجے میں　　امید فتح وظفر کا نشان بولتا ہے

شہزادہ گلریز غزل کو مخصوص رنگ وآہنگ دینے والے مرثیہ منقبت اور سلام گوئی میں ماہر فن اور انتہائی شہرت یافتہ شاعر ہیں لیکن اردو کے حوالے سے ان کے اشعار دستیاب نہیں ہوسکے۔

تمام سرکاری مزاحمتوں، سیاسی سازشوں اور معاندانہ کاوشوں کے اثر سے اردو رسائل واخبارات بند ہورہے ہیں اور جو رہ گئے ہیں وہ اردو والوں کی بے حسی اور قارئین وخریداروں کی تیزی سے گھٹتی تعداد کی وجہ سے قبر میں پاؤں لٹکے ہوئے جیسی حالت میں ہیں۔ تاہم دبستان رام پور میں اردو ادب اور شعروسخن کی آبیاری ہنوز ہورہی ہے۔ یعنی چکی کی مشقت کے ساتھ مشق سخن جاری ہے۔ لیکن اردو کے پیرہن کو داغوں سے پاک و صاف رکھنے یا اس پر آنے والے زخموں پر مرہم لگانے کے لیے جو جدو جہد انفرادی طور پر کی جارہی ہے وہ اردو کے اداروں اور خصوصا تعلیمی اداروں کی طرف سے زیادہ ہونا چاہیے کہ یہ وہ ذمے دار ادارے ہیں جنھوں نے اردو کی تعمیر وتاسیس کا کام انجام دیا تھا۔ مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے فارغین کی ایک قابل شمار تعداد آئی اے ایس اور پی سی ایس جیسے اعلی امتحانات میں کامیاب ہوکر اداروں کی عظمت واہمیت کو استوار کررہی ہے یہ نہایت خوش آئند اور اطمینان وفخر کی بات ہے لیکن اردو کے تحفظ اور ترویج وترقی میں عدم دلچسپی نہ صرف باعث حیرت وتشویش بلکہ افسوس ناک بھی ہے۔ عملا صورت حال یہ ہے ان اداروں میں انگریزی کی مہروں میں ہندی تو ہے مگر اردو سے یکسر اجتناب برتا جارہا ہے۔ یہی سارے عوامل ہیں جو اظہر عنایتی کے اس سوال کی سنجیدگی اور وزن کو مزید گراں بار کررہے ہیں کہ ع

کس کو اردو زبان دے جاؤں

مسلم یونیورسٹی اور جامعہ ملیہ اسلامیہ سے فارغین کی ایک قابل شمار تعداد آئی اے ایس اور پی سی ایس جیسے اعلی امتحانات میں کامیاب ہوکر اداروں کی عظمت و اہمیت کو استوار کررہی ہے یہ نہایت خوش آئند اور اطمینان و فخر کی بات ہے لیکن اردو کے تحفظ اور ترویج و ترقی میں عدم دلچسپی نہ صرف باعث حیرت و تشویش بلکہ افسوس ناک بھی ہے۔ عملا صورت حال یہ ہے ان اداروں میں انگریزی کی مہروں میں ہندی تو ہے مگر اردو سے یکسر اجتناب برتا جارہا ہے۔

مصادر

1　بابائے اردو ڈاکٹر مولوی عبدالحق: اردو کی ابتدائی نشو ونما میں صوفیائے کرام کا کام
2　ناظر کاکوری کے مقالے سے ایک اقتباس
3　امیر مینائی: انتخاب یادگار
4　محمد انصاراللہ: تاریخ ادب اردو

Abu Zar Abdul Ahad Furqani
Opposit Kohinoor Pustak Sadan
Shahabad Gate, Rampur - 244901 (UP)
Mob.: 09456217121

اردو میں ڈیجیٹائزیشن سمت و رفتار اور مستقبل

پرویز احمد اعظمی

ڈیجیٹائزیشن کا مفہوم یہ ہے کہ کمپیوٹر کی عمل کاری کے ذریعے معلومات رمواد کو اعداد و شمار کی ایسی صورت میں ڈھالنا کہ اسے کمپیوٹر، لیپ ٹاپ، ٹیبلٹ اور موبائل کے ذریعے مختلف صورتوں یعنی پڑھنے، محفوظ رکھنے اور ایک جگہ سے دوسری جگہ برقی پیغام کے ذریعے ارسال کرنے کا کام سر دست ہو سکے۔ اردو میں ڈیجیٹائزیشن کی اس وقت جو سمت و رفتار ہے، وہ بھارت کی کسی بھی زبان سے کم تر نہیں بلکہ بہتر اور برتر ہے۔ اردو میں ڈیجیٹائزڈ مواد صرف 'قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان'، 'ریختہ' اور 'اردو چینل' ہی کی ویب گاہ پر نہیں بلکہ مختلف ویب گاہوں جیسے:

www.marfat.com,http://kitabo sunnat.com, www.archive.org, www. urduweb.org, www.iqbalcyberlibrary.net, https://www.pdfdrive.com, www.pakso ciety.com, http://www.worldebooklibra ry.org, http://khurramsdesk. blo gspot. com, http://worldlibrary.org , http://w ww.urduli brary. org, www.daw ateisl ami.net/bookslibrary, www.iqbalkalmati. blogspot.com www.marxist.org , www.pdfbooksfree.pk

وغیرہ پر بھی موجود ہیں۔ اس کے علاوہ میرے علم کے مطابق درجنوں ویب گاہیں، بلاگس اور فیس بک گروپس بھی ہیں جو مفت کتابیں ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت فراہم کر رہے ہیں۔ مثلاً فیس بک پر: 'Urdu Digital Library'، 'اپنا کتاب گھر (FREE PDF BOOKS DOWNLOAD)'، 'روشن خیال لائبریری'، 'اردو بکس'، 'مفت اردو کتابیں، پی ڈی ایف اردو کتابیں (PDF Urdu books)، Urdu Bazaar,pdf books (encyclopedia), free books for tibb اور 'القلم (The Pen)' جیسے تقریباً 40 گروپ ہیں۔ اسی طرح واٹس ایپ اور ٹیلی گرام پر بھی کتب بینی، روشن خیال لائبریری، مفت کتابیں، اردو بکس راؤ، دارالمصنفین، القلم، اردو ادب (کشمیر)، اردو بکس، کتابستان، 'kutubistan' اور 'غیر مذہبی کتابوں کا عالمی گروپ' جیسے کئی ایک گروپ ہزار ہا کتابیں ڈاؤنلوڈ کرنے کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ایک اندازے کے مطابق لاک ڈاؤن میں صرف 'القلم' نے 5000 سے زائد کتابوں کا اشتراک کیا ہوگا۔ اس کے علاوہ کچھ گروپ ایسے بھی ہیں جو کتابیں فروخت کرنے کے لیے فیس بک، واٹس ایپ اور ٹیلی گرام پر اپنا پیج قائم کیے ہوئے ہیں۔ اس طرح وہ بھی کتابوں کی فراہمی میں آسانی پیدا کرنے کی خدمات انجام دے رہے ہیں۔ ایک مخصوص گروپ ابن صفی کی عمران سیریز کے دلدادہ لوگوں کا بھی واٹس ایپ پر موجود ہے۔

'ریختہ' اردو کی سب سے بہترین، بے مثل اور منفرد ویب گاہ ہے، جہاں بیش قیمتی اور نادر اردو کتابوں کا انمول ذخیرہ موجود ہے لیکن اس کی دستیابی صرف مطالعے کی حد تک ہے جب کہ دیگر ویب گاہوں، بلاگس، واٹس ایپ اور ٹیلی گرام گروپس و فیس بک گروپس رپیجز پر پی ڈی ایف فارمیٹ میں کتابیں و مضامین ڈاؤنلوڈ کرنے کی سہولت کے ساتھ موجود ہیں۔ اس وقت زیادہ تر نوجوان اسکالر اور اردو داں آن لائن ہی مطالعہ کرنا چاہتے ہیں مگر مجھ جیسے لوگ ڈاؤنلوڈ کر کے پرنٹ نکال کر، کتاب ہاتھ میں لے کر، کاغذ کے لمس کے ساتھ مطالعہ کرنا پسند کرتے ہیں۔ اس لیے ہم جیسے لوگ ڈاؤن لوڈ کرنے کی سہولت کو پسند کرتے ہیں۔

'واٹس ایپ' پر فراہمی کتب کے بہت سے گروپ ہیں لیکن اس کا منفی پہلو یہ ہے کہ اس میں ارکان کی تعداد 257 سے زیادہ نہیں ہو سکتی اور کتابیں ایک مہینے کے بعد خود کار طریقے سے ڈیلیٹ ہو جاتی ہیں جب کہ اس کے مقابلے 'ٹیلی گرام' پر گروپ کا فائدہ یہ ہے کہ یہاں ارکان کی تعداد 200000 تک ہو سکتی ہے اور اپلوڈ کی گئی تمام کتابیں ہمیشہ ڈاؤنلوڈ کے لیے موجود رہتی ہیں خواہ کوئی ایک سال پہلے سے ممبر ہو یا آج ممبر بنا ہو۔

اردو میں کتابوں کے ڈیجیٹائزیشن کی رفتار راقم السطور کے خیال سے نہایت معقول و مناسب ہے۔ اردو میں ڈیجیٹائزیشن کی رفتار مغربی ممالک کے ہم پلہ نہ سہی لیکن بھارت کی کسی دوسری زبان سے کم نہیں ہے۔ اس سلسلے میں صرف اتنا عرض کرنا ہے کہ جو قوم جتنی ترقی یافتہ ہوگی، اس کی زبان، اس کا تعلیمی نظام اور اس کے تصورات و تخیلات، اسی قدر بلند اور بہتر ہوں گے۔ ہم تیسری دنیا کے لوگ ہیں، ہم ابھی بھی ترقی کے مراحل طے کر رہے ہیں جب کہ مغربی ممالک کے لوگ ترقی یافتہ ہیں۔ اس لیے تیسری دنیا کے ممالک کا تقابل پہلی دنیا کے ممالک سے کرنا مناسب نہیں ہے۔

اردو سیکھنے سکھانے کے لیے اس وقت یوٹیوب پر وافر مواد ڈیجیٹل فارمیٹ میں دستیاب ہے، جس سے اردو بآسانی تلفظ کی مشق کے ساتھ ہر عمر کے لوگ سیکھ سکتے ہیں۔ اسی طرح پی ڈی ایف فارمیٹ میں کتابیں، رسائل و جرائد بھی پر مختلف ویب گاہوں اور بلاگس پر دستیاب ہیں۔ ہم اردو والوں کا مسئلہ یہ ہے کہ ہم کتابیں اردو کی حاصل کرنا چاہتے ہیں اور 'براؤزر' میں رومن اردو لکھ کر کتابیں تلاش کرتے ہیں۔ اگر ہم جالبین کے ذریعے مختلف ویب گاہوں پر دستیاب اردو ادب یا دیگر علوم یعنی مذہبی، تاریخی، سماجی علوم وغیرہ کی کتابیں یا مضامین اردو میں حاصل کرنا چاہتے ہیں یا اردو میں audio & video کی شکل میں مواد رلیکچر حاصل کرنا چاہتے ہیں تو کمپیوٹر، لیپ ٹاپ اور موبائل فون کے براؤزر میں پہلے اردو ہی میں لکھیں تو مواد کی دستیابی قدرے آسان ہو جائے گی۔ اس کے ساتھ ہی سافٹ ویر کمپنیاں اس طرف مزید توجہ دیں گی۔

الیکٹرانک ذرائع سے اردو سیکھنے سکھانے کا سلسلہ سن 2-2001 عیسوی میں ای ٹی وی اردو سے شروع ہوا تھا، جس میں رضی الدین صاحب (ماہر تعلیم، حیدرآباد) کی خدمات حاصل کی گئی تھیں۔ اس کے بعد ای ٹی وی اردو ہی پر 2008 تا 2010 'آؤ اردو سیکھیں' کے عنوان سے ایک اور پروگرام نشر ہوا تھا، جس کو پروفیسر مظفر شہ میری (موجودہ شیخ الجامعہ، عبدالحق اردو یونی ورسٹی، کرنول، آندھرا پردیش) نے بہت ہی سائنٹیفک طریقے سے پیش کیا تھا۔ اردو سکھانے کے لیے یہ اپنی طرح کا لاجواب پروگرام تھا، جس میں اردو بالخصوص حروف تہجی کو نہایت دلکش انداز سے سکھانے کی کوشش کی گئی تھی۔ اس

پروگرام کی تمام قسطیں یوٹیوب پر موجود ہیں۔ اس کے علاوہ 'طالب اردو' کے نام سے 'زی سلام' پر بھی اردو سکھانے کا ایک پروگرام نشر ہوا تھا۔ ٹی وی پر نشر ان پروگراموں سے قطع نظر ذاتی طور پر کئی لوگوں نے (ملک و بیرونِ ملک) اردو سکھانے کے لیے کتابیں، آڈیو، ویڈیو سی ڈی کے ساتھ شائع کی ہیں، جن میں انگریزی اور ہندی کے ذریعے اردو سکھانے کی کوششیں کی گئی ہیں۔

یہاں چند باتیں (معذرت کے ساتھ) تجربے کی بنیاد پر ساجھا کرنا چاہتا ہوں۔ راقم السطور نے 2012 میں انٹرنیٹ سے پہلی کتاب 'زہر عشق' ڈاؤنلوڈ کی تھی اور اس کے بعد یہ ایک سلسلہ بن گیا۔ 2010 میں جب خاکسار نے اردو وکی پیڈیا پر اپنا اکاؤنٹ بنایا تھا، اس وقت اردو وکی پیڈیا پر صرف 55000 مضامین دستیاب تھے جب کہ آج اردو وکی پیڈیا پر مختلف موضوعات سے متعلق 383، 107 مضامین موجود ہیں۔ اس کے علاوہ ایسے مضامین جو ابھی نامکمل یا زیرِ تدوین ہیں، ان کی تعداد 0208، 56 ہے۔ اس وقت اردو وکی پیڈیا کے ارکان کی تعداد 636، 56 ہے، جن میں تقریباً 200 ارکان فعال ہیں۔ یہ افسوس کی بات ہے کہ اتنی بڑی زبان کی ویب سائٹ پر ارکان کی تعداد صرف 56000 ہے جب کہ یہ اس سے کئی گنا زیادہ ہونا چاہیے۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ ابھی بھی اردو داں طبقہ اس طرف خاطر خواہ توجہ نہیں دے رہا ہے۔ ہمیں اور آنے والی پود کو اس طرف خاص توجہ دینے کی ضرورت ہے، تبھی ہم آنے والے وقت میں اپنی زبان کو دوسری زبانوں کے ہم پلہ بنائے رکھنے میں کامیاب ہو سکیں گے۔ نوجوان ریسرچ اسکالر، اردو داں اور شیدائیانِ اردو سے گزارش ہے کہ وہ اردو وکی پیڈیا یعنی www.ur.wikipedia.org پر اپنا اکاؤنٹ بنائیں کیونکہ وکی پیڈیا علم کا وہ ذخیرہ ہے، جہاں ہمہ قسم کی معلومات ہر وقت دستیاب رہتی ہیں۔ وکی پیڈیا پر اکاؤنٹ بنانا 2 منٹ کا کام ہے، اس سے زیادہ کا نہیں۔ اس لیے اردو اساتذہ، اسکالرز، محققین اور شیدائیانِ اردو سے التماس ہے کہ اپنے اپنے خطے کے ادیب، شاعر، ناقد اور قلم کاروں کی بنیادی اطلاعات وکی پیڈیا پر درج کرنے کی زحمت گوارا کریں۔ اس سے نہ صرف یہ کہ اردو کا مستقبل تابناکی کی طرف بڑھے گا بلکہ آنے والے زمانے میں جب کوئی ادبی مؤرخ اردو ادب کی تاریخ لکھے گا تو اس کی راہیں بھی قدرے آسان ہو جائیں گی۔ وہ اپنے مقام ہی پر رہتے ہوئے عالم گیر سطح پر پھیلے ہوئے اردو ادیبوں کا انتخاب بہ آسانی کر سکے گا۔ ادب کے علاوہ اردو وکی پیڈیا پر فلسفہ، جغرافیہ، عمرانیات، کیمیا، ریاضی، طبعیات، حیاتیات، مذاہب اور سیاسیات وغیرہ کی معلومات بھی درج کی جا سکتی ہیں، جس سے اردو داں طبقہ تمام علوم کی بنیادی معلومات بہ آسانی حاصل کر سکے گا۔ اس سلسلے میں ہمیں اپنی آنے والی پود سے کافی امیدیں ہیں کہ وہ اس سمت میں آگے بڑھے گی اور اپنی زبان کے فروغ کا حق ادا کرے گی۔

شاعری، بحر اور تقطیع کے بارے میں آج بھی یہ خیال کیا جاتا ہے کہ کسی استاذ کے بغیر اس علم کا سیکھنا دشوار ہے اور یہ صحیح بھی ہے لیکن اب ۲۱ ویں صدی میں کچھ ایسی چیزیں دستیاب ہو گئی ہیں کہ عروض اور تقطیع کو انٹرنیٹ کے ذریعے بھی پرکھا جا سکتا ہے۔ شعر کی تقطیع اور بحر کی آزمائش کے لیے ایک بار www.aruuz.com ضرور دیکھیں۔ یہاں مصرع یا شعر درج کرنے پر اس کی تقطیع خودکار طریقے سے ہو جاتی ہے، جس سے ہمیں شعر کے وزن کا اندازہ ہو جاتا ہے۔

یہاں ضمناً یہ بھی عرض کرتا چلوں کہ ونڈوز 7 اور اس کے بعد ونڈوز کے جو بھی ورژن آئے ہیں، سبھی میں اردو موجود ہے۔ اسی طرح لائنکس (linux) میں بھی اردو پہلے ہی سے موجود ہے۔ ہمیں اپنے کمپیوٹر اور لیپ ٹاپ میں اپنے ملک کے اختیار کو منتخب کرتے ہوئے اردو زبان کے اختیار کو بھی متحرک کر لینا چاہیے۔ ونڈوز ۷ تا ونڈوز ۱۰ اور یا لائنکس (linux) میں راست اردو لکھنے کے لیے Setting میں جا کر اپنے ملک کو منتخب کریں پھر زبان کے اختیار میں داخل ہو کر اردو کا انتخاب کر لیں۔ اس کے بعد آپ کے کمپیوٹر یا لیپ ٹاپ کے ٹاسک بار میں EN ظاہر ہو جائے گا۔ اس کا مطلب یہ ہے کہ آپ جب بھی اپنی مشین (کمپیوٹر) آن کریں گے تب عمومی اصول کے مطابق انگریزی لکھنے کے لیے مشین تیار ہوگی لیکن اگر آپ ای میل، پاور پوائنٹ یا ونڈوز میں راست اردو لکھنا چاہتے ہیں تو ٹاسک بار آپشن میں جہاں EN نظر آ رہا ہے، اس پر کلک کر کے UR کے آپشن کو منتخب کر لیں۔ اس کے بعد آپ راست طور سے اردو میں حسبِ ضرورت اپنا کام کر سکیں گے۔ اردو ان پیج میں فونیٹک یا آفتاب کی بورڈ استعمال کرنے والے اگر کی بورڈ کے استعمال میں دشواری کا سامنا کر رہے ہیں تو https://www.cdac.in کی ویب سائٹ سے multi lingual کی بورڈ یا گوگل کے ذریعے پاک اردو انسٹالر (Pak Urdu Installer) یا http://www.mbilalm.com/download/pak-urdu-installer.php لنک کو براؤزر میں ٹائپ کر کے اپنی پسند کا کی بورڈ انسٹال کر سکتے ہیں۔ اس کے علاوہ سینٹر فار لینگویج انجینیرنگ کی ویب سائٹ سے بھی فونیٹک کی بورڈ ڈاؤنلوڈ کیا جا سکتا ہے، جس کے لیے http://www.cle.org.pk/software/localization.htm پر جائیں۔ مندرجہ لنک کھلنے کے بعد 'تین' کی بورڈ' کے ڈاؤنلوڈ کا آپشن ہوگا، جس میں ورژن 1.1 فونیٹک کی بورڈ والوں کے لیے بہتر ہوگا۔ 'کی بورڈ' انسٹال ہونے کے بعد ان شاء اللہ ونڈوز یا لائنکس میں راست اردو حرف سازی آسان ہو جائے گی۔

ذیل میں کچھ ایسی ویب گاہوں کا پتہ درج کیا جا رہا ہے، جہاں سے براہِ راست کتابیں پی ڈی ایف فارمیٹ میں ڈاؤنلوڈ کی جا سکتی ہیں:

1. iqbalkalmati.blogspot.com, 2. urdupoint.com, 3. maktabah.org, 4. elmedeen.com, 5. urdulinks.com, 6. minhajbooks.com 7. books.ahlesunnat.net 8. ahlehadith.wordpress.com, 9.kutubistan.blogspot.com 10. shiamultimedia.com, 11. alahazrat.net,12. ishaateislam.org, 13. ownislam.com, 14. goodreads.com15. www.bl.uk/collection-guides/ind ia-office-records , 16. pinterest.com, 17. pressreader.com, 18. urdu.pratilipi.com 19. pdfstuff.blogspot.com

اس مقالے میں ابھی تک جن ویب گاہوں، فیس بک، ٹیلی گرام اور واٹس ایپ گروپس کا ذکر کیا گیا ہے۔ ان سے ہم لوگ خاطر خواہ کتابوں کے حصول کی کوشش کریں گے۔ درج بالا ویب گاہوں کے علاوہ بھی بہت سے ایسے گروپ موجود ہیں جو کتابوں کی فراہمی کے سلسلے میں بے لوث خدمات انجام دے رہے ہیں۔ بس ان تک رسائی کے لیے ہمیں ذرا سی زحمت کرنی ہوگی۔ اس کے بعد کتابوں کی سافٹ کاپی حاصل کرنا آسان ہو جائے گا۔ اب تک اس مقالے میں ہم نے جتنی باتیں کی ہیں، ان سے اس بات کا اندازہ لگانا قطعی مشکل نہیں کہ اردو میں ڈیجیٹائزیشن کی جو سمت و رفتار ہے، وہ کافی اطمینان بخش ہے اور آئندہ بھی اس میں وقت کی رفتار کے ساتھ مزید بہتری کی صورتیں پیدا ہونے کے قوی امکان ہیں۔

حوالے:

http://epaperarchives.deccanchronicle.com/epaper_main.aspx
https://ur.wikipedia.org/wiki/%D8%A7%D8%B1%D8%AF%D9%88
https://www.bbc.com/urdu/learningenglish/story/2004/08/040816_languages_an

■

Dr. Pervez Ahmed
Department of Urdu
Central University of Kashmir
Ganderbal-19120 (J&K)
Cont. 8803765953, p123azmi@gmail.com

ریڈیو اور اردو کا باہمی رشتہ

نظام الدین احمد

انسانی زندگی میں ترسیل وابلاغ کی اہمیت ہمیشہ سے رہی ہے۔ اسی کی بنا پر ہمارا سماجی ڈھانچہ قائم ہے۔ انسان نے جب تہذیبی وتمدنی زندگی بسر کرنا شروع کی اسی وقت اسے ترسیل کی قوت کا اندازہ ہوگیا تھا، جس کی بنا پر اس نے ترسیل کے ذرائع کی تحقیق وتفتیش بھی کی۔ اسی تحقیق کے تسلسل وارتقا کے پیش نظر جدید معاشرے میں میڈیا جیسے ذریعے کا انکشاف ہوا۔

میڈیا جس میں اخبارات، فلم، ریڈیو، ٹیلی ویژن وغیرہ شامل ہیں، جس نے ہماری سماجی، معاشی، معاشرتی، تعلیمی، تہذیبی اور ثقافتی زندگی کو پورے طور پر متاثر کیا ہے۔ موجودہ کلچر کو میڈیا کلچر کے طور پر متعارف کرایا گیا ہے۔ انسانی زندگی کا کوئی لمحہ ایسا نہیں ہے جو ان ترسیلی ذرائع کی دسترس سے باہر ہو۔ یوں تو سارے ہی ذرائع ابلاغ کی اہمیت اپنی جگہ مسلم ہیں، لیکن اس ضمن میں ریڈیو کی کچھ الگ ہی اہمیت ہے۔ دراصل انسانی سماج میں ریڈیو ایک وسیع ترسیلی ذریعے کی حیثیت رکھتا ہے۔ اس سے قبل ایسی کوئی سائنسی وتکنیکی ترقی کے آثار نہیں ملتے جنھوں نے آواز کو اس وسیع پیمانے پر ایک مقام سے دوسرے مقام تک پہنچایا ہو۔ ماس میڈیا کا یہ وہ نقش اول ہے جس نے آگے چل کر ٹیلی ویژن، موبائل فون اور انٹرنیٹ کی صورت بھی اختیار کرلی۔ موجودہ دور میں اس سے منقطع ہو کر زندگی نہیں گزار سکتے۔ ہر سطح پر اس کی ضرورت کا احساس ہوتا ہے بلکہ اس سے الگ ہوکر ہماری زندگی مفلوج ہوکر رہ جائے گی۔

ریڈیو کے ارتقائی سفر اور تاریخ پر نظر ڈالنے سے یہ بات واضح ہوجاتی ہے کہ انیسویں صدی کے نصف آخر میں جب سائنس اور ٹکنالوجی تیزی کے ساتھ ترقی کی جانب گامزن تھی اور زندگی کے ہر شعبے میں انقلاب آفریں تبدیلیاں ہورہی تھیں، تب اس تبدیلی نے پورے طور پر انسانی زندگی کو متاثر کیا۔ نت نئی ترقیات کی بنا پر ایک ایسا سفر شروع ہوا جو ٹیلی گراف، ٹیلی فون اور وائرلیس سے ہوتا ہوا ریڈیو تک پہنچا، جس نے دنیا کو ایک عالمی گاؤں کی شکل میں تبدیل کردیا۔

ہندستان میں ریڈیو کا آغاز 1921 میں ہوا، مگر باقاعدہ نشریات کا سلسلہ 1936 میں آل انڈیا ریڈیو کے قیام کے بعد شروع ہوا۔ جب ہندستان میں ریڈیو کی ابتدا ہوئی تو اسے سامعین سے رابطے کے لیے کسی ایسی زبان کی ضرورت تھی جو نہ صرف رابطے کا کام کرے بلکہ عوام وخواص میں یکساں طور پر رسائی حاصل کرسکے چنانچہ اس کے لیے اردو کا ہی انتخاب ہوا۔ کیوں کہ اس کے علاوہ دیگر زبانوں میں اس قوت کا فقدان نہیں تو کمی ضرور تھی۔ البتہ اردو ایسی زبان تھی جس کا وجود ہی عوامی رابطے کے تحت عمل میں آیا تھا۔ چنانچہ اسی بنا پر اردو کو 'ہندستانی' سے تعبیر کرتے ہوئے وسیع تر لفظیات کے استعمال کا فارمولا اختیار کیا گیا۔

دراصل کسی بھی زبان کی ترویج واشاعت میں ہماری شعوری کوششوں سے زیادہ سماجی ضرورتوں اور تقاضوں کا اہم رول ہوتا ہے۔ زبان کے ارتقا میں سماجی کردار کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ جب سماجی زندگی اپنی ضرورت کے لیے کسی زبان کو اظہار کا ذریعہ بناتی ہے تو اس زبان کی ترقی میں اجتماعی اعمال کا خیال رکھنا نہایت ضروری ہوتا ہے۔ اردو زبان بھی اس کلیے سے الگ نہیں۔ یہ زبان ترقی کے مختلف مراحل طے کرکے ادبی اور صحافتی زبان بنی ہے۔ اس کی نشوونما میں آبادیوں کے تبادلے اور لشکری خصوصیات نے نہ صرف نمایاں کردار ادا کیا بلکہ اس کو

> **جب ہندستان میں ریڈیو کی ابتدا ہوئی تو اسے سامعین سے رابطے کے لیے کسی ایسی زبان کی ضرورت تھی جو نہ صرف رابطے کا کام کرے بلکہ عوام وخواص میں یکساں طور پر رسائی حاصل کرسکے چنانچہ اس کے لیے اردو کا ہی انتخاب ہوا۔ کیوں کہ اس کے علاوہ دیگر زبانوں میں اس قوت کا فقدان نہیں تو کمی ضرور تھی۔ البتہ اردو ایسی زبان تھی جس کا وجود ہی عوامی رابطے کے تحت عمل میں آیا تھا۔ چنانچہ اسی بناپر اردو کو 'ہندستانی' سے تعبیر کرتے ہوئے وسیع تر لفظیات کے استعمال کا فارمولا اختیار کیا گیا۔**

اظہار کی ایک مکمل شکل بھی عطا کی۔ اسی لیے اپنی ابتدا سے ہی اردو ترسیل اور رابطے کی زبان رہی ہے۔ بقول پروفیسر احتشام حسین "ہر زبان کی طرح اردو کو بھی سماجی ضروریات نے جنم دیا جس میں آہستہ آہستہ تہذیبی خیالات اور ادبی تخلیقات کے لیے جگہ بنتی گئی۔ اردو کو تاریخ نے جنم دیا، اس کے نشوونما کے لیے ماحول پیدا کیا اور ایک ایسے معیار پر پہنچا دیا کہ اٹھارہویں انیسویں صدی میں متعدد ملکی اور غیر ملکی علما نے 'ہندستانی' کی شکل میں اسے ملک کی محور زبان کا لقب عطا کیا۔"

اردو کو چونکہ سماجی ضروریات نے جنم دیا، اس لیے اس میں اظہار کی گنجائش زیادہ ہے۔ یہ ایک مسلمہ حقیقت ہے کہ اردو خالص ہندستانی زبان ہے۔ اس کی تشکیل وتعمیر میں متعدد ہندستانی بولیوں اور زبانوں کے الفاظ شامل ہیں۔ اس کا وجود ہی عوامی رابطے کے تحت عمل میں آیا۔ اس لیے ابتدا سے ہی اسے عام بول چال کی حیثیت حاصل رہی اور اس نے اپنی لچک کا ثبوت دیتے ہوئے ادبی حیثیت بھی اختیار کرلی۔ فورٹ ولیم کالج کی مثال ہمارے سامنے ہے۔ کالج کا

قیام ہندستانی زبانوں کی ترقی کے مقصد سے عمل میں نہیں آیا تھا بلکہ اس کا نصب العین ایسٹ انڈیا کمپنی کی تجارتی اور سیاسی ضروریات کو پورا کرنا تھا۔ لیکن سماجی ضرورتوں کی وجہ سے اردو زبان کو بہت فائدہ ہوا۔ کالج کے زیر انتظام آسان اور عام فہم زبان لکھنے کا چلن عام ہوا۔ پھر دھیرے دھیرے اردو زبان کے ماہرین نے اس میں مختلف علوم وفنون کے اتنے خزینے بھر دیے کہ یہ ہر طرح کے اظہار پر قادر ہوگئی اور ہندستان کی مقبول عام زبان بن گئی۔

ریڈیو کے لیے بھی ایسی ہی ایک زبان کی ضرورت تھی جو نہ صرف رابطے کا کام کرے بلکہ سماجی ضرورتوں کو بھی پورا کرے۔ اسی کے باعث ہندستان میں ریڈیو نشریات کی ابتدا سے ہی اردو کو اہمیت دی گئی اور اسے ترسیل کی زبان کے طور پر استعمال کیا گیا۔ دوسری طرف خوش قسمتی سے اس نئے میڈیم کے آغاز میں ہی پطرس بخاری اور ذوالفقار علی بخاری کی صورت میں دو ایسے اذہان ریڈیو کو ملے جنھوں نے اس نئے میڈیم کے تقاضوں کو تابانی بخشی۔ یہ اردو زبان وادب کا وہ زمانہ ہے، جس میں بڑے بڑے ادیب وشاعر پیدا ہوئے۔ اس زمانے کے ادیبوں نے نہ صرف اردو میں ادبی پروگرام پیش کیے بلکہ مختلف النوع پروگراموں میں انھوں نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا ان میں ملا واحدی، خواجہ عبد المجید دہلوی، مولوی عبد الرحمٰن، پنڈت برج موہن دتاتریہ کیفی، بیخود دہلوی، جے نند کمار، حکیم ذکی احمد دہلوی، ممتاز حسین، خواجہ غلام السیدین اور مولانا عبد الماجد دریابادی اہم ہیں۔ ان لوگوں نے شاعروں اور ادیبوں پر پہلی بار ریڈیو کے لیے تقریریں لکھیں۔

ان تمام لوگوں کو پطرس بخاری اور ذوالفقار علی بخاری نے ریڈیو کے لیے ٹاک لکھنے کی دعوت دی تھی جو خود اس نئے میڈیم کے تقاضوں سے اچھی طرح واقف تھے۔ اس لیے ان لوگوں نے ریڈیو کے لیے لکھنا شروع کیا تو بخاری برادران نے ان کی رہنمائی کی۔ اس طرح اردو ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کی ایک بڑی تعداد براہ راست ریڈیو سے وابستہ ہوگئی۔

ڈرامے کی دنیا میں ریڈیو کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جب تھیٹر زوال پذیر تھا تو ریڈیو نے اس کو نہ صرف نئی زندگی دی بلکہ ہندستانی ڈرامے میں ایک نئی جان بھی ڈال دی۔ آہستہ آہستہ ریڈیو ڈراما عوام میں مقبول ہونے لگا بہت ہی کم دنوں میں ریڈیو ڈرامے نے ایک صنف کی حیثیت سے اپنی جگہ بنالی۔ اس زمانے کے شعرا وادبا نے ریڈیو ڈرامے کی ترویج وترقی میں بڑھ چڑھ کر حصہ لیا جس میں سعادت حسن منٹو، کرشن چندر، راجندر سنگھ بیدی، شوکت تھانوی، انصار ناصری، عشرت رحمانی، رفیع پیر، عابد علی عابد وغیرہ اہم ہیں۔ واقعتاً انھی لوگوں نے ریڈیائی ڈراموں کی بنیاد رکھی۔ ان لوگوں سے پہلے اردو میں ریڈیو ڈرامے کی کوئی روایت نہیں ملتی۔

متعدد ادیبوں نے ریڈیو کے لیے نہ صرف ڈرامے لکھے بلکہ ٹاک فیچر اور دوسری نوعیت کے پروگرام بھی مرتب کیے۔ ان کی ادبی اور صحافتی تخلیقات سے اردو زبان وادب کو فروغ حاصل ہوا۔ اس لیے یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ اس زبان کو ایک نیا رنگ عطا کرنے کا سہرا آل انڈیا ریڈیو کے سر جاتا ہے۔

ریڈیو نے ابتدائی دور میں اردو زبان کی غیر معمولی خدمت کی۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ اس ہندستانی زبان نے ریڈیو کی سماجی ضرورت کو پورا کیا۔ ریڈیو پر جو زبان ہندستانی کے نام سے استعمال ہوئی تھی، وہ دراصل آسان اور بول چال کی اردو تھی۔ ریڈیو کی سب سے بڑی خدمت علمی، ادبی اور سائنسی معاملات کے اظہار کی سطح پر زبان کو بول چال سے قریب تر لانا تھا۔ بخاری برادران، خاص طور پر ذوالفقار علی بخاری کی شخصیت اور کوششوں نے اس وقت کے نامور ادیبوں، شاعروں اور دانشوروں کو نشریات سے روشناس کیا اور انھیں 'تحریری زبان' لکھنے کے بجائے بول چال کی زبان کی طرف راغب کیا۔ اس دور کا شاید ہی کوئی قلم کار ایسا ہوگا جس نے ریڈیو سے اپنا رشتہ نہ جوڑا ہو۔ دراصل اردو زبان بہ یک وقت تحریری زبان اور بول چال کی زبان کے لیے نہایت موزوں رہی ہے۔ اس لیے ریڈیو کے تقاضوں کو اس بول چال کی زبان نے بخوبی پورا کیا۔ گویا سامعین کو ان کی اپنی زبان میں ریڈیو کا ساتھ ملا جو آج بھی کسی نہ کسی صورت میں موجود ہے۔ غیر اردو نشریاتی پروگرام میں بھی اس زبان کا استعمال ضروری ہوگیا ہے۔ بالخصوص "ہندی" نشریات میں اس زبان کا استعمال اس طرح سے ہو رہا ہے کہ بعض دفعہ دھوکا ہونے لگتا ہے کہ یہ کون سی زبان ہے۔ گویا ہندستان میں الیکٹرانک میڈیا کا وجود اس بول چال کی زبان کے بغیر ممکن نہیں۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ اس زبان نے ریڈیو کو بھی اپنے سحر میں لے لیا اور آج بھی سماجی ضرورتوں کے پیش نظر غیر اردو نشریات میں بھی اس زبان کو نظر انداز کرنا مشکل ہوگیا ہے۔ ان باتوں سے اندازہ لگایا جاسکتا ہے کہ ریڈیو اور اردو کا رشتہ کتنا مضبوط اور توانا ہے۔

ڈرامے کی دنیا میں ریڈیو کا ایک بڑا کارنامہ یہ ہے کہ جب تھیٹر زوال پذیر تھا تو ریڈیو نے اس کو نہ صرف نئی زندگی دی بلکہ ہندستانی ڈرامے میں ایک نئی جان بھی ڈال دی۔ آہستہ آہستہ ریڈیو ڈراما عوام میں مقبول ہونے لگا بہت ہی کم دنوں میں ریڈیو ڈرامے نے ایک صنف کی حیثیت سے اپنی جگہ بنالی۔

ریڈیو نے زبان کے ساتھ ادب کو بھی بہت فائدہ پہنچایا اور ہر سطح پر اپنے اثرات مرتب کیے۔ مثلاً ٹاک، فیچر، ڈراما، انٹرویو وغیرہ جملہ اصناف ظاہر ہے کہ تحریری ادب میں بھی غیر متعارف نہیں ہیں۔ لیکن ریڈیو کا قابل قدر کارنامہ یہ ہے کہ ان اصناف کو اس نے اس طرح اپنایا کہ وہ خود ریڈیو کا اٹوٹ انگ بن گئیں اور ان تمام عنوانات کے اوائل میں ریڈیو کا لفظ بھی اس طرح جڑ گیا گویا یہ اصناف ریڈیو ہی کے لیے وجود میں آئی ہیں۔

ظاہر ہے کہ اردو میں ریڈیائی ادب کی ایک اچھی روایت ہے جس میں ادبی پروگراموں کا ایک وسیع ذخیرہ موجود ہے۔ جس سے یہ اندازہ ہوتا ہے کہ ہندستان میں ریڈیو کے ابتدائی دور میں کس طرح ہمارے بزرگ ادیبوں نے اس نئے میڈیم کو زبان کے حوالے سے ایک مخصوص معیار تک پہنچایا، اور ساتھ ساتھ ریڈیو کے توسط سے اردو ادب کے دامن کو عظیم تخلیقات سے نوازا۔ انھوں نے ادب میں نئے نئے تجربے کیے۔ چونکہ ریڈیو کے لیے عام فہم اور سادہ زبان کو مناسب قرار دیا گیا، اس لیے اردو

ادیبوں نے عام فہم اور سادہ زبان میں نئی نئی تخلیقات پیش کیں، جس سے ایک نیا اسلوب ابھر کر سامنے آیا۔ اس طرح ہم دیکھتے ہیں کہ ریڈیو کا اردو سے بہت ہی گہرا رشتہ رہا ہے۔ دونوں ایک دوسرے کو آگے بڑھانے اور پروان چڑھانے میں معاون رہے ہیں۔ ریڈیو نے جہاں اردو زبان کے الفاظ کو اپنا کر ایک طرف خود کو زندگی کی حرارت دی ہے، وہیں دوسری طرف اس نے زبان کے حسن سے لوگوں کو آشنا بھی کیا ہے۔ جہاں ریڈیو نے اردو کے حسین الفاظ اور اس کے اسلوب کا سہارا لے کر دور دراز تک رسائی حاصل کی، وہیں اس نے ان خطوں اور علاقوں میں بھی اردو کے الفاظ کو رائج کیا جو اردو کے علاقے نہیں تھے۔

■

Nezamuddin Ahmad
Quadri Manzil
Church Road, Chandwara
Muzaffarpur-842001 (Bihar)

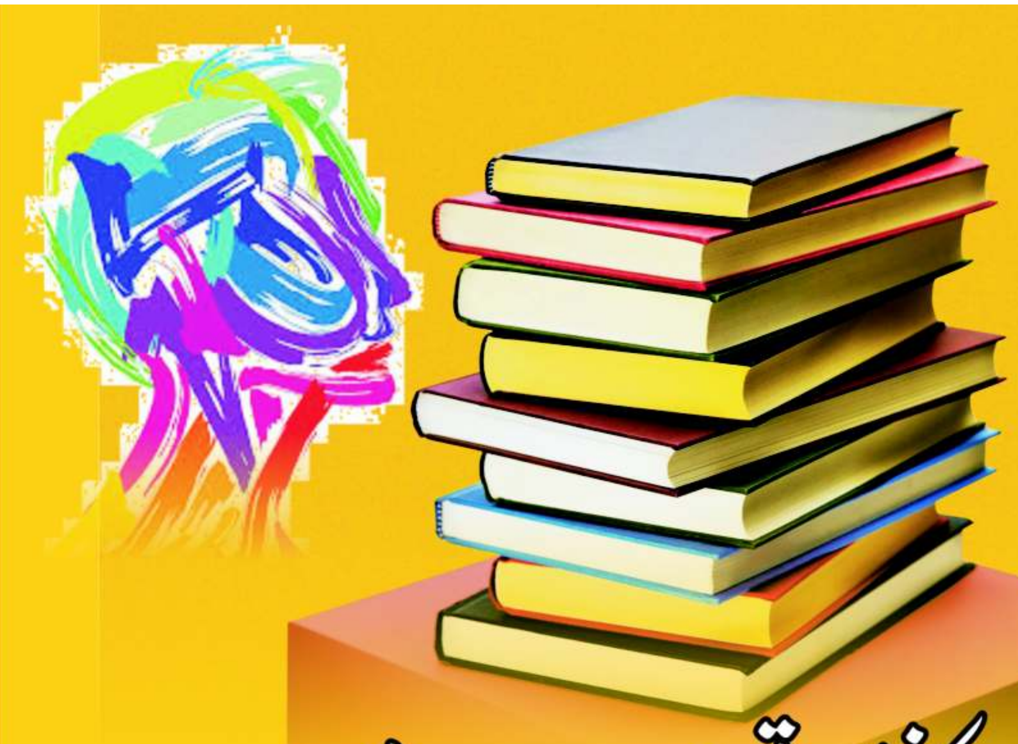

وحید الظفر خاں

کتھارسس کی نفسیاتی اہمیت اور ادبی معنویت

انسانی تہذیبوں کے عروج وزوال کے تاریخی تسلسل میں سب سے اہم اور قابل غور مسئلہ انسانی نفسیات کے عناصر ترکیبی میں استحکام اور پائیداری کا ہے تغیر و تبدل کے اس عظیم ترین منظرنامہ میں صرف انسان کی ذہنی محسوساتی اور جذباتی کشمکش کا جو نفسیاتی میکینزم موجود ہے وہ ہابیل اور قابیل کی ذہنی اور جذباتی کیفیت کی طرح آج بھی غیر مبتدل ہے۔ لالچ، حسد، خوف، ترحم، غم پذیری دلگیری، غصہ، نفرت، تکبر، محبت، ایثار وغیرہ جذبوں سے معمور انسانی نفسیات ایک انتہائی پیچیدہ تخلیق ہے۔ ان متضاد جذبات کو ایسے سلیقے سے پیوست کیا گیا ہے کہ خود انسان کو بھی کسی جذبے سے متاثر ہونے یا مغلوب ہونے کا احساس تک نہیں ہوتا۔ جذبات کے اس پیچیدہ اور نادیدہ نظام کو نفسیات انسانی کا نام دیا گیا ہے۔ ہر جذبہ موجود ہوتے ہوئے بھی ناموجود رہتا ہے انسانی رشتوں کے تصادم سے تحریک پا کر ہی کوئی جذبہ ابھرتا ہے اور کبھی کبھی وہ جذبہ اس قدر طاقتور ہوتا ہے کہ انسانی وجود اور اس کی توانائیاں خس و خاشاک کی طرح بہہ جاتی ہیں اور وہ انسان بھی اسی کے ساتھ بہہ جاتا ہے۔ اسی نفسیاتی نظام میں جہاں طغیانی ہے وہاں اس کا سدّ باب بھی موجود ہے جس طرح انسانی خون میں سرخ وسفید ذرات کا لائحہ عمل موجود ہے جو انسانی جسم میں کسی بھی فساد کے لیے دفاعی میکینزم کا کام کرتا ہے اسی طرح جذبات کی افراط و تفریط کا نظام برپا کیا گیا ہے۔ جذبات پر غالب آنا یا مغلوب ہونا دونوں کا اختیار انسان کو دیا گیا ہے۔ بے راہ رو جذبات کی سرکشی جب انسان کے عملی اقدام کی تحریک بنتی ہے تو اس کی اذیت وعقوبت کا ایک سلسلہ بھی ساتھ لاتی ہے جو اس کے تزکیہ نفس کے لیے ایک محرک کا کام کرتی ہے۔

> ادب انسانی زندگی کے تقریباً تمام داخلی و خارجی مضمرات و محرکات کا جائزہ لے کر انسانی فہم و فراست کو بالیدگی عطا کرتا ھے۔ انسانی تزکیۂ نفس کی اھمیت کے پیش نظر ان عوامل کو پرکھنا بھی ضروری ھے جو کسی المیہ کی بنیاد بنتے ھیں۔ یونانی فلاسفر ارسطو نے تزکیہ نفس جس کو یونانی زبان میں Catharsis کہا جاتا ھے کو ایک ڈرامائی تھیوری کے طور پر پیش کیا ھے جس کے ذریعے انسانی جذبات کی حربیت اور تضبیط کی جاسکتی ھے۔

ادب انسانی زندگی کے تقریباً تمام داخلی و خارجی مضمرات و محرکات کا جائزہ لے کر انسانی فہم و فراست کو بالیدگی عطا کرتا ہے۔ انسانی تزکیۂ نفس کی اہمیت کے پیش نظر ان عوامل کو پرکھنا بھی ضروری ہے جو کسی المیہ کی بنیاد بنتے ہیں۔ یونانی فلاسفر ارسطو نے تزکیہ نفس جس کو یونانی زبان میں Catharsis کہا جاتا ہے کو ایک ڈرامائی تھیوری کے طور پر پیش کیا ہے جس کے ذریعے انسانی جذبات کی حربیت اور تضبیط کی جاسکتی ہے۔ یہ اصطلاح اردو ادب میں مستعمل نہیں کیونکہ اردو ادب میں المیہ ڈراموں کا وفور اس سطح پر نہیں ہوا کہ اس کی مقصدیت یا معنویت کے لیے کسی اصطلاح کی ضرورت محسوس ہوئی۔

یونانی ٹریجڈی جس کو اردو ادب میں المیہ کہا جاتا ہے ایک مخصوص ترین تعارف سے متصف ہے۔ ہر المناک منظر جہاں انسانی زندگی کے جان و مال کا زیاں ہو ٹریجڈی نہیں کہا جاسکتا جیسے سونامی، سمندری طوفان، زلزلہ، آتش فشاں کے گرم سرخ بہتے ہوئے لاوے سے انسانوں کی بستیوں اور زندگیوں کا ضائع ہوجانا۔ ایسے حادثات کے لیے Natural Calamity کی اصطلاح وضع کی گئی ہے درحقیقت ایسے منظر سے بڑا المیہ اور کیا ہوسکتا ہے کہ پل بھر میں سب کچھ بے منظر ہوجائے اور انسان بے دست و پا دیکھتا رہ جائے۔ دراصل ٹریجڈی کا مقصد ہر دور کے ہر انسان کے لیے ذہنی و نفسیاتی تربیت ہے تاکہ انسان ان کوتاہیوں سے پرہیز

کرے اور ان لغزشوں کا اعادہ نہ کرے جس کے ردعمل نے کسی ٹریجڈی کو جنم دیا۔ انسانی فطرت ہمیشہ مسرت و انبساط کو ترجیح دیتی ہے۔ طربیہ ڈرامہ اس ضرورت کو ایک حد تک پورا کر دیتا ہے لیکن یہ بھی ایک صداقت ہے کہ طرب و نشاط کی کیفیت انتہائی عارضی اور اکتا دینے والی ہوتی ہے انسانی روح میں کوئی تموج یا کوئی ہلچل پیدا نہیں ہوتی۔ اس کے برعکس المیہ کا منظرنامہ انسانی عمل اور ردعمل کا آئینہ دار ہوتا ہے زندگی کی تلخ حقیقتوں سے جو بصیرت افروز مسرت کا احساس ابھرتا ہے وہ ایک نئے علم کا انکشاف کرتا ہے۔ جب کوئی انسان ناجائز خواہشوں کی تکمیل میں ناجائز طریقے اختیار کرتا ہے تو خواہش کی ناکامی کے ساتھ ساتھ اپنے وجود کا سارا اثاثہ بھی گنوا دیتا ہے۔ ایسے المناک اور کربناک منظرنامہ کا شریک ہر فرد المیہ کے ہیرو پر خود کو قیاس کرنے لگتا ہے انسانی نفسیات کی گرہیں کھلنے لگتی ہیں۔ عروج و زوال کے اس منظرنامہ کے محرکات و مضمرات آشکارا ہونے لگتے ہیں اور ہر انسان اپنی آزادی اور اختیار کے حدود پر نظرثانی کرنے لگتا ہے۔

ارسطو نے المیہ ہیرو کے لیے کچھ شرائط وضع کی ہیں جو شخص ان شرائط کا حامل ہوتا ہے وہی المیہ ہیرو بننے کا اہل سمجھا جاتا ہے ہر عام شخص المیہ ہیرو تسلیم نہیں کیا جاسکتا چاہے وہ اذیت کی ہولناک ترین صورت حال کا شکار ہو۔ المیہ ہیرو کے لیے ضروری ہے کہ وہ عوام الناس میں اپنی شخصی حیثیت کے اعتبار سے بلند ترین منصب پر فائز ہو جیسے بادشاہ، شہزادہ، فوجی کمانڈر وغیرہ اور عوام اس کو اچھی نظر سے دیکھتی ہو۔ وہ شخص اپنے کردار و عمل سے ایک نارمل انسان ہو نہ بہت زیادہ نیک خصلت اور نہ ہی بدی کا مجسمہ کیونکہ بدکردار انسان کے بدانجام سے انسانی جذبات کی تزکیہ کاری ممکن ہی نہیں البتہ ایک نارمل نیکوکار انسان کے زوال سے خوف اور دردمندی کے جذبات برانگیختہ ہوکر تزکیہ نفس کا سبب بنتے ہیں۔ المیہ کردار میں تمام خوبیوں کے باوجود ایک ایسا داخلی نقص موجود رہتا ہے جو اس کی تباہی و بربادی کا سبب بنتا ہے جس کو یونانی اصطلاح میں Hamartia (ہمارشیا) کہا جاتا ہے۔ انسانی زندگی میں بشری کمزوری کا اعتراف اس لیے ضروری ہے کہ وہ انسان کو بااختیار ہونے اور آزادی کے ساتھ اپنے جذبات وشہوات پر قدرت کاملہ کے التباس کا احساس کراسکے۔ ایسا نقص ہی دراصل انسانی سرشت میں پیوست رہتا ہے جو وقت، نسل، قوم اور مقام کی زد میں نہیں آتا۔ ہر دور کے ہر انسان کے نفسیاتی خمیر میں گندھا رہتا ہے اور تخریب کا سبب بنتا ہے لیکن اس کا اہم ترین پہلو دراصل انسانی عمل کی کارکردگی میں مضمر رہتا ہے۔ اگر وہ نفسیاتی نقص عمل کی شکل میں نہیں ڈھلتا تو انسانی کردار کی عظمت وحرمت کو کوئی زوال نہیں آتا۔ انسان کے عمل میں اختیار کی آزادی کی اہمیت اسی لیے دوچند ہو جاتی ہے کہ نیک و بد دونوں پہلو اس کے پیش نظر رہتے ہیں اور دونوں کے درمیان انتخاب کی آزادی کا حق اور عمل کی قوت وقدرت کے ساتھ عمل کا فیصلہ اس کے مستقبل کا ضامن ہوتا ہے۔ ہر انسان اپنی تدبیر کا خود ہی معمار ہے یہ تصور ارسطو کے المیہ کا ہے۔

Every man is an architect of his own destiny

اس تصور کے برخلاف انسانی اختیار و عمل میں انتخاب و آزادی کا تصور ٹامس ہارڈی کی المیاتی کائنات میں موجود نہیں ہے۔ ٹامس ہارڈی ملکہ وکٹوریہ کے دور کا ایک نہایت مشہور شاعر اور ناولسٹ ہے اس کا عقیدہ ہے کہ یہ کائنات خدا کے وجود سے خالی ہے۔ انسان ایک مجبور محض ذی روح ہے جو اپنی قسمت اور تقدیر ساتھ لے

جب کوئی انسان ناجائز خواهشوں کی تکمیل میں ناجائز طریقے اختیار کرتا هے تو خواهش کی ناکامی کے ساتھ ساتھ اپنے وجود کا سارا اثاثه بھی گنوا دیتا هے۔ ایسے المناک اور کربناک منظرنامه کا شریک هر فرد المیه کے هیرو پر خود کو قیاس کرنے لگتا هے انسانی نفسیات کی گرهیں کھلنے لگتی هیں۔ عروج و زوال کے اس منظرنامه کے محرکات و مضمرات آشکارا هونے لگتے هیں اور هر انسان اپنی آزادی اور اختیار کے حدود پر نظرثانی کرنے لگتا هے۔

کر پیدا ہوا ہے اور اسی کے تابع رہ کر اپنی پوری زندگی گزارنے پر مجبور ہے۔ اس کا ہر عمل پہلے سے طے شدہ ہے جس پر وہ گامزن رہتا ہے۔ ساتھ ہی ہارڈی کا یہ بھی عقیدہ ہے کہ اس دنیا میں کچھ نادیدہ منتقمانہ قوتیں برسرپیکار ہیں جو انسان کو ایک کٹھ پتلی کی طرح استعمال کرتی ہیں اور ہمہ وقت آمادہ رہتی ہیں کہ انسان کو کوئی مسرت کا لمحہ میسر نہ ہو ہارڈی اپنے مشہور ناول میئر آف کیسٹر برج (Mayor of Casterbridge) میں رقم طراز ہے کہ:

"Happiness is an occasional episode
in the general drama of pain."

انسانی زندگی آلام و مصائب کی ایک درد بھری داستان ہے جس میں خوشی صرف ایک اتفاقی واقعہ ہو سکتی ہے جس دنیا میں خدا کا تصور نہ ہو اس کے وجود پر یقین نہ ہو وہاں بے بسی بے کسی اور قنوطیت کا تسلط ہوتا ہے ایسی دنیا کا انسان صرف Chance اور Fate کو ہی محرک حیات مانتا ہے کیونکہ وہ خود کسی بھی فعل و عمل کے لیے نہ مختار ہے اور نہ ہی ردعمل کے لیے ذمے دار۔

ارسطو نے کتھارسس کے Process کو ایک فلسفیانہ نظر سے دیکھنے کی کوشش کی ہے۔ ارسطو کے پیش نظر خدا اور انسان کے مابین ایک بے حد مقدس اور روحانی رشتہ ہے۔ البتہ خدا انسانی معاملات میں دخیل نہیں لیکن انسان خدا کی ذات اور اس کی صفات پر پورا یقین رکھتا ہے۔ وہ خدا جو اس دنیا میں اور مابعد دنیا (Here and Here after) میں جزا اور سزا کا مختار کل ہے۔ انسانی تہذیب اور نفسیات کی تہذیبی ساخت میں اس عقیدے کی کارفرمائی نہایت اہم اور موثر رول ادا کرتی ہے۔ ارسطو کے تصور خدا کے مطابق انسانی دل اس جذبے سے معمور ہے کہ اس سے محبت کرنے والا ایک دوست آسمان میں ہے جو غم والم میں اس کی پکار سنتا ہے جو اس کی امیدوں اور آرزوؤں کا مرکز ہی نہیں مددگار بھی ہے اور اس عظیم کائنات کے ہر حرکت و عمل کے پس پردہ اسی کی قدرت اور حکمت کارفرما ہے۔ خدا کے وجود کا یہ تصور انسانی معاشرے میں باہمی رشتوں کی اہمیت کو زیادہ جلا بخشتا ہے اور ہر فرد کو دوسرے فرد کی اخلاقی ذمے داری کا احساس دلاتا ہے۔ کسی بھی ٹریجڈی کا ہیرو زندگی کے کسی بھی بلند منصب پر فائز ہو لیکن بہ حیثیت انسان اگر وہ جرم یا گناہ کا ارتکاب کرتا ہے تو سزا کے قانون سے بچ نہیں سکتا۔ مثال کے طور پر اگر کسی شخص کا ہاتھ آگ میں پڑ جائے تو ردعمل کے طور پر یقیناً جل جائے گا کیونکہ اگر عمل سرزد ہو گیا چاہے دانستہ طور پر یا نادانستہ طور پر ردعمل ضروری ہے۔ فطرت کے وضع کردہ قانون میں کسی طرح کی لچک کا امکان ہی نہیں۔ المیہ کردار کی نمایاں ترین خصوصیت دراصل عمل کی آزادی کا غلط یا ناجائز استعمال ہے۔ یہاں ارادہ و نیت اچھی یا بری کسی طرح بھی قابل لحاظ نہیں۔ کوئی بھی شخص اپنے دل میں کسی کو قتل کرنے، زنا کرنے، چوری کرنے جیسے جرائم کرنے کا ارادہ رکھتا ہے وہ کسی سزا کا مستوجب قرار نہیں پاتا جب تک اس کا ارادہ اس کو عمل پر آمادہ نہ کرے اور عمل سرزد نہ ہو۔

اسی ضمن میں ایک سوال یہ بھی پیدا ہوتا ہے کہ اس دنیا میں جرم و گناہ کے پرکھنے کا معیار کیا ہوگا کیونکہ ہر ملک و قوم کے جرم و سزا کے قوانین مختلف ہیں۔ ایسی صورت حال میں المیہ کردار کے جرم و گناہ کے پرکھنے کا پیمانہ کیا ہوگا؟ ارسطو نے جرم و گناہ کے جس پیمانے کو متعارف کیا ہے اور شیکسپیئر نے اپنی ٹریجڈیز میں المیہ کرداروں کی لغزشوں کے ذریعے نمایاں کیا ہے وہ ایک ایسا آفاقی پیمانہ ہے جو زمان و مکان کی حدود سے ماورا ہے۔ اس پیمانے کے مطابق ہر وہ انسانی عمل سزا کا مستحق ہے جو عدل و قسط کی تقویم اور معاشرے کی صحت و سلامتی کے لیے خطرہ ہو۔ قتل و غارت گری، ظلم و تعدی، چوری ڈکیتی وغیرہ جیسے جرائم ہر دور کے انسانی معاشرے میں جرائم ہی تسلیم کیے جاتے ہیں اسی بنیاد پر ارسطو کے وضع کردہ پیمانے اس کے المیہ کردار کی حیثیت کو پوری پوری اہمیت کا حامل بنا دیتے ہیں اور دنیا کے ہر سماج ہر دور میں ایسے المیہ کرداروں کی پذیرائی ہوتی رہی ہے اسی ضمن میں ایک تصور یہ بھی ہے کہ اس دنیا میں کچھ نادیدہ پراسرار قوتیں متحرک ہیں جو انسان کے مجرمانہ اعمال و افعال کی سزا پر مامور ہیں جیسے ہی کسی انسان سے کوئی لغزش سرزد ہوتی ہے یہ قوتیں انتقام پر کمربستہ ہوجاتی ہیں۔ یونانی اصطلاح میں ان پراسرار اور نادیدہ قوتوں کو Nemesis کہا جاتا ہے۔ جن کی سزا فوری طور پر موت نہیں بلکہ اذیت و ابتلا کا ایک ایسا تسلسل ہوتا ہے جو شدید سے شدید تر ہوتا جاتا ہے اور یہ اذیت ناک تسلسل ذہنی، روحانی، جسمانی ہر سطح پر مجرم کو کرب میں مبتلا رکھتا ہے۔ مجرم جو ایک انتہائی باعزت اور عالیشان زندگی بسر کررہا تھا دھیرے دھیرے تنہا ہوتا جاتا ہے اس کے احباب اور متعلقین اس سے کنارہ کش ہوتے جاتے ہیں اس کی زندگی کا ماحول جو عیش و طرب، عزت و وقار سے لبریز تھا، دھندلا جاتا ہے۔ اس پر ان دیکھے خوف کے سائے لہرانے لگتے ہیں اور وہ زندگی کی ہم آہنگی، سرخوشی اور مسرت سے محروم ہوجاتا ہے اس کا ذہن اندیشوں کی آماجگاہ بن جاتا ہے اس کے دوست اس کے دشمن بن جاتے ہیں، اس کی روح ایک زندہ جہنم بن جاتی ہے اور وہ خود وَسواسِ الخنّاس کے تاریک جنگل میں بھٹکتا پھرتا ہے۔ دھیرے دھیرے وہ خود اپنی ذات سے ہی نفرت کرنے لگتا ہے۔ اپنا محاسبہ کرتے ہوئے آخرش وہ اپنے اعمال و افعال کا جائزہ لیتا ہے اور اس طرح وہ اپنے جرم کا اعتراف کرتا ہے کہ جس سزا اور عقوبت سے وہ گزرا ہے وہ حق بجانب تھی۔ اس اعتراف سے اس کو ایک طرح کی طمانیت کا احساس ہوتا ہے اور انتہائی سکون کے ساتھ وہ موت کو گلے لگا لیتا ہے۔ Suffering یعنی ابتلا اور اذیت کا کربناک تسلسل اس کا روحانی تزکیہ کرتا ہے جس کی بنا پر وہ یہ تسلیم کرلیتا ہے کہ اپنے گناہ کی سزا اس نے اسی دنیا میں بھگت لی ہے اور آنے والی زندگی میں اس سزا سے معتوب نہ ہوگا لیکن اس منظرنامے کا دوسرا پہلو جو عوام الناس سے متعلق ہے وہ بھی انتہائی اہمیت کا حامل ہے۔ سادہ لوح عوام کی آنکھیں جب ایک عظیم المرتبت شخصیت کو اقتدار اور ثروت کی بلندیوں سے قعر مذلت میں گرتے ہوئے دیکھتی ہیں تو ان کے جذبات میں ایک انقلاب برپا ہوتا ہے۔ یہ دیکھ کر کہ گناہ کی سزا ایک عظیم انسان کو کس قدر اذیت ناک طریقے سے ملی ہے ان کا دل المیہ ہیرو کے دردناک انجام سے دردمندی، رحم اور تاسف بھر جاتا ہے اور ہر دل اس خوف سے لرز جاتا ہے کہ ہم سادہ عام لوگ کس طرح ایسی سزا سے بچ سکتے ہیں اگر ہم بھی ایسے گناہ کے مرتکب ہوں۔ اس طرح عام لوگ خوف کے جذبات سے لرزتے ہوئے اور المیہ ہیرو کے لیے ہمدردی کے احساس سے بھرے ہوئے تنقیہ کے عمل سے گزرتے ہیں۔ Catharsis کا پروسیس صرف جرم و گناہ کی کدورت اور سفلی جذبات کا تزکیہ ہی نہیں کرتا بلکہ روح کو مجلا و مصفا بنا کر اس کو اعلیٰ ترین خیالات و جذبات سے آراستہ بھی کرتا ہے۔ ہم سب جانتے ہیں کہ انسانی رشتوں کی تعمیر و تربیت میں انسانی جذبات کلیدی حیثیت رکھتے ہیں۔ معاشرتی رشتوں کا باہمی تسلسل جذبات کے نازک تانے بانے میں پیوست رہتا ہے۔ ہر فرد سماج کی ایک اکائی کی حیثیت سے اپنے طرز عمل میں بے اعتدالی کی وجہ سے پورے سماجی Fabric کو متاثر کرتا ہے جس کا محرک اس کے جذبات بنتے ہیں۔ قرآن کے نزول سے سیکڑوں سال قبل ارسطو نے اپنی المیہ تھیوری کے ذریعے جن اصطلاحوں جیسے کتھارسس ہمارشیا (Catharsis- Hamartia) کو متعارف کرایا ہے، قرآن بھی سورہ والشمس میں اس کی توثیق کرتا ہے جس میں بڑی وضاحت کے ساتھ انسانی نفس کی تشکیل و تخلیق کے عناصر ترکیبی بیان کیے گئے ہیں اور انسانی زندگی کی معنویت کو اجاگر کیا گیا ہے۔ وَنَفْسٍ وَّمَا سَوّٰهَاo فَاَلْهَمَهَا فُجُوْرَهَا وَتَقْوٰهَاo قَدْ اَفْلَحَ مَنْ زَكّٰهَا وَقَدْ خَابَ مَنْ دَسّٰهَاo میں واضح اشارہ ہے کہ جو فجور انسانی سرشت میں پیوست کیا گیا ہے اور جس کا علم دے کر یہ ہدایت کی گئی ہے کہ فلاح کا راستہ فجور کے تزکیہ سے ہی ممکن ہے گویا انسان خیر و شر دونوں پر پوری طرح قادر ہے۔ انتخاب کے ساتھ عمل کی بھی پوری آزادی دی گئی ہے اور نفس کی آلودگی کے تصفیہ و تزکیہ کے لیے پوری رہنمائی بھی واضح کردی گئی ہے جس کو مقصد حیات کی کلید بھی کہا جاسکتا ہے۔ خیر و شر کے اس Paradox کو جو کائنات کبریٰ سے کائنات صغریٰ میں اندرونی مماثلت کا اشاریہ ہے اگر وسیع معنی میں دیکھا جائے تو یہ ایک ایسا Code of Conduct بن جاتا ہے جس کی تکمیل انسانی معاشرے کو خوشحال اور پرامن گہوارے میں منقلب کرسکتی ہے۔

ارسطو کی اصطلاح Hamartia یعنی انسانی کردار کا داخلی نقص بعینہٖ فُجُورَها سے عیاں ہے۔ اسی طرح Catharsis تقویٰ کی نمائندگی کرتا ہے، جو تزکیہ کے عمل کو مہمیز دیتا ہے،۔ جس کے زیریں ارتعاش میں خوف مضمر رہتا ہے۔ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ارسطو کی المیہ تھیوری کا لب لباب اس آیت کی تشریح میں موجود ہے۔ اس صداقت جرم کے پیش نظر ارسطو کی کتھارسس کی تھیوری کو اس کے Prophetic vision پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ قرآن ادبیات عالیہ کی ام الکتاب ہے۔ اس کو صرف دینیات کے دائرے میں محصور کرنا اس کی آفاقی افادیت اور Utility کے عظیم مقاصد سے صرف نظر کرنا ہے۔

■

Prof. Waheed-uz-Zafar Khan
Masood Mahal, Lal Diggi Road
Aligarh - 202002 (UP)
Mob.:9258130100

ارسطو کی اصطلاح Hamartia یعنی انسانی کردار کا داخلی نقص بعینہٖ فُجُورَها سے عیاں ہے۔ اسی طرح Catharsis تقویٰ کی نمائندگی کرتا ہے، جو تزکیہ کے عمل کو مہمیز دیتا ہے،۔ جس کے زیریں ارتعاش میں خوف مضمر رہتا ہے۔ اگر بہ نظر غائر دیکھا جائے تو ارسطو کی المیہ تھیوری کا لب لباب اس آیت کی تشریح میں موجود ہے۔ اس صداقت جرم کے پیش نظر ارسطو کی کتھارسس کی تھیوری کو اس کے Prophetic vision پر محمول کیا جاسکتا ہے۔ قرآن ادبیات عالیہ کی ام الکتاب ہے۔ اس کو صرف دینیات کے دائرے میں محصور کرنا اس کی آفاقی افادیت اور Utility کے عظیم مقاصد سے صرف نظر کرنا ہے۔

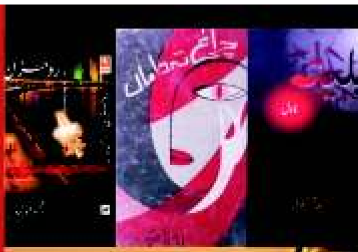

نظیر احمد گنائی

اکیسویں صدی میں اردو فکشن تنقید

فکشن کی اصطلاح گو کہ ناولوں اور افسانوں کے لیے استعمال ہوتی ہے، تاہم اس کا اطلاق تھیٹر، فلموں، ٹیلی ویژن ڈراموں پر بھی ہوتا ہے۔ یہاں پر فکشن ناول اور افسانے پر لکھی جانے والی اہم تنقیدی نگارشات کا جائزہ لینے کی کوشش کی جائے گی تاکہ اکیسویں صدی میں اردو فکشن تنقید کا منظر نامہ سامنے آسکے۔ ساتھ ہی موجودہ دور کے فکشن نگاروں کی پہچان بھی ہوجائے گی۔

اردو فکشن تنقید کے ابتدائی نقوش مغربی نقادوں کے یہاں ملتے ہیں۔ ان نقادوں میں سب سے پہلے ہومر کا نام اول درجہ کا اہمیت رکھتا ہے۔ ایسے نقاد بہت کم ملیں گے جنھوں نے فکشن کی تنقید لکھی ہو۔ ہومر کے بعد یہ سلسلہ دیر تک جاری رہا۔ مغرب کے بعد اس نے مشرق کا رُخ کیا اور ترقی کے منازل طے کیے۔ فکشن کی تنقید میں بھی ادب کی دیگر اصناف کی طرح روز اول سے تجربے ہوتے آرہے ہیں۔ اکیسوی صدی کا فکشن نفسیاتی کشمکش، معاشی بدحالی، جنسی بے راہ روی اور سماج میں پھیلی برائیوں پر زور دیتا ہے۔ ادیب علامتوں، اشاروں اور رمز وکنایہ کے ذریعے اپنی بات قارئین تک پہنچانے کی کوشش کرتا ہے۔ دور حاضر میں اردو تنقید کے تعلق سے پروفیسر صغیر افراہیم لکھتے ہیں:

''اکیسوی صدی کی تنقید کا تقریباً ہر دبستان'' قاری اساس'' ہے۔ اب مطالعۂ متن میں خالق کے بجائے اس کے قاری کو مرکزی اہمیت حاصل ہو گئی ہے۔ بلکہ Stanley Fish تو اس حد تک آگے بڑھ گیا ہے اس کے نزدیک کاغذ پر لکھی گئی تحریر صرف قرات میں ہی بامعنی بنتی ہے اور قاری اپنی قرات سے متن موجود بناتا ہے۔ مصنف اساس یا موضوعاتی تنقید اب رفتہ رفتہ قاری اساس مطالعہ کے لیے جگہ خالی کر رہی ہے اور متن کی قرات کے حوالے سے مطالعۂ ادب کے نئے دبستان وجود میں آ رہے ہیں۔'' (معاصر فکشن کی تنقید: زبان کے حوالے سے)

انسانی زندگی جس شکست وریخت، پیچ وخم اور انقلاب سے دو چار ہوتی ہے اس کے اظہار کا سب سے بہترین وسیلہ بننے کی صلاحیت اگر کسی صنف میں ہے تو وہ ناول ہے کیونکہ ناول معاشرہ، فرد اور ذات کے نہ صرف خارجی عوامل وعناصر کو پیش کرتا ہے بلکہ تضاد وتصادم اور اس کے محرکات کو بھی اپنی گرفت میں لیتا ہے۔ زندگی اور معاشرے سے گہرے تعلق کے باوجود ناول کو اپنے وجود اور اہمیت کے لیے ہر دور میں سنگھرش کرنا پڑا ہے۔ دور حاضر میں جن معروف اردو ناول نگاروں نے، ناول کو زندہ جاوید کر دیا ان میں کچھ نام یہاں قابل ذکر ہیں۔ رحمٰن عباس (نخلستان کی تلاش، روحزن)، نورالحسنین (ایوانوں کے خوابیدہ چراغ)، عبدالصمد (بکھرے اوراق، یادوں کی سیاہی، شکست کی آواز)، ترنم ریاض (برف آشنا پرندے)، شمس الرحمٰن فاروقی (کئی چاند تھے سر آسماں)، پیغام آفاقی (پلیتہ)، اقبال متین (چراغ تہ داماں)، مشرف عالم ذوقی (نالۂ شب گیر، لے سانس بھی آہستہ، آتش رفتہ کا سراغ)، (شفق) بادل، قابوس) شائستہ فاخری (نادیدہ بہاروں کے نشان، صدائے عندلیب برشاخ شب)، غضنفر (وش منتھن، شوراب)، (مانجھی) صلاح الدین پرویز (دی وار جرنلس) جتندر بلو (وشواس گھات) ثروت خان (اندھیرا پگ)، محمد علیم (میرے نالوں کی گمشدہ آواز)، شموئل احمد (مہاماری، اے دل آوارہ) ڈاکٹر اختر آزاد (لیمی نیٹیڈ گرل)، احمد صغیر (جنگ جاری ہے)، صادقہ نواب سحر (کوئی کہانی سناؤ متاشا)، آچاریہ شوکت خلیل (اگر تم لوٹ آتے)، افسانہ خاتون (دھند میں کھوئی روشنی)، نسرین ترنم (ایک اور کوسی)، آشا پربھات (دھند میں آگا پیڑ)، انیس اشفاق (دکھیاری)، شبر امام (جب گاؤں جاگے)، ظفر عدیم (انجو شوفر)، علی امجد (کالی ماٹی)، غیاث الدین (زوال آدم خاکی) وغیرہ۔

اکیسوی صدی کی شروعات سے ہی اردو ناول کا مطالعہ اور دائرہ تیزی سے پھیلتا جا رہا ہے۔ اردو ناولوں کا ملکی اور غیر ملکی زبانوں میں ترجمے کا عمل زور وشور سے ہو رہا ہے۔ ساتھ ہی حالیہ برسوں کے دوران ناول کے فن اور تنقید کے مباحث میں بھی اضافہ دیکھنے کو ملا ہے۔ یہ بھی کہا جاسکتا ہے کہ ناول سب سے زیادہ زیر بحث صنف کا درجہ اختیار کر گیا ہے۔ اس حوالے سے کئی کتابیں اور بہت سارے مضامین یا مقالات ہمارے سامنے آئے ہیں جن میں اکیسویں صدی کے ناولوں پر تنقید پیش کی گئی ہو۔ ان کتابوں اور مضامین میں سے چند کا تذکرہ یہاں قابل ذکر ہے۔ کتابیں، جیسے پروفیسر رفیعہ شبنم عابدی کی مرتب کردہ کتاب (معاصر اردو ناول)، ناز قادری (اردو ناول کا سفر)، محمد کامران شہزاد (فکشن اور تنقید کا تازہ اسلوب)، ڈاکٹر منصور خوشتر (اردو ناول کی پیش رفت)، رحمٰن عباس کی ترتیب کردہ کتاب (اکیسوی صدی کی دہلیز پر اہم اردو ناول)، مضامین، جیسے مشرف عالم ذوقی (اردو ناول کی گم ہوتی ہوئی دنیا)، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی (ہم عصر اہم ناولوں کے تنقیدی شذرات)، (اکیسوی صدی میں اردو ناول)، محمد حمید شاہد (معاصر اردو فکشن: ہیئت اور اسلوب کے تجربے)، (فکشن کی تنقید میں تفہیم کا کردار)، پروفیسر اسلم جمشید پوری (2018 کا فکشن اور فکشن تنقید۔ ایک جائزہ)، شہناز رحمٰن (اردو ناول میں اسلوب کے تجربے)، شہاب ظفر اعظمی (اکیسویں صدی میں اردو ناول: ایک تنقیدی مطالعہ)، ڈاکٹر صلاح الدین درویش (اکیسویں صدی کی دوسری دہائی کے دس بڑے ناول) وغیرہ۔

مندرجہ بالا کتابوں میں اردو ناول پر جو تنقیدی آراء پیش کی گئی ہیں وہ قابل ستائش ہیں۔ ان ادیبوں نے ناول کے فن پر بات کی ہے اور ناول میں غیر ضروری چیزوں پر کسی جگہ اعتراض کیا ہے اور کسی جگہ کھل کر تنقید کی ہے۔ فنی لوازمات میں زبان وبیان، اسلوب، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، منظر کشی اور نقطۂ نظر، ان سبھی اجزاء کا بغور مطالعہ کرنے کے بعد ان نقادوں نے اپنے تنقیدی خیالات کا کھل کر اظہار کیا ہے۔ اسی طرح مندرجہ بالا مضامین میں ناول کا فن، ناول کا اسلوب اور ناول کی تکنیک پر بحث کرتے ہوئے ادیبوں نے اپنے خیالات پیش کیے ہیں اور ساتھ ہی بعض جگہوں پر تنقیدی رائے بھی پیش کی ہے۔ فکشن کے نقاد کہیں کہیں تضاد کا شکار بھی ہوئے ہیں کسی نے ناول کو پرکھ کر اسے اہمیت دی ہے تو کسی نے فن

پر اعتراضات کر کے اسے رد کیا ہے۔

بدلتے وقت کے کچھ تقاضے ہوتے ہیں۔ اس بدلتے دور میں داستان کا رواج ختم ہوا، ناول کا عروج دیکھا گیا۔ اس ٹکنالوجی کے دور میں ناول پڑھنے کا چلن بھی کم ہوتا جا رہا ہے۔ دور حاضر میں مختصر کہانی نے جنم لیا اور مقبولیت پائی اور لوگوں نے اس کو بے حد پسند کیا کیونکہ یہ ایک ہی نشست میں پڑھا جا سکتا ہے اور سامعین یا قارئین کے ذہن پر ایک تاثر چھوڑ دیتا ہے۔ افسانے نے برصغیر میں ایک صدی تک راج کیا۔ اس میں نئے نئے تجربات ہوئے، موضوعات کا تنوع پایا گیا، کہانی پن کی کمی بھی دور کی گئی۔

رواں صدی میں جن افسانہ نگاروں نے بہترین افسانے لکھے ساتھ ہی ان افسانوں کے مجموعے بھی منظر عام پر لائے۔ ان افسانہ نگاروں میں مرد و زن دونوں شامل ہیں جنھوں نے شاہکار افسانے لکھ کر اردو فکشن کو ایک اعلیٰ مقام بخشا۔ 2000 سے لے کر اب تک بے شمار افسانہ نگار منظر عام پر آئے اور قارئین کے پیش نظر لاتعداد افسانوی مجموعے لا کر داد تحسین حاصل کر چکے ہیں۔ چند مشہور و معروف افسانہ نگاروں کے نام یہاں قابل ذکر ہیں۔ ترنم ریاض (ابابیلیں لوٹ آئیں گی)، آنند لہر (انحراف)، سریندر پرکاش (حاضر حال جاری)، فہمیدہ ریاض (خط مرموز)، انیس رفیع (کرفیو سخت ہے)، پیغام آفاقی (مافیہ)، عبدالصمد (میوزیکل چیئر)، دیپک کنول (ہم تیرے ہو گئے)، اقبال مجید (تماشا گھر)، ذکی مشہدی (صدائے باز گشت)، ایم مبین (نئی صدی کا آغاز)، نور شاہ (بے ثمر سچ)، زاہد مختار (جہنم کا تیسرا کنارہ)، بیگ احساس (حنظلہ)، پرویز شہر یار (بڑے شہر کا خواب)، مسرور جہاں (پل صراط)، غضنفر (حیرت فروش) عابد سہیل (غلام گردش)، نشاں زیدی (آنگن میں چاند)، تبسم فاطمہ (تاروں کی آخری منزل)، شبیر احمد (چوتھا فن کار)، رابعہ الربا (رات کی کہانی)، سلام بن رزاق (زندگی افسانہ نہیں)، رشید امجد (صحرا کہیں جسے)، نور الحسنین (فقط بیان تک)، مسرور تمنا (مہکتے خواب)، مسعود جامی (ہم تو دبے ہیں صنم)، افشاں ملک (اضطراب)، دیپک بدکی (اب میں وہاں نہیں رہتا)، سلیم خان (لہولہو منظر)، ناصر عباس نیر (خاک کی مہک)، سلمیٰ صنم (قطار میں کھڑے چہرے اور دیگر کہانیاں)، بشیر مالیر کوٹلوی (فکریں)، شموئل احمد (کوچۂ قاتل کی طرف)، کہکشاں پروین (مور کے پاؤں)، عشرت ظہیر (خوابوں کا قیدی)، مشتاق احمد وانی (کیا حال ہے جاناں)، احمد حسنین (میری چاہت کی گلاب)، ارشد منیم (خون کا رنگ)، طارق شبنم (گمشدہ دور) وغیرہ۔

تنقید ادب پارے کی شناخت اور پہچان قائم کرنے میں اہم کردار نبھاتی ہے۔ کیونکہ جب تک ادب پارے میں فنی خوبیوں اور خامیوں کی نشاندہی نہ کی جائے تب تک اس ادب پارے کی اہمیت کا اندازہ لگانا مشکل ہوتا ہے۔ ہر تخلیق کار کے ذہن میں تخلیق سے متعلق بھی شعور کی کوئی سطح ضرور ہوتی ہے۔ اکیسویں صدی میں ادیبوں نے اردو افسانے پر تنقیدی کتابیں لکھیں ہیں یا بہترین مضامین لکھے ہیں جن میں انہوں نے اردو افسانے پر اپنے تنقیدی خیالات کا برمحل اظہار کیا ہے۔ دور حاضر میں اردو فکشن تنقید پر جو کتابیں یا مضامین لکھے گئے ہیں ان کی فہرست درج ذیل میں پیش خدمت ہے۔ کتابیں جیسے: پروفیسر اسلم جمشید پوری (جدیدیت اور اُردو افسانہ، ترقی پسند اُردو افسانہ اور چند اہم افسانہ نگار)، پروفیسر صغیر افراہیم (اردو فکشن: تنقید اور تجزیہ)، ڈاکٹر احمد صغیر (اردو افسانے کا تنقیدی جائزہ 1980 کے بعد)، ڈاکٹر ریاض توحیدی (معاصر اردو افسانہ: تفہیم و تجزیہ (جلد اول)، ڈاکٹر احمد صغیر (بہار میں اردو فکشن۔ ایک تنقیدی مطالعہ)، ڈاکٹر شہناز رحمٰن (اردو فکشن تفہیم تعبیر اور تنقید)، ڈاکٹر نعیم انیس (اردو کی معروف خواتین افسانہ نگار اور ان کی خدمات، اکیسویں صدی میں اردو افسانہ (مرتب)، ارشاد سیانوی (نئی صدی میں اردو افسانہ)، محمد حمید شاہد (اردو افسانہ اور افسانے کی تنقید) وغیرہ۔

مضامین جیسے: شہناز رحمٰن (احمد ندیم قاسمی کے افسانے میں عورت)، رضوان بن علاء الدین (احمد ندیم کے افسانوں میں دیہات)، پروفیسر اسلم جمشید پوری (2017 کا فکشن اور فکشن تنقید: ایک جائزہ)، مسعود جامی (اردو افسانے کے رجحانات)، پروفیسر صغیر افراہیم (جدید اردو افسانے کے امتیازات)، محمد حمید شاہد (فکشن کی تفہیم میں تنقید کا کردار (کراچی)، شہناز رحمٰن (اردو فکشن میں عالمی مسائل)، سلمان بلرام پوری (معاصر اردو فکشن کا منظر نامہ)، گوپی چند نارنگ (نیا افسانہ: روایت و انحراف اور مقلدین کے لیے لمحۂ فکریہ)، ڈاکٹر نوشاد منظر (انتظار حسین اور افسانے کی تنقید)۔

اس ٹکنالوجی کے دور میں اردو فکشن تنقید نے بھی ترقی کی اور زور و شور سے ادیبوں نے فکشن تنقید کی رفتار میں اضافہ کیا۔ ناول نگاروں اور افسانہ نگاروں پر کتابیں، مضامین کے مجموعے، ناولوں اور افسانوں کے انتخاب، ناولوں پر تجزیے، افسانوی تذکرے، ناولوں کے تقابلی مطالعے، افسانوں کے تقابلی مطالعے وغیرہ مختلف نوعیت کی فکشن تنقید منظر عام پر آ رہی ہے۔ اکیسویں صدی کی آمد سے پہلے فکشن تنقید لکھنے والوں میں پروفیسر قمر رئیس، پروفیسر وہاب اشرفی، پروفیسر گوپی چند نارنگ، پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی، وارث علوی اور انور سدید وغیرہ قابل قدر ہیں۔ ان کے بعد جن ادیبوں نے فکشن تنقید کی روایت کو آگے بڑھایا ان میں ابوالکلام قاسمی، شمس الحق عثمانی، ارتضیٰ کریم، عظیم الشان صدیقی، علی احمد فاطمی، صغیر افراہیم، قمر الہدیٰ فریدی، مبین مرزا، اعجاز علی ارشد، ظہور الدین، قدوس جاوید، سلیم آغا قزلباش، اسلم آزاد، خالد علوی، صبا اکرام اور خالد اشرف وغیرہ۔ ان کے علاوہ دور حاضر میں فکشن تنقید لکھنے والوں کے ایک گروہ نے اس کے مقام کو بام عروج تک پہنچایا، جن میں خاص کر درج ذیل نام قابل ذکر ہیں: مشرف عالم ذوقی، ترنم ریاض، نگار عظیم، حقانی القاسمی، ہمایوں اشرف، اسلم جمشید پوری، احمد صغیر، شہاب ظفر اعظمی، مولا بخش، خورشید حیات، راشد انور راشد، فوزیہ اسلم، نعیم انیس، محمد اسلم پرویز، نجمہ رحمانی، صاحب علی، کہکشاں پروین، ریاض توحیدی، عشرت ناہید، اسما نغی، فرقان سنبھلی، الطاف انجم، مشتاق احمد وانی، ابو بکر عباد، بشیر مالیر کوٹلوی، نشاں زیدی، تحسین گیلانی، سلمان عبدالصمد، رابعہ الربا، ضیاء اللہ نور، غضنفر اقبال، محمد نسیم جان، غالب نشتر، احمد طارق، تسلیم فاطمہ امروہوی، ارشد اقبال، شہناز رحمٰن، جاوید انور، منصور خوشتر، ارشاد سیانوی، صالح رشید، مہناز عبید، رضوانہ پروین، محمد حمید شاہد، رضوان بن علاء الدین، ڈاکٹر نوشاد منظر، سلمان بلرام پوری وغیرہ۔

مجموعی طور پر اگر اردو فکشن پر بات کی جائے گی تو دور حاضر میں جس طرح فکشن لکھنے والوں کا گروہ سامنے آیا ہے اسی طرح فکشن تنقید لکھنے والوں کی بڑی تعداد بھی ابھر کر منظر عام پر آئی۔ فکشن تنقید لکھتے ہوئے ادیبوں نے ناولوں میں بیان کیے گئے مسائل اور موضوعات پر سیر حاصل بحث کی ہے۔ ان ادیبوں نے موضوعات کے علاوہ ناول کی فنی جزئیات پر بھی اپنے تنقیدی نگارشات پیش کیے ہیں۔ جیسے پلاٹ، کردار نگاری، مکالمہ نگاری، منظر نگاری، نقطۂ نظر اور زبان و بیان پر بھی الگ الگ تجزیہ کر کے ہر جز میں وضاحت کے ساتھ خوبیوں اور خامیوں کو اجاگر کیا ہے۔

دور حاضر میں اردو افسانے پر جو تنقید لکھی جا رہی ہے وہ دراصل تنقید کم تجزیہ زیادہ نظر آتی ہے۔ کیونکہ شخصیت پرستی ادب کی طرف مائل ہوتی جا رہی ہے۔ پھر بھی ایسے بہترین نقاد موجود ہیں جو حق کی بات کرتے ہیں اور بڑے بے باک انداز میں ادب پارے کی خامیوں اور خوبیوں کو پرکھ کر اس پر اپنی تنقیدی رائے پیش کرتے ہیں۔

■

Nazir Ahmad Ganai
S/O: Gh Hassan Ganai
R/O: Frisal Kulgam - 192232 (J&K)
Mob.: 7889779687

ایکسل میں کوائفیہ یا ڈاٹا بیس
(Database in Excel)

ایم ایس- ایکسل دراصل ایک اسپریڈ شیٹ پیکج ہے اور اسی شکل میں اس کا استعمال کیا جانا مناسب ہوگا لیکن ہم کچھ حد تک ایکسل میں ایک ڈاٹا بیس (کوائفیہ) بنا کر اس میں کیے جانے والے زیادہ تر کام کر کے فائدہ اٹھا سکتے ہیں۔ ایسا کرنا اس لیے ممکن ہے کہ ایکسل ورک شیٹ قطاروں (Rows) اور کالموں (Columns) میں بٹی ہوتی ہے۔ ہم کسی قطار کو ایک ریکارڈ (Record) اور کسی کالم کو ایک فیلڈ (Field) مان کر ان میں ڈاٹا بھر سکتے ہیں اور ڈاٹا بیس بنا سکتے ہیں۔

ایکسل میں بنائے گئے ڈاٹا بیس کے ساتھ کئی شرطیں لگی ہوتی ہیں جیسے ریکارڈوں کی تعداد ایک حد سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے، کالموں (فیلڈوں) کی لمبائی بھی 245 نشانات سے زیادہ نہیں ہونی چاہیے وغیرہ وغیرہ۔ اس لیے ایکسل کا استعمال ہر قسم کا ڈاٹا بیس بنانے کے لیے نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے لیے کسی ڈاٹا بیس پیکج، جیسے ایم ایس- ایکسس (MS-Access) یا فاکس پرو (FoxPro) کا استعمال کرنا چاہیے۔ پھر بھی ہم ایکسل میں عام ڈاٹا بیس بنا سکتے ہیں اور ڈاٹا بیسوں پر کیے جانے والے کئی کام بھی کر سکتے ہیں۔

اس باب میں ہم ایم ایس-ایکسل میں عام ڈاٹا بیس بنانے اور ان پر مختلف کام کرنے کے بارے میں بتائیں گے۔ اس سے پہلے ڈاٹا بیس اور ان سے متعلق کچھ الفاظ کا مطلب سمجھ لینا ضروری ہے۔

ڈاٹا بیس کیا ہے؟ (What is a Database?)

آسان ترلفظوں میں، ڈاٹا بیس اطلاعات (یا ڈاٹا) کا ایک ایسا منظم مجموعہ (Organized Collection) ہوتا ہے، جس میں ہم کسی بھی اطلاع کو آسانی سے حاصل کر سکتے ہیں۔ کوئی ٹیلی فون ڈائریکٹری آسان ڈاٹا بیس کی ایک اچھی مثال ہے۔ اس کی ہر قطار میں تین اطلاعات ہوتی ہیں۔ نام، پتہ اور ٹیلی فون نمبر۔ ڈاٹا بیس کی اصطلاح میں اس کی ہر ایک قطار کو ایک ریکارڈ (Record) کہا جا سکتا ہے۔ ہر ریکارڈ میں جتنی اطلاعات ہوتی ہیں، انھیں ڈاٹا فیلڈ (Data Field) یا صرف فیلڈ (Field) کہا جاتا ہے۔ ہر ایک فیلڈ کا ایک متعینہ نام ہوتا ہے، جس سے اسے پہچانا جاتا ہے۔ ڈاٹا بیس میں ہر ریکارڈ کی جگہ طے ہوتی ہے۔ اس طرح ٹیلی فون ڈائریکٹری کے ڈاٹا بیس میں تین فیلڈ اور ہزاروں ریکارڈ ہوتے ہیں۔

یوں تو ڈاٹا بیس کئی قسم کے ہوتے ہیں، لیکن اس کی سب سے آسان اور مستعمل شکل جدول (Tables) کی طرح ہوتی ہے۔ ایسی ہر ایک جدول میں ایک متعینہ عدد میں فیلڈ ہوتے ہیں اور ہر ریکارڈ میں سبھی فیلڈ بھرے ہوتے ہیں، خواہ اس میں صفر (Zeros) یا خالی جگہ (Spaces) بھرے ہوں۔ ایکسل ورک شیٹ میں بھی ہم صرف اسی طرح کے ڈاٹا بیس بنا سکتے ہیں اور ان کا استعمال کر سکتے ہیں۔ ایم ایس-ایکسل ڈاٹا بیسوں میں استعمال کیے جانے والے کچھ الفاظ اور ان کا مطلب اس طرح ہے:

ڈاٹا بیس رینج (Database Range): کسی ورک شیٹ کی جس رینج میں ڈاٹا بیس بنا ہوتا ہے (یعنی ڈاٹا بھرا ہوتا ہے) اسے ڈاٹا بیس رینج کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر تصویر E-7.1 میں بنے پروویڈنٹ فنڈ کے ڈاٹا بیس میں سیل B2 سے I17 تک میں ڈاٹا بھرا ہوا ہے، لہٰذا ڈاٹا بیس رینج A2:I17 ہے۔ ایم ایس- ایکسل زیادہ تر خود ہی ڈاٹا بیس رینج طے کر لیتا ہے۔ ویسے آپ چاہیں، تو اسے بدل بھی سکتے ہیں۔ ایسی حالت میں صرف رینج میں آنے والے ریکارڈوں پر ہی کام کیے جائیں گے۔

	A	B	C	D	E	F
1	College Enrollment 2018-2019					
2						
3	Student ID	Last Name	Initial	Age	Program	
4	ST348-245	Walton	L.	21	Drafting	
5	ST348-246	Wilson	R.	19	Science	
6	ST348-247	Thompson	G.	18	Business	
7	ST348-248	James	L.	23	Nursing	
8	ST348-249	Peterson	M.	37	Science	
9	ST348-250	Graham	J.	20	Arts	

تصویر E-7.1: ایکسل ورک شیٹ میں ایک ڈاٹا بیس

ریکارڈ (Record): ایکسل میں ڈاٹا بیس رینج کی ہر ایک قطار (Row) کو ایک ریکارڈ مانا جاتا ہے۔ تصویر E-7.1 کے ڈاٹا بیس میں تیسری قطار 'Dr. J.P.Gupta' کا ریکارڈ ہے، پانچویں قطار 'Shri S.N.P.Singh' کا ریکارڈ ہے اوراسی طرح آگے بھی سمجھا جاسکتا ہے۔ ڈاٹا بیس رینج کی پہلی قطار میں ہمیشہ کالموں کے عنوان (Column Label) بھرے جانے چاہئیں، جن کا استعمال ڈاٹا بیس کے فیلڈ ناموں (Field Names) کی طرح ہوتا ہے۔ ان فیلڈ ناموں میں بیچ میں خالی جگہ (Space) بھی ہوسکتی ہے۔ مثال کے طور پر، اوپر کے ڈاٹا بیس میں 'P.F. No.' ایک مستند فیلڈ نام ہوتا ہے۔

فیلڈ (Field): ایم ایس-ایکسل میں کسی ڈاٹا بیس کے ہر ایک کالم کو ایک فیلڈ کہا جاتا ہے۔ ہر ایک اکیلے سیل کو بھی فیلڈ ہی مانا جاتا ہے۔ آپ کسی فیلڈ میں ٹیکسٹ، عدد، تاریخیں، فنکشن اور فارمولے بھر سکتے ہیں۔ جب کسی فیلڈ میں کوئی فنکشن یا فارمولہ بھرا ہوتا ہے، تو اسے حسابیاتی فیلڈ (Computed Field) کہا جاتا ہے۔ مثال کے طور پر، اگر آپ نے ایک فیلڈ 'Total Pay' بنایا ہے اور کوئی دوسرا فیلڈ 'Deduction' ہے، تو آپ 'Net Pay' نام کا ایک تیسرا فیلڈ بھی بنا سکتے ہیں، جس کی قدر کا حساب ان دو فیلڈوں کی بنیاد پر کیا گیا ہو۔

ڈاٹا بیس بنانا (Creating a Database)

ڈاٹا بیس بناتے وقت ہر ایک مد (Item) یا اطلاع کے لیے ایک الگ فیلڈ (یعنی کالم) بنانا چاہیے، اگر آپ اس کا الگ حوالہ دینا چاہتے ہیں۔ مثال کے طور پر، اگر آپ ریکارڈوں کو 'پہلا نام' (First Name) اور آخری نام (Surname) کی بنیاد پر چھانٹنا چاہتے ہیں، تو یہ دونوں فیلڈ الگ الگ ہونی چاہئیں۔ صرف 'نام' (Name) فیلڈ بنانے سے ایسا نہیں کیا جاسکتا۔

ڈاٹا بیس بنانے کا سب سے آسان طریقہ یہی ہے کہ پہلے ایک قطار (Row) میں سبھی فیلڈوں کے نام بھر لیے جائیں، پھر ان کے نیچے ڈاٹا داخل کیے جائیں۔ کالموں کی چوڑائی یا تو پہلے ہی طے کی جاسکتی ہے یا بعد میں ٹھیک کر سکتے ہیں۔

ڈاٹا بھرنا (Entering Data)

ایکسل ڈاٹا بیس میں ڈاٹا آپ اسی طرح بھر سکتے ہیں، درست کر سکتے ہیں اور فارمیٹ کر سکتے ہیں، جیسے کسی عام ورک شیٹ یا سیل میں کرتے ہیں۔ اس کے علاوہ ایکسل کی ڈاٹا فارم (Data Form) سہولت کا بھی استعمال کر سکتے ہیں۔ آپ کسی بھی طریقہ سے ڈاٹا بھر رہے ہوں، کچھ احتیاط برتنا ضروری ہے۔

ایک، ایکسل میں فیلڈ ٹائپ (Field Type) جیسی کوئی سہولت نہیں ہوتی، اس لیے کسی بھی فیلڈ میں ٹیکسٹ، اعداد یا تاریخ بھری جاسکتی ہے۔ اس سے کبھی کبھی مسئلہ پیدا ہوسکتا ہے، کیونکہ اگر آپ کسی عدد کو ٹیکسٹ کی طرح دکھانا چاہتے ہیں اور اس کے شروع میں صفر آتے ہیں، تو ایکسل ان صفر کو نہیں دکھائے گا۔ مثال کے طور پر، سبھی ایس ٹی ڈی کوڈ صفر سے شروع ہوتے ہیں۔ انھیں صحیح صحیح دکھانے کے لیے ان کو ٹیکسٹ کے طور پر بھرنا پڑے گا، یعنی ان سے پہلے ایک اپوسٹرافی (Apostrophe) ٹائپ کرنی ہوگی۔

دو، اگر آپ کسی فیلڈ میں اعداد، متن، تاریخ وغیرہ سبھی کو ملا دیتے ہیں، تو ایکسل آپ کو اس کی کوئی وارننگ نہیں دیتا لیکن آپ غور سے دیکھ کر اس غلطی کا پتہ لگا سکتے ہیں۔ عام طور پر ایکسل میں اعداد کو دائیں سے لگا کر اور ٹیکسٹ وغیرہ کو بائیں طرف سے سٹا کر دکھایا جاتا ہے۔ لہٰذا، اگر آپ نے سیلوں کو خاص طرح سے فارمیٹ نہ کیا ہو، تو ملاوٹ کی غلطی کو پہچانا جاسکتا ہے۔

ریکارڈ جوڑنا (Adding Records)

عموماً آپ کسی نئے ریکارڈ کو اپنے ڈاٹا بیس کے آخری ریکارڈ کے نیچے جوڑتے ہیں۔ یہ کام آپ یا تو عام ورک شیٹ کی طرح کرتے ہیں یا ڈاٹا فارم کی مدد سے ایسا کرتے ہیں، جو نئے ریکارڈ کو آخری ریکارڈ کے ٹھیک نیچے جوڑ دیتا ہے۔

اسی طرح اگر آپ بیچ میں کوئی نیا ریکارڈ جوڑنا چاہتے ہیں، تو اس جگہ پر ایک خالی قطار ڈال کر ایسا کر سکتے ہیں۔ اس سے آگے کے سبھی ریکارڈ نیچے سرکا دیے جائیں گے۔

اوپر کے دونوں کام کرنے میں تب تک کوئی پریشانی نہیں ہوتی، جب تک آپ کا ڈاٹا بیس اس کی پہلے سے متعارف ڈاٹا رینج کے اندر اندر رہتا ہے لیکن اگر آپ ڈاٹا رینج کے نیچے کے سیلوں میں کچھ بھر چکے ہیں، تو نئے ریکارڈ جوڑنا پریشانی بھرا ہوگا اور ڈاٹا فارم تو ایسی حالت میں 'ڈاٹا بیس بڑھایا نہیں جاسکتا' (Cannot Extend Database) پیغام دے گا۔ ایسی حالت میں آپ کو ڈاٹا رینج بڑھانی ہوگی، یعنی آخری ریکارڈ کے بعد ضروری تعداد میں خالی قطاروں کو جوڑنا پڑے گا۔

اگر آپ کوئی نیا فیلڈ ڈاٹا بیس میں جوڑنا چاہتے ہیں، تو آسانی سے ایسا کر سکتے ہیں۔ اس کے لیے یا تو ڈاٹا رینج کے آخری کالم سے اگلے کالم میں وہ فیلڈ بنا لیجیے یا پھر بیچ میں کسی جگہ پر نیا کالم ڈال کر اس میں فیلڈ بنا سکتے ہیں۔ ایکسل ایسی حالت میں ڈاٹا رینج کو خود درست کر لے گا۔

ڈاٹا فارموں کا استعمال (Using Data Forms)

کسی ایکسل ڈاٹا بیس میں ڈاٹا بھرنے، ریکارڈ دیکھنے اور ڈھونڈنے کے لیے ڈاٹا فارم بہت آرام دہ ہوتے ہیں۔ یہ ایسے ڈائیلاگ باکس ہیں جن میں فیلڈوں کے نام، ٹیکسٹ ڈاٹا بھرنے کے ڈاٹا باکس اور کچھ بٹن ہوتے ہیں۔ ڈاٹا رینج کا کوئی سیل چن کر کوئک ایکسیس ٹول بار (تصویر E-7.2) میں 'Form' آئیکان پر کلک کرنے پر ڈاٹا فارم خود ہی بنا دیا جاتا ہے اور آپ کی اسکرین پر دکھایا جاتا ہے۔

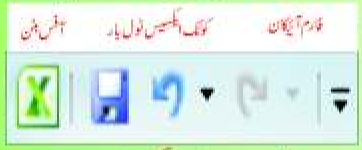

تصویر E-7.2: کوئک ایکسیس ٹول بار

ممکن ہے کہ Form کا آئیکان آپ کے کوئک ایکسیس ٹول بار میں نہ ہو، لیکن اسے آسانی سے ٹول بار میں جوڑا جاسکتا ہے۔ اس کے لیے بھی کارروائیاں وہی ہوتی ہیں، جن کی مدد سے ہم نے ایم ایس- ورڈ کے کوئک ایکسیس ٹول بار میں Auto Format کا آئیکان جوڑا تھا۔

تصویر E-7.3 میں اوپر بنائے گئے ڈاٹا بیس کے لیے ڈاٹا فارم دکھایا گیا ہے۔ ڈاٹا فارم کے 'Find Prev' اور 'Find Next' بٹنوں کا استعمال بالترتیب پچھلے اور اگلے ریکارڈ کو دیکھنے میں کیا جاتا ہے۔ ڈاٹا فارم میں ٹیکسٹ باکس کی چوڑائی اور اسی وجہ سے ڈاٹا فارم کی چوڑائی ڈاٹا بیس کے سب سے چوڑے فیلڈ (یا کالم) پر منحصر ہوتی ہے۔ لہٰذا، اگر آپ کے ڈاٹا بیس میں کوئی فیلڈ بہت بڑا ہے، تو ڈاٹا فارم بھی کافی بڑا ہوگا اور یہ بھی ہوسکتا ہے کہ وہ آپ کی اسکرین پر آئے ہی نہیں۔ اسی طرح اگر فیلڈوں کی تعداد زیادہ ہے، تو ہوسکتا ہے کہ سبھی فیلڈ ڈاٹا فارم پر دکھائی نہ دیں۔ مسئلہ یہ ہے کہ ایسی حالت میں آپ فیلڈوں کو اسکرول بھی نہیں کر سکتے۔

■

بہ شکریہ: ریپڈیکس کمپیوٹر کورس (ونڈوز 7 اور 8 / آفس 2007)، سنہ اشاعت: 2015، ناشر: یونی کورن بکس، F-2/16، انصاری روڈ، دریا گنج، نئی دہلی 2
فون نمبر: 011-23275434,23262683

تبصرہ وتعارف

تبصرہ نگاری ادبی تنقید ہی کی ایک شکل ہے جس میں کتاب کے مواد، اسلوب اور معیار کا تجزیہ کیا جاتا ہے۔ کتاب کے مالہ وما علیہ اور دیگر جزئیات کے حوالے سے قارئین کو بہت قیمتی معلومات عطا کی جاتی ہیں۔ اردو میں تبصرہ نگاری کی ایک مضبوط اور مستحکم روایت رہی ہے، خاص طور پر قدیم مجلات نے مطبوعات جدیدہ کے تعارف کا جو سلسلہ قائم کیا تھا وہ بہت ہی مفید تھا۔ تبصرہ بہت ذمے داری کا کام ہے اس لیے مبصرین کو چاہیے کہ وہ کتابوں کے انتخاب میں بھی اپنے اعلیٰ ذوق کا ثبوت دیں اور تبصرہ کرتے وقت غیرضروری تمہید، افراط و تفریط، بے معنی تحسین اور بے جا تنقید سے گریز کرکے کتاب کے اہم اور افادی نکات کی نشاندہی کریں۔ اردو کے علاوہ انگریزی، ہندی یا دیگر زبانوں میں اردو زبان و ادب سے متعلق جو کتابیں شائع ہوتی ہیں ان پر بھی آپ تبصرے بھیجیں تو بہتر ہوگا۔

○ **اردو صحافت** (آغاز سے 1857 تک کا ایک مختصر جائزہ)

مصنف: معصوم مرادآبادی

صفحات: 190، قیمت: 110، سنہ اشاعت: 2020

○ **اردو صحافت** (1901 تا 1947 ایک مختصر جائزہ)

مصنف: اسد رضا

صفحات: 155، قیمت: 95، سنہ اشاعت: 2020

○ **اردو صحافت** (1948 سے 2000 تک کا ایک مختصر جائزہ)

مصنف: سہیل انجم

صفحات: 116، قیمت: 80، سنہ اشاعت: 2020

ناشر: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان نئی دہلی

مبصر: یوسف رامپوری، ٹانڈہ، رامپور، یوپی

اردو صحافت کی تاریخ تقریباً دو صدیوں پر محیط ہے۔ 1822 میں 'جام جہاں نما' کے منظرعام پر آنے کے بعد اگلے چند سالوں میں اردو کے کئی اور اخبارات مختلف مقامات سے نکلنے شروع ہوگئے، پھر کیا تھا، نت نئے اخبارات کی اشاعت کا ایک ایسا سلسلہ بندھا جو وقت کے ساتھ روز بروز بڑھتا اور مستحکم ہوتا چلا گیا اور آج صورت حال یہ ہے کہ اردو صحافت کا قدیم وجدید سرمایہ ہزاروں اخبارات ورسائل پر مشتمل ہے۔ ان میں سے بہت سے اخبارات ورسائل ایسے بھی ہیں جنھوں نے اپنے عظیم کارناموں کی تاریخ رقم کی، ہندوستان کی تحریک آزادی کو پروان چڑھایا، سماج کی اصلاح کا فریضہ انجام دیا اور اردو زبان کے فروغ وارتقاء میں نمایاں کردار ادا کیا۔ اردو صحافت کے گراں قدر ذخیرے کو سامنے رکھ کر یہ بات کہی جا سکتی ہے کہ اردو صحافت کا تاریخی اور پہلو بہ پہلو مطالعہ نہ صرف صحافت سے وابستہ افراد کے لیے اہم ہے بلکہ دوسرے شعبوں سے جڑے ہوئے لوگوں کے لیے بھی افادیت سے خالی نہیں۔

یہ کتاب تین حصوں پر مشتمل ہے۔ پہلے حصہ میں آغاز سے 1857 تک کی اردو صحافت کا مختصر جائزہ ہے۔ اس حصے کے مصنف معصوم مرادآبادی ہیں جو خود بھی اردو کے معروف صحافی ہیں۔ دوسرے حصہ میں 1901 سے 1947 تک کی اردو صحافت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ یہ کام اسد رضا نے کیا ہے جو صحافی بھی ہیں اور ادیب بھی۔ تیسرا حصہ اردو کے معروف صحافی سہیل انجم نے لکھا ہے جس میں انھوں نے 1948 سے 2000 تک کی اردو صحافت کا مختصر جائزہ پیش کیا ہے۔ گویا کہ اس کتاب میں ابتدا سے لے کر آخر تک اردو صحافت کی صورت حال کا جائزہ لینے کی کوشش کی گئی ہے۔ البتہ 1857 کے بعد سے لے کر 1900 تک اردو صحافت کے تعلق سے اس سریز میں کچھ نہیں ہے، جب کہ 1857 کے بعد بھی بہت سے اخبارات نکلے اور بند ہوئے۔ تہذیب الاخلاق بھی اسی عہد کا اہم رسالہ ہے۔ جس طرح سلسلہ وار ان کتابوں کو منظرعام پر لایا گیا ہے، اس کا تقاضہ ہے کہ 1857 کے بعد کی اردو صحافت پر بھی ایک حصہ تصنیف کیا جانا چاہیے۔ اتنا ہی نہیں بلکہ اکیسویں صدی کی گذشتہ دو دہائیوں کی اردو صحافت کا جائزہ لینا بھی اہم معلوم ہوتا ہے۔ کیونکہ اس اثنا میں بہت سے نئے اخبارات ورسائل وجود میں آئے ہیں۔ گزشتہ دو دہائیوں کے اردو اخبارات ورسائل کا جائزہ اردو صحافت کی تازہ ترین صورت حال سے آگہی کے لیے اہم ہوگا۔ امید ہے کہ یہ خلا اردو صحافت کی اگلی اشاعتوں میں پُر ہو جائے گا۔

(1)

پہلے حصہ (یعنی اردو صحافت: آغاز سے 1857 تک کا ایک مختصر جائزہ) میں معصوم مرادآبادی نے اولاً اردو صحافت کے آغاز وارتقا سے بحث کی ہے اور اس بات کی دریافت کی کوشش کی ہے کہ سب سے پہلے اردو میں کون سا اخبار اشاعت پذیر ہوا تھا۔ اس تلاش وجستجو میں انھوں نے 'فوجی اخبار' کا بھی ذکر کیا ہے جو 1794 میں نکلنا شروع ہوا تھا۔ ٹیپو سلطان کا یہ اخبار پانچ سال تک چھپتا رہا تھا۔ مختلف دلائل اور اقتباسات پر مشتمل یہ بحث کافی دلچسپ اور معلوماتی ہے مگر چوں کہ 'فوجی اخبار' کا کوئی بھی شمارہ دستیاب نہیں ہے، اس لیے اس اخبار کی کوئی مدلل اور واضح تصویر سامنے نہیں آتی۔ مصنف نے ایک عنوان 'تاریخی پس منظر' قائم کرکے اس کے ذیل میں نہ صرف اردو صحافت کے تاریخی اور ارتقائی مراحل پر گفتگو کی ہے بلکہ عمومی صحافت کے آغاز پر بھی روشنی ڈالی ہے۔ اس طرح صحافت کا پس منظر ہمارے سامنے آجاتا ہے۔ اس کے بعد مصنف نے 'جام جہاں نما' کے حوالے سے ایک مفصل ومدلل تحریر لکھی ہے اور اس کی نوعیت کو واضح کیا ہے۔ دیگر جن اخبارات پر اس حصے میں خاص طور پر گفتگو کی گئی ہے ان میں شمس الاخبار، دہلی اردو اخبار، سید الاخبار، کوہ نور، صادق الاخبار، پیام آزادی وغیرہ اہمیت کے حامل ہیں۔ علاوہ ازیں کئی شہروں کے اخبارات ورسائل پر بھی مجموعی بات کی گئی

ہے۔ مثلاً پنجاب اور سندھ کے اخبارات، آگرہ کے اخبارات، لکھنؤ کے اخبارات وغیرہ۔ اس حصہ کی ایک خاص بات یہ بھی ہے کہ اس میں 1857 کے اخبارات اور ان کے کارناموں پر بھی تفصیلی روشنی ڈالی گئی ہے۔ درحقیقت اس زمانے کے اردو اخبارات نے 1857 کی جنگ آزادی میں بہت اہم رول نبھایا تھا۔ بعد میں کئی ایک اخبارات کو انگریزی قیود اور پابندیوں کا سامنا کرنا پڑا اور جان کی قربانی بھی پیش کرنی پڑی۔ 1857 کی جنگ آزادی میں جن اخبارات نے بڑھ چڑھ کر حصہ لیا، ان پر کتاب میں الگ الگ عنوانات قائم کیے گئے ہیں اور تفصیلی تحریریں لکھی گئی ہیں۔ ان اخبارات میں دہلی اردو اخبار، صادق الاخبار، پیام آزادی، سراج الاخبار وغیرہ شامل ہیں۔ کتاب کے پہلے حصے کے مطالعہ کے بعد نہ صرف ابتدائی دور کے اخبارات ورسائل کے بارے میں معلومات حاصل ہوتی ہیں بلکہ 1857 میں حصہ لینے والے اردو اخبارات اور اردو صحافیوں کی کاوشیں بھی سامنے آجاتی ہیں۔ گویا کہ اردو صحافت کی ابتدائی تاریخ اور آزادی میں اردو صحافت کے کردار کے تعلق سے معصوم مرادآبادی کی تصنیف کردہ یہ کتاب کافی اہم ہے۔

(2)

پیش نظر کتاب 'اردو صحافت' کا دوسرا حصہ (1901 تا 1947) اس طور پر بہت اہم ہے کہ اس میں بیسویں صدی کے نصف اول کی اردو صحافت کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بیسویں

صدی کے آغاز سے آزادی تک کے زمانہ کو اردو صحافت کا عہد زریں کہا جاسکتا ہے۔ اس عہد میں اردو کے بہت سے عظیم الشان اخبارات ورسائل نکلے اور کئی سطح پر انھوں نے اہم خدمات انجام دیں جن میں جدوجہد آزادی بھی شامل تھی۔ اس حوالے سے اسد رضا لکھتے ہیں: ''اردو صحافت کی تاریخ میں یوں تو ہر دور کی اہمیت ہے لیکن 1901 تا 1947 کے دور کی اس لیے نسبتاً زیادہ اہمیت ہے کہ اس دور میں جدوجہد آزادی اپنے شباب پر تھی اور اردو صحافت کو نئی قوت ملی۔'' کتاب کے عنوانات پر ایک ہلکی سی نظر ڈالنے سے ہی پتہ چل جاتا ہے کہ یہ کتاب بیسویں صدی کے نصف اول کا کس حد تک احاطہ کرتی ہے۔ مصنف نے ہر عشرے کے اخبارات وجرائد کا الگ الگ عنوانات کے ذیل میں تذکرہ کیا ہے اور مختصر مگر اہم معلومات جمع کی ہیں۔ مثلاً: 1901 تا 1910 کے اخبارات وجرائد، 1911 تا 1920 کے جرائد، 1921 تا 1930 کے درمیان منظر عام پر آنے والے جرائد، 1931 تا 1940 کے درمیان منظر عام پر آنے والے جرائد، 1941 تا 1947 کے درمیان منظر عام پر آنے والے جرائد۔ اس کے علاوہ اردو صحافت اور تحریک آزادی پر ایک مکمل اور مفصل مضمون بھی اس میں شامل ہے جس میں اس پہلو سے 1901 سے 1947 تک کے اردو اخبارات کا جائزہ لیا گیا ہے۔ ایک مضمون اردو صحافت اور تحریک خلافت پر بھی ہے۔ جس میں تحریک خلافت کے حوالے سے اردو اخبارات ورسائل کی کوششوں کا جائزہ لیا گیا ہے۔ بیسویں صدی کی ابتدائی دو دہائیاں خلافت عثمانیہ کے تعلق سے بہت اہم سمجھی جاتی ہیں کیونکہ اس اثنا میں خلافت کو ختم کرنے کے لیے عالمی سطح پر سازشیں اور کوششیں ہو رہی تھیں۔ مسلمانان عالم خلافت عثمانیہ کی بقا چاہتے تھے۔ اس لیے اس کے حق میں آواز بلند کر رہے تھے۔ اردو اخبارات ورسائل بھی خلافت کے تعلق سے خبریں اور مضامین شائع کر رہے تھے، جس کے سبب تحریک خلافت کا دائرہ وسیع ہوتا جارہا تھا۔ تحریک خلافت کے حوالے سے اردو صحافت کے کردار کو جاننے کے لیے یہ مضمون خاصا معلوماتی ہے۔

پیش نظر کتاب میں اردو کے اہم صحافیوں کے حوالے سے بھی اچھی گفتگو کی گئی ہے۔ جس سے کتاب کی وقعت وافادیت میں اضافہ ہوگیا ہے۔ اگر دیکھا جائے تو اس زمانے میں اردو کے بہت سے عظیم صحافی موجود تھے۔ مولانا ابوالکلام آزاد، مولانا ظفر علی خاں، مولانا محمد علی جوہر، خوشحال چند خورسند، منشی دیانارائن نگم، نیاز فتح پوری، شوکت تھانوی، عبدالرزاق ملیح آبادی، سید سلیمان ندوی، مولانا عبدالماجد دریابادی، حیات اللہ انصاری، سید ابوالاعلی مودودی، محمد عثمان فارقلیط، لالہ جگت نارائن وغیرہ۔ ان سب کا تذکرہ اس کتاب کے اندر موجود ہے۔ مجموعی طور پر کہا جاسکتا ہے کہ جس عہد کا یہ کتاب احاطہ کرتی ہے، اس عہد کی اردو صحافت پر یہ بہت مفید ہے۔

(3)

سہیل انجم نے اردو صحافت کے تیسرے حصے میں '1948 تا 2000' کی اردو صحافت کو سمیٹنے کی کوشش کی ہے۔ 1947 کے بعد کا زمانہ کئی اعتبار سے بڑا پرآشوب رہا

اور کئی سطح پر بڑی تبدیلیاں ہوئیں۔ دراصل 1947 میں ملک تقسیم ہوگیا تھا۔ اور اس تقسیم نے نہ صرف خطوں کو تقسیم کیا تھا بلکہ بہت سے لوگوں کے دلوں اور تہذیبوں کو بھی متاثر کیا تھا۔ آزادی کے بعد جن چیزوں پر زیادہ حالات آئے، ان میں اردو زبان بھی تھی۔ ظاہر ہے کہ ایسے حالات میں اردو صحافت بھی متاثر ہوئی۔ اردو اخبارات وجرائد کی وہ رفتار جو آزادی سے پہلے تھی اس میں کمی آگئی۔ بہت سے اردو اخبارات وجرائد بند ہوگئے، جو باقی رہے انھیں بھی حالات کا سامنا کرنا پڑا۔ اسی لیے کتاب کے مصنف سہیل انجم نے 'ملک کے ساتھ اردو صحافت کی بھی تقسیم' کے تحت اس درد کو بیان کرنے کی کوشش کی ہے۔ لیکن وقت کے ساتھ حالات تبدیل ہوگئے اور اردو صحافت کے لیے فضا ہموار ہونے لگی جس کے بعد پھر بڑے پیمانہ پر ہندوستان میں اردو اخبارات ورسائل نکلتے ہوئے نظر آئے۔ مصنف لکھتے ہیں:

''تقسیم ملک سے قبل وطن عزیز سے بہت سے اردو اخبارات نکل رہے تھے۔ تقسیم کے بعد ان میں سے بہت سے اخبارات پاکستان میں رہ گئے اور بہت سے صحافی یہاں سے پاکستان چلے گئے۔ اگر ہم یہ کہیں کہ آزادی کی صبح نے ہندوستان کے دامن کو اردو اخبارات سے تقریباً خالی کردیا تھا تو شاید غلط نہیں ہوگا لیکن یہ کمی زیادہ دنوں تک نہیں رہی۔ آزادی کے بعد اخبار پر اخبار نکلتے گئے اور ان کی تعداد دن بہ دن بڑھتی گئی۔ صرف اخباروں کی تعداد ہی نہیں بڑھی بلکہ ان کی تعداد اشاعت میں بھی خاطر خواہ اضافہ ہوتا رہا۔ رفتہ رفتہ ہندوستان کی سرزمین اردو اخباروں کی آماجگاہ بن گئی۔''

بیسویں صدی کے نصف آخر کی اردو صحافت سے متعارف کرانے کے لیے صاحب کتاب نے صوبائی سطح پر اردو صحافت کا جائزہ لیا ہے۔ اور یہ طریقہ مستحسن بھی نظر آتا ہے کیونکہ اس طرح بہت واضح طور پر ہر جگہ کی صحافت کی صورت حال کا علم ہوجاتا ہے۔ صوبائی سطح پر اردو صحافت کا جائزہ لینے کے لیے مصنف نے اس طرح کے عنوانات قائم کیے ہیں: دہلی کے اخبار اور اہم صحافی، اترپردیش کے اخبارات، مغربی بنگال کے اخبارات، مہاراشٹر کے اخبارات، حیدرآباد کے اخبارات، بنگلور کے اخبارات، بھوپال کے اخبارات، جے پور کے اخبارات، پنجاب کے اخبارات وغیرہ۔ اس طرح الگ الگ صوبوں کی صحافت کا ہمیں علم ہوجاتا ہے۔ صاحب کتاب نے صحافت کے ایک اور اہم گوشے پر بہت تفصیل سے لکھا ہے اور وہ ہے 'ادبی صحافت'۔ ظاہر ہے کہ ادبی صحافت سے کم ہی لوگ بحث کرتے ہیں جب کہ ادبی صحافت کا اپنا ایک الگ مقام ہے۔

مجموعی طور پر یہ کہا جاسکتا ہے کہ یہ تینوں کتابیں اردو صحافت کی عہد بعہد تاریخ کے حوالے سے بہت اہم ہیں اور اردو صحافت کا تاریخی منظر نامہ ان کے ذریعے ابھر کر سامنے آجاتا ہے۔

تحقیق و تنقید

علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں

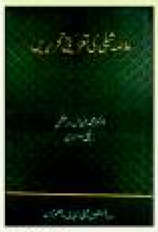

مصنف: ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی

صفحات: 95 قیمت: 180 سنہ اشاعت 2019

ناشر: دارالمصنفین شبلی اکیڈمی، اعظم گڑھ

مبصر: ڈاکٹر ریحان حسن، شعبہ اردو و فارسی

گورو نانک دیو یونیورسٹی، امرتسر (پنجاب)

علامہ شبلی نعمانی ان نابغہ روزگار شخصیتوں میں ہیں کہ جن کے کارناموں کے نقوش امتداد زمانہ کے ساتھ دھندلے پڑنے والے نہیں ہیں۔ جس قدر ان کے علمی کارناموں پر غور وفکر کیا جائے گا ان کی شخصیت اور تحریر، قلمکاروں کو ایک نئے انداز سے غور وفکر کرنے پر مجبور کرے گی۔ جس کا واضح ثبوت ڈاکٹر الیاس الاعظمی کی کتاب 'علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں' بھی ہے۔ صداقت تو یہ ہے کہ اگر ڈاکٹر الیاس اعظمی نے علامہ شبلی نعمانی کی زندگی کے مختلف پہلوؤں سے روشناس نہ کرایا ہوتا تو نہ جانے کب تک علامہ شبلی کے کتنے ہی علمی کارناموں سے اردو دنیا ناواقف رہتی۔ شبلی نعمانی سے متعلق پردہ خفا میں رہنے والے کارناموں سے واقفیت بہم پہنچانے میں ان کی جستجو اور تلاش کا مسلسل جاری رہنا جہاں ان کے علم کی تشنگی نہ بجھنے کا ثبوت ہے وہیں علامہ کے علمی کارناموں سے ان کے عشق وعقیدت کا اظہار بھی ہے۔

دراصل زیر تبصرہ کتاب میں علامہ شبلی نعمانی کے تعزیتی خطوط یکجا کیے گئے ہیں جو 95 صفحات پر مشتمل ہیں۔ مرتب نے علامہ کی 26 تعزیتی تحریروں کو اکٹھا کر کے یقیناً قابل قدر کارنامہ انجام دیا ہے۔ تعزیتی تحریروں کو جمع کرنے کی ضرورت کیوں پڑی اس پر مرتب کچھ یوں اظہار خیال کرتے ہیں:

''علامہ شبلی کی سوانحی کتب کے بعض حصوں میں حزنیہ تحریریں تو ہیں ہی البتہ اس کے زیادہ واضح نقوش موازنہ انیس و دبیر میں ملتے ہیں، جہاں انھوں نے مراثی وانیس و دبیر کی تشریحات کی ہیں انھیں کے مطالعہ سے خیال پیدا ہوا کہ اس کی طرف بھی توجہ کرنی چاہیے۔''

کتاب میں پیش لفظ اور دیباچہ کے علاوہ 'علامہ شبلی پر ایک نظر' کے عنوان سے شبلی نعمانی پر بھرپور گفتگو کی گئی ہے۔ دراصل وفیاتی اور تعزیتی تحریریں مرتب نے ماہنامہ الندوہ، مکاتیب شبلی، مکتوبات شبلی اور خطبات شبلی سے نقل کی ہیں۔ اس کے علاوہ دو وفیاتی تذکرے مکاتیب شبلی کے مختلف اقتباسات سے اخذ کیے گئے ہیں۔ تعزیتی تحریروں کے ساتھ تین مرثیے بھی ہیں جن میں سے دو فارسی زبان میں ہیں اور ایک اردو میں۔ کتاب میں علامہ کے دو بھائیوں کی تعزیتی تحریر بھی ہے جن میں سے بھائی مہدی حسن بیرسٹر کے ذکر میں رونے کا ذکر کیا گیا ہے۔ سر سید احمد خاں پر تعزیتی تحریر میں ''قومی عمارت کے ستون کے ہل جانے اور قومی شیرازہ کے بکھر جانے'' کا ذکر انتہائی حسرت وافسوس کے ساتھ ہے۔ اس کے علاوہ منشی ذکاء اللہ خاں، نواب محسن الملک اور منجھلے بھائی محمد اسحاق وکیل کی وفات سے متعلق تعزیتی تحریر بھی ہے ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی نے تعزیتی تحریروں کو جمع کرنے کے ساتھ ساتھ تعلیقات وحواشی کے ذریعے علامہ کی تحریروں کی اہمیت کو جس طرح اجاگر کیا ہے وہ شبلی نعمانی کے عقیدتمندوں کے لیے خاصہ کی چیز ہے۔

سچ تو یہ ہے کہ مرتب نے علامہ کی تعزیتی تحریروں کو یکجا کر کے شبلی نعمانی کے افکار و نظریات سے اردو ادب کے شائقین کو نئے انداز سے متعارف کرایا ہے۔ علامہ شبلی نعمانی سے متعلق ڈاکٹر محمد الیاس الاعظمی کے مثل ڈاکٹر عمیر منظر نے بھی 'شبلی مکاتیب شبلی اور ندوۃ العلما' ڈاکٹر خالد ندیم نے 'شبلی شکنی کی روایت اور دوسرے مضامین' اور 'شبلی کی آپ بیتی، خطوط شبلی کی مدد سے' وغیرہ شائع کی ہیں جن سے شبلی فہمی کے نئے در وا ہوئے ہیں لیکن ڈاکٹر محمد الیاس اعظمی نے علامہ شبلی سے متعلق شبلی سخنوروں کی نظر میں، اقبال اور جہان شبلی، اقبال اور دبستان شبلی، شبلی شناسی کے سو سال، نوادرات شبلی، متعلقات شبلی وغیرہ جیسی کتابوں کے ذریعے شبلی شناسی کی جو راہیں بنائی ہیں وہ عاشقان اردو کے لیے مشعل راہ ہیں۔ ظاہر ہے کہ شبلی فہمی اور شبلی شناسی سے متعلق یہ کام مکمل نہیں کہے جا سکتے کیونکہ ابھی علامہ سے متعلق نہ جانے کتنے گوشے تشنۂ تحقیق ہیں۔ امید قوی ہے کہ علامہ شبلی نعمانی سے متعلق پردۂ خفا میں رہنے والے کاموں سے مرتب موصوف علمی دنیا کو متعارف کرانے کا فریضہ مرتب انجام دیتے رہیں گے اور اس طرح شبلی شناسی کی نو بہ نو راہیں وا ہوتی رہیں گی۔ انھوں نے 'علامہ شبلی کی تعزیتی تحریریں' کے ذریعے جو شبلی کی تفہیم وترسیل کا کارنامہ انجام دیا ہے وہ بھی قابل استحسان ہے کیونکہ اس کتاب میں علامہ شبلی کی حیات کے بعض ایسے پہلوؤں پر روشنی پڑتی ہے جو اس سے پہلے سامنے نہیں آئے تھے۔ مجھے امید ہے کہ یہ کتاب علامہ شبلی کے عقیدتمندوں اور اردو زبان سے عشق رکھنے والوں کو اپنی جانب متوجہ ضرور کرے گی۔

برصغیر کی تقسیم کا المیہ

(اردو انگریزی ناولوں کے حوالے سے)

مصنف: ڈاکٹر زیبا فاروقی

صفحات: 348، قیمت: 450 روپے

ناشر: ایجوکیشنل بک ہاؤس علی گڑھ، اتر پردیش

مبصر: انوری خاتون، N/139-B1، ابوالفضل انکلیو، جامعہ نگر، نئی دہلی 110025

ہندوستان کی تقسیم نے ہماری قدروں اور روایات کو سرے سے تبدیل کر دیا۔ ہندو پاک کے لوگوں کی ہجرت کے نتیجے میں سماج تخریب وتعمیر کے غیر متوقع مرحلوں سے گزرا۔ ہندوستان کی تقسیم کو مثبت کہنے والوں کی تعداد برائے نام تھی۔ اکثریت ایسے لوگوں کی تھی جو فسادات کے ڈر سے یا خاندان کے لوگوں کے ساتھ ہجرت کرنے پر مجبور تھے۔ ملک کی تقسیم برصغیر ہند کے ادب کا اہم حصہ رہی ہے۔ ہندوستان کی تقسیم کو موضوع بنا کر نہ صرف عصری ادب میں بلکہ بعد کے دور میں بھی متعدد تخلیقات شائع ہوتی رہی ہیں۔ تقسیم کے زخم کو سینے پر اٹھانے والی نسل اور وہ جو تقسیم کے سائے میں پروان چڑھی، ہندوستان کی تاریخ کے اس تاریک ترین باب کو کبھی بھول نہ پائی۔ چنانچہ برسوں بعد بھی تقسیم ہند کا موضوع ادب کے مختلف شعبوں میں راہ پاتا رہا ہے۔

ناول معاشرے کا آئینہ دار ہوتا ہے۔ لہٰذا یہاں بھی یہ موضوع کافی متداول رہا ہے۔ تقسیم کے فوری اثرات یعنی فسادات اور ہجرت، اس کے دوررس اثرات یعنی ملک کی گنگا جمنی تہذیب کا انہدام نہ صرف اردو بلکہ ہندی اور انگریزی ناولوں میں بھی مختلف بار پیش کیا گیا ہے۔

تقسیم ہند کے دوران جو لاتعداد انسانی المیے ظہور پذیر ہوئے ان کے بارے میں اردو ادب میں بہت کچھ لکھا گیا۔ ترک وطن، جس میں ہزاروں خطرات تھے اور بہت سے رونما بھی ہوئے، قتل وغارت گری، ریل گاڑیوں کے مسافروں کا قتل عام، لڑکیوں اور عورتوں کے ساتھ بہیمانہ سلوک، اغوا جس کا ایک معمولی پہلو تھا۔ مہاجرین کا درد اور معاشرے کا زوال تقسیم کے ناولوں کا نمایاں رنگ ہے۔ زیر نظر کتاب میں اردو اور انگریزی زبان کے ناولوں میں تقسیم کے مختلف پہلوؤں کی پیش کش پر بحث کی گئی ہے۔

کتاب کے پہلے باب 'تقسیم ہند کی تاریخی حیثیت' ملک کی تقسیم کو حقائق کے تناظر میں دیکھنے

کی کوشش کی گئی ہے۔ یہ باب اس بات کا ثبوت فراہم کرتا ہے کہ ہندو مسلم نفاق کا بیج برطانوی حکومت کی طے شدہ حکمت عملی کے تحت بویا گیا تھا۔ سیاست دانوں کی ناعاقبت اندیشی اور ذاتی مفاد پرستی نے اختلافات کو مزید بڑھاوا دیا جس کا انجام ملک کی تقسیم کے طور پر سامنے آیا۔

کتاب کے دوسرے باب میں برصغیر ہند کی معاشرتی و تہذیبی زندگی پر تقسیم کے اثرات کا تاریخی حوالے سے جائزہ لیا گیا ہے۔ جس کے نتیجے میں ہندوستان و پاکستان کی نوتعمیر شدہ سرحد کے دونوں جانب وسیع پیمانے پر نقل مکانی عمل میں آئی۔ مہاجرین کی آمد نے دونوں ملکوں کی تہذیب و تمدن کو بہت متاثر کیا۔ وہیں دوسری طرف کبھی کبھی تصادم کی صورت بھی پیدا ہوئی۔ تیسرے باب میں تقسیم ہند سے قبل اردو ناولوں کے پسندیدہ موضوعات اور فنی محرکات کے مطالعہ سے ظاہر ہوتا ہے کہ معاشرے کے رجحانات ہمیشہ ہی ناولوں کے لیے خام مواد فراہم کرتے آئے ہیں۔ ادب کی دیگر اصناف کی طرح ملک کی تقسیم نے ناول کو بھی بے حد متاثر کیا۔ نہ صرف اردو بلکہ ہندی، پنجابی، بنگالی اور انگریزی میں بھی تاریخ کے دل سوز سانحہ کو بیان کرتے ہوئے متعدد ناول سامنے آئے اور لوگوں نے انھیں پسند بھی کیا۔

1947 کے بعد ناولوں میں تقسیم ایک اہم موضوع کی حیثیت سے نامی باب میں اس موضوع کا احاطہ کرنے والے چندہ اردو اور انگریزی ناولوں کا تجزیہ پیش کیا گیا ہے۔ جیسے بیدی کا لاجونتی اور قرۃ العین حیدر کا ہاؤسنگ سوسائٹی اور عبداللہ حسین کا اداس نسلیں وغیرہ۔ اس سے معلوم ہوتا ہے کہ مختلف ناول نگاروں نے اس موضوع کو کس حد تک برتا ہے۔ اس سلسلے میں Azadi اور ,Ice Candy man جیسے ناول ایک طویل مدت بعد لکھے جانے کے بعد بھی اس ہیجان خیز دور کی یاد تازہ کر دیتے ہیں۔

آخری باب میں اس موضوع پر لکھے گئے اردو انگریزی ناولوں کا تقابلی مطالعہ پیش کیا گیا ہے۔ گزشتہ باب میں جن ناولوں کا تجزیہ پیش کیا گیا تھا ان پر مجموعی گفتگو بھی کی گئی ہے۔ اس کے علاوہ اردو انگریزی ناولوں کے مماثل و مخالف قدروں کا تعین کیا گیا ہے۔ دونوں زبانوں کے ناول نگاروں نے تشدد اور فرقہ واریت کی مذمت کی ہے اور کسی ایک فرقے کو مورد الزام ٹھہرانے سے گریز کیا ہے۔ لیکن اردو اور انگریزی ناولوں میں ایک بنیادی فرق یہ ہے کہ انگریزی ناول تخریب کے بعد ایک نئی تعمیر کے رجائی احساس پر ختم ہوئے ہیں جبکہ اردو ناولوں میں معاشرے کے انہدام و انتشار کا ماتم ہے۔ یہی باب اس کتاب کا خلاصہ اور مغز ہے۔ جس کے مطالعے سے اندازہ ہوتا ہے کہ دونوں زبانوں کے مصنفین کس طرح جذباتیت اور اپنی ذاتی پسند و ناپسند کے زیر اثر پلاٹ کو کسی خاص رخ پر موڑ دیتے ہیں۔

ڈاکٹر زیبا فاروقی نے انگریزی کے بھی ان ناولوں کو دائرہ بحث میں رکھا ہے جن میں تقسیم ہند کے معاملات اور امور پر بیانیہ کو قائم کیا گیا ہے۔ امید ہے کہ یہ کتاب اپنے موضوع، مواد اور پیش کش کے متوازن اسلوب کی وجہ سے اردو قارئین کے حلقے میں بے حد پسند کی جائے گی۔ طلبا، ریسرچ اسکالر اور اساتذہ کے علاوہ عام قارئین بھی اسے قدر کی نگاہ سے دیکھیں گے۔ انھیں اس موضوع سے متعلق بہت سارا مواد حاصل ہوگا۔ وہ اس سے بھرپور استفادہ کریں گے۔ ڈاکٹر زیبا نے اس کتاب کے ذریعے اردو ادب کی بڑی خدمت انجام دی ہے۔

تفہیم و تعبیر

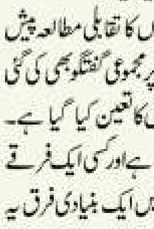

مصنف: عبدالباری قاسمی

صفحات: 254، قیمت 200، سال اشاعت 2020

ناشر: مرکزی پبلی کیشنز، نئی دہلی

مبصر: امیر حمزہ، مدنی مسجد، نوادہ، بشن گڑھ، ہزاری باغ، جھارکھنڈ

موجودہ دہائی میں اردو کی ادبی دنیا پر نظر ڈالیں تو ریسرچ اسکالروں کی تحریریں اس بات کی غمازی کرتی ہیں کہ مستقبل میں تنقید و تحقیق سے لے کر تخلیق تک روشن ہے۔ ایک طرف جہاں عمدہ تنقیدی و تحقیقی تحریریں سامنے آرہی ہیں تو وہیں دوسری جانب ادب کی گمشدہ کڑیوں پر خصوصی توجہ دی جارہی ہے۔ ادب کے جن مکاتب یا دھاراؤں کو چھوڑ دیا گیا تھا، نئی نسل ان کو مضبوطی سے سامنے لارہی ہے۔ اسی نئی نسل سے عبدالباری قاسمی کا بھی تعلق ہے۔ موجودہ دور میں یک موضوعی کتابوں کا چلن بہت ہی زیادہ عام ہوا ہے، اس میں تبصراتی اور تاثراتی تنقید ہوتی ہے اور تحقیق بھی۔ کئی کتابوں میں ماقبل میں شائع شدہ مواد کی تکرار بھی نظر آتی ہے اور کچھ کتابیں بالکل نئے رنگ و ڈھنگ کے ساتھ سامنے آتی ہیں۔ عبدالباری قاسمی کی اس تصنیف میں دونوں چیزیں نظر آئیں گی، لیکن یہ کتاب جس مقصد سے لکھی گئی ہے اس پر نظر ڈالیں گے تو یہ اس میں ایک حد تک کامیاب بھی نظر آتی ہے۔ وہ کیسے؟ تو چلیں اس کے مشمولات پر نظر ڈالتے ہیں۔ تحریری طور پر اس کتاب کو سات شیرازے میں منظم کیا گیا ہے۔ اول 'سلسلۂ نثر' ہے۔ اس میں چار مضامین ابتدائی اردو نثر پر ہیں۔ اٹھارہویں صدی میں اردو نثر، قصہ مہر افروز دلبر کا تنقیدی جائزہ، فسانۂ آزاد کی ادبی اہمیت، امراؤ جان ادا: ایک مطالعہ، دوم 'اسالیب' ہے، اس میں اردو کی کلاسیکی نثری کتابوں کے اسالیب کو مدنظر رکھ کر چار مضامین تحریر کیے گئے ہیں۔ نوطرز مرصع کے اسلوب کی اہمیت، سرسید احمد خاں کا نثری اسلوب، مولوی عبدالحق کا نثری اسلوب اور 'غبار خاطر کا اسلوب'۔ سوم 'سلسلۂ شعر و سخن' ہے، جس میں زہر عشق کی ادبی اہمیت، جدید اردو غزل: ابتدا و ارتقا، مسدس حالی: تعارف اور امتیاز، فراق گورکھپوری کی شاعری کے امتیازات اور قاری فخر الدین گیاوی و مولانا احمد سعید دہلوی کی شاعری پر مضامین ہیں۔ چہارم 'سلسلۂ نقد و تحقیق' ہے، اس میں دو مضامین مشرقی تنقید: آغاز و ارتقا اور 'خواجہ احمد فاروقی ایک محقق اور نقاد گر ادیب' ہیں۔ پنجم 'فارسی ادبیات' میں فارسی زبان: آغاز و ارتقا، ہندوستانی زبان پر فارسی کے اثرات پر دو مضامین ہیں۔ ششم 'اقبالیات' میں اقبال کی انفرادیت فکر و فن کے تناظر میں، کلام اقبال میں قرآنی علوم و افکار کی ترجمانی اور 'ذکر اقبال کا تنقیدی جائزہ' ہے۔ ہفتم 'متفرقات' کے تحت ادب اطفال: اہمیت و افادیت، میڈیا، ماس میڈیا روایت اور مسائل اور 'اردو کا وسیع ہوتا دائرہ اور تلفظ کی بڑھتی غلطیاں' ہیں۔ اس طرح کل چوبیس مضامین ہوئے جن میں سے شروع کے بارہ مضامین کا تعلق ایم اے کے نصاب سے بھی ہے۔ ایم اے کے نصاب میں طلبہ کو بنیادی طور پر جن معلوماتی و تنقیدی تحریروں کی ضرورت پڑتی ہے وہ ان مضامین سے پوری ہوسکتی ہے لیکن سب کا احاطہ نہیں کیا گیا ہے کہ کہا جائے کہ خالص ایم اے کے نصاب کو سامنے رکھ کر لکھا گیا ہے بلکہ بارہ دیگر مضامین سے تنوع کا احساس ہوتا ہے۔ متروک دھاراؤں کی بات ہوئی تھی تو اس کی مثال کے طور پر قاری فخر الدین گیاوی اور مولانا احمد سعید دہلوی پر لکھے گئے مضامین کو دیکھ سکتے ہیں۔ احمد سعید تو خالص دلی والے تھے اور دلی کے میلے ٹھیلے کی روح و زبان ان کی گھٹی میں تھی، آزادی کے بعد لال قلعہ مشاعرہ کے بنیاد گزاروں میں سے وہ ہیں، لیکن شاید ہی ادب کی محفلوں میں ان کا ذکر ہو۔ فارسی زبان: آغاز ارتقا اور ہندوستانی زبانوں پر اس کے اثرات ایسے مضامین ہیں جو تحقیقی بھی ہیں اور معلومات سے پر بھی۔ 'مشرقی تنقید: آغاز و ارتقا' کو اس کتاب کا اہم مضمون سمجھا جائے تو کوئی مضائقہ نہیں، اس میں مصنف نے عربی و فارسی ہی نہیں بلکہ سنسکرت، چینی و جاپانی ادب پر بھی روشنی ڈالی ہے جس پر حقانی القاسمی اسی کتاب کے مقدمہ میں لکھتے ہیں "انھوں نے چینی اور جاپانی زبان کی تنقیدی روایات پر بھی روشنی ڈالی ہے، جبکہ مشرقی شعریات پر جو مستند اور معتبر کتابیں لکھی گئی ہیں ان میں چینی اور جاپانی تنقیدی روایت کا حاشیہ اور حوالہ میں بھی ذکر نہیں ملتا۔" اس جملہ سے احساس

ہوجاتا ہے کہ مصنف نے روایت سے ہٹ کر کام کرنے کو اپنا نصب العین بنایا اور مشرقی ادبیات سے وہی مراد نہیں جسے اردو والے جانتے ہیں بلکہ وہ زبانیں بھی ہیں جن سے ہمارا دور کا بھی واسطہ نہیں لیکن ہمارے پڑوس میں ہم سے پہلے فروغ پائی ہیں اور اردو والے ان کا ذکر تک بھی نہیں کرتے۔ نئی نسل اپنی تحریروں میں جس چیز پر یقین رکھتی ہے اس کا ہلکا سا نمونہ اس کتاب میں دیکھنے کو ملتا ہے کہ وہ مواد کی پیش کش میں یقین رکھتی ہے نہ کہ لفظوں کے الجھاؤ میں۔ الغرض عبدالباری قاسمی کی یہ کتاب طلبہ کی ضرورت ہے۔

ادب کے ستارہ گر

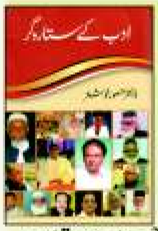

مصنف/مرتب: ڈاکٹر منصور خوشتر

صفحات: 352 قیمت: 400، سنہ اشاعت 2020

ناشر: المنصور ایجوکیشنل اینڈ ویلفیئر ٹرسٹ، دربھنگہ

مبصر: ڈاکٹر صالحہ صدیقی، الہ آباد

'ادب کے ستارہ گر' منصور خوشتر کے مضامین کا مجموعہ ہے۔ جس میں 46 قلمکاروں پر لکھے منصور خوشتر کے مضامین ہیں۔ منصور خوشتر ایک فعال نوجوان قلمکار ہیں جنھوں نے بہت کم وقت میں شعروادب کی دنیا میں اپنی پہچان بنائی ہے۔ ان کی اب تک کئی کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ ان کی قابلیت کا اعتراف اردو کے ممتاز قلمکاروں نے بھی کیا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں شامل مضامین کے مطالعہ سے منصور خوشتر کی صلاحیتوں اور ان کی ناقدانہ بصیرتوں کا قائل ہونا پڑتا ہے۔ اس کتاب میں منصور خوشتر نے اپنی ریاست کی عالمی شہرت یافتہ شخصیات پر خامہ فرسائی کی ہے۔ ان میں شاعر بھی ہیں افسانہ نگار بھی، ناقد بھی ہیں اور علمائے کرام بھی ہیں۔ یہ تمام مضامین مدلل اور معلومات سے بھرے ہوئے ہیں۔ منصور خوشتر کی زبان میں کہیں تو ''ان مضامین میں ہیچ کے مختلف النوع صورتیں آپ پاسکیں گے۔ اسی وسعت آشنا معنی خیزی میں میری تحریر کی کامیابی ہے۔'' ادب کے ستارہ گر پر منظوم تاثر پروفیسر طرزی نے لکھا ہے جس سے اس کتاب کی اہمیت، منصور خوشتر کے ادبی وشعری کارناموں اور اس کتاب میں شامل مضامین کی اہمیت پر بھرپور روشنی پڑتی ہے۔ اس نظم کے چند اشعار یہاں پیش کیے جاتے ہیں۔ طرزی صاحب اپنے تاثرات قلب کو کچھ اس انداز میں بیان کرتے ہیں۔

کتاب اک 'ادب کے ستارہ گروں' پر — بہت خوب ہی لانے والے ہیں خوشتر
جو سہ ماہی دربھنگہ ٹائمز ہے بھی — ادارت گراں قدر کرتے اسی کی
کتابیں ابھی تک جو پندرہ ہیں لائے — ادب کے وہ خادم ہیں اک مانے جاتے
جو تعداد دیکھیں ستارہ گروں کی — تو چالیس پاتے بھی ہیں ایک کم ہی
بہار ایک صوبہ ہے ہندوستاں کا — ستارہ گروں کا وہیں سے ہے رشتہ
کرو خوب سے خوب تر پیارے خوشتر — ادب کے فلک پر بنو ماہ انور

کورونا نے جس طرح پوری دنیا کو اپنی چپیٹ میں لے لیا اور زندگی کی تصویر بدل ڈالی اس سے ادیب و شعرا کا حساس دل بھی لکھنے سے خود کو روک نہ سکا۔ کرونا نے اردو ادب پر گہرے نقوش مرتب کیے، بقول شخصے 'ادب تنقید حیات' ہے اس تعریف کو مشرق و مغرب میں ادب کی مقبول و معقول تعریف کہا جائے تو ہم شعروادب میں تاریخی سانحات کا عکس بھی دیکھ سکتے ہیں۔ کرونا کی صورت حال نے جس طرح پوری دنیا کو خوف وہراس کی سیاہ بند گلی کی طرف دھکیل دیا ہے شاعروں نے اپنے کلام سے اس میں روشنی پیدا کرنے کی کوشش کی ہے، یہ ایسا عالمی سانحہ ہے جسے ادب وصحافت نے اپنے مزاج سے دیکھا اور اپنے منظرناموں کا حصہ بنایا۔ خصوصاً سوشل میڈیا نے اس میں اہم رول ادا کیا۔ سوشل میڈیا پر کرونا نے وبائے عام کو ادب کے تخلیقی رویے کے طور پر دیکھنے کا رجحان پیدا کیا۔ جس میں فارسی کے اس مشہور شعر کی بازگشت بھی سنائی دے رہی ہے۔

چناں قحط سالے شد اندر دمشق
کہ یاراں فراموش کردند عشق

اس وبائے عام نے نفسیاتی اثرات سے لے کر سماجی وجود کو نہ صرف جام کر دیا بلکہ ترقی کے سفر پر بھی بریک لگا دیا۔ لیکن جب دوڑتی بھاگتی زندگی پر بریک لگا تو لوگوں کی ملاقات خود سے بھی ہوئی، کسی نے ماضی کو دہرایا تو کسی نے آج اور آنے والے کل کو سنوارنے کی بات کہی، کسی نے بزرگوں کی تحریروں کو بھی کھنگالا۔ کہہ سکتے ہے کہ کرونا وبا نے ماضی کے بھولے بسرے ادب کو دوبارہ تازہ کر دیا۔ مرزا غالب کی اس پیش گوئی کا ذکر ہو رہا ہے جس میں غالب یاسیت میں ہر سال اپنے مرنے کی پیش گوئی کرتے ہیں کہ اس سال میں ضرور مرجاؤں گا۔ اتفاق سے ایک برس دہلی میں وبا پھوٹ پڑی لیکن غالب زندہ ہیں تو غالب نے فرمایا۔

وبائے عام میں مرنا مجھے گوارا نہ ہوا

اس وبا نے زندگی کے ہر گوشے کو متاثر کیا زندگی تھم گئی لیکن ادب کا کارواں آگے بڑھتا رہا۔ سال 2020 میں منصور خوشتر نے اپنی اس کتاب کو منظر عام پر لا کر یہ پیغام دے دیا کہ چاہے جو کچھ بھی ہو حالات جیسے بھی ہوں ان کا سامنا کرنا اور آگے بڑھنا ہی زندہ ومتحرک ہونے کی نشانی ہے۔ مجموعی طور پر یہ انتہائی اہم اور معلومات سے بھری شاندار کتاب ہے جسے بہت عرق ریزی سے منصور خوشتر نے لکھا ہے۔ منصور خوشتر کی محنت اس کتاب کے ہر صفحہ پر دیکھی جاسکتی ہے۔ چونکہ یہ 352 صفحات پر مشتمل ایک ضخیم کتاب ہے۔ جس میں شعروادب کی مختلف اصناف کے بے شمار گوشوں پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ اس لیے اس مختصر تبصرے میں ان تمام مضامین کا جائزہ یا ایک ایک مضمون پر گفتگو کرنا ممکن نہیں۔ طوالت کے اندیشے سے صرف اشارے پر ہی اکتفا کیا گیا ہے۔

اس کتاب میں شامل منصور خوشتر کے مضامین کا مطالعہ کیا اور مختلف قلمکاروں پر نظر ڈالی تو حیران رہ گئی کہ کیسی کیسی عظیم ہستیوں نے کیا کیا کارنامے انجام دیے ہیں ان کے مطالعہ سے ایسا محسوس ہوتا ہے جیسے آسمان ادب پر چمکدار ستارے جگمگا رہے ہوں۔ بلاشبہ 'ادب کے ستارہ گر' منصور خوشتر کا ایک اہم کارنامہ ہے جس کے ذریعہ انھوں نے اہم ادبی شخصیات کو ایک مالا میں پرونے کا کام کیا ہے۔ میں ان کی اس بے لوث خدمت کے لیے انھیں مبارکباد پیش کرتی ہوں ساتھ ہی یہ توقع بھی کہ 'ادب کے ستارہ گر' کو ادبی حلقوں میں قدر کی نگاہ سے دیکھا جائے گا اور اسے وہ مقام ملے گا جس کی یہ کتاب مستحق ہے۔

بصیرت تنقید

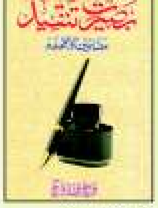

مصنف: ذبیح اللہ ذبیح

صفحات: 160، قیمت: 300 روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: Printology Inc.، کوچہ چیلان، نئی دہلی

مبصر: شاداب اظہر، ریسرچ اسکالر دہلی یونیورسٹی دہلی

ذبیح اللہ ذبیح کے لکھنے کا سفر ابھی بہت طویل نہیں ہے لیکن مسلسل لکھ رہے ہیں۔ ان کی تحریریں مختلف اخبارات ورسائل کی زینت بنتی رہی ہیں۔ علاوہ ازیں وہ افسانے بھی خوب لکھتے ہیں انکے کئی افسانے منظر عام پر آچکے ہیں۔

جس طریقے سے ایک مصور کئی رنگوں کی مدد سے خالی کینوس پر ایک خوبصورت تصویر بنا دیتا ہے ٹھیک اسی طرح ذبیح اللہ ذبیح نے مختلف موضوعات پر مضامین قلم بند کیے جو کتابی

شکل میں 'بصیرت تنقید' کے نام سے 2021 میں منظر عام پر آئے اور ادبی حلقوں میں قبول عام کی سند پائی۔ ذبیح اللہ ذبیح کا مطالعہ وسیع ہے۔ ان کی نظر نظم و نثر کے علاوہ ہندوستان میں پیدا ہونے والے مسائل پر بھی رہتی ہے۔ وہ ترجمہ نگاری کے فن سے بھی واقف ہیں۔

زیر تبصرہ 'بصیرت تنقید' میں کل چودہ مضامین، رضا لائبریری کی علمی و ادبی خدمات، مباحث نظریاتی ترجمہ، سرسید بحیثیت وطن پرست، انتظار حسین کے افسانوں میں مختلف اساطیر، حفیظ نعمانی بجھے دیوں کی قطار کے آئینے میں، مشرف عالم ذوقی ایک بے باک افسانہ نگار، ناول چمراسر کا تجزیاتی مطالعہ، فقط بیان تک کا تجزیاتی و تنقیدی مطالعہ، ڈاکٹر نعیم انیس اور یادوں کے جگنو، صادق نواب سحر اور باوجود کی غزلیں، سیمنتی ایڈیشن کا تفصیلی جائزہ، علیم اسماعیل رنجش کے آئینے میں، دنیا کی بے ثباتی اور عرفان خان وغیرہ شامل ہیں۔ پیش لفظ خود مصنف نے تحریر کیا ہے۔ 'رضا لائبریری کی علمی و ادبی خدمات' کے حوالے سے ایک محققانہ مضمون شامل کتاب ہے۔ جس میں لائبریری کے تاریخی احوال کا بیان ملتا ہے۔ جس کی بنیاد نواب فیض اللہ خان نے 1774 میں رکھی۔ اس لائبریری میں مختلف زبانوں پر کتابیں موجود ہیں۔ اس لائبریری کی عظمت اس وقت اور بھی بڑھ جاتی ہے جب اس کا اعتراف علامہ شبلی جیسا تاریخ نویس ان الفاظ میں کرتا ہے:

''میں نے روم و مصر کے کتب خانے بھی دیکھے ہیں۔ لیکن کسی کتب خانہ کو مجموعی حیثیت سے میں نے اس سے افضل ترین نہیں دیکھا''

رام پور کی رضا لائبریری اس وجہ سے بھی اپنا امتیاز رکھتی ہے کہ اس کے صحن میں آئے دن ادبی پروگرام یا انعامی نشست قائم کی جاتی ہے جس کی وجہ سے اس کا دائرہ وسیع سے وسیع تر ہوتا جا رہا ہے۔

'بصیرت تنقید' اس لیے بھی منفرد ہے کہ اس میں ادیبوں پر چاہے وہ نثر کے میدان کے روح رواں ہوں یا اساطیری افسانوں کے بے تاج بادشاہ یا شاعری کی دنیا میں نام پیدا کرنے والی خواتین، یا پھر صحافت کے میدان میں اپنی چھاپ چھوڑنے والا انسان، یا پھر اپنی منفرد راہ نکالنے والا بیباک افسانہ نگار سبھی پر مضامین شامل ہیں۔

سرسید کی شخصیت سے کون ناواقف ہے شامل کتاب مضمون 'سرسید بحیثیت وطن پرست' میں اہم نکات کی طرف اشارہ کیا گیا ہے نیز سرسید کو وطن پرست کے طور پر دکھایا گیا ہے۔ سرسید نے 'تہذیب الاخلاق' کا اجراء اسی مقصد سے کیا تھا کہ عزیزان وطن کی ذہنی نشو و نما اور اصلاح کی جاسکے تاکہ وہ مغربی تہذیب کو اور اس کی تعلیم کو سمجھ سکیں اور پڑھ سکیں۔ سرسید کے خوابوں کی تعبیر آج علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے روپ میں دیکھی جاسکتی ہے۔

کتاب میں شامل سبھی مضامین سے میں نے کسب فیض کیا مگر جس مضمون نے میری آنکھوں کو خیرہ کر دیا وہ 'انتظار حسین کے افسانوں میں مختلف اساطیر' ہے۔ یہ مضمون اپنے آپ میں ایک پوری کتاب کی حیثیت رکھتا ہے۔ ذبیح اللہ ذبیح کا یہ بڑا کارنامہ ہے کہ انھوں نے انتظار حسین کے افسانوں کو دلچسپی سے نہ صرف پڑھا بلکہ انھیں سمجھا بھی۔ جہاں انتظار حسین کے افسانوں میں ہجرت کا ذکر ہے تو وہیں اسلامی اساطیر، ہندو دیو مالائی عناصر، روم و یونان کے متھ، رسم و رواج اور توہمات وغیرہ کا بھی نقش ان کی تحریر میں دیکھنے پڑھنے کو ملتا ہے۔ بلاشبہ ذبیح اللہ ذبیح کا یہ کمال ہے کہ انھوں نے ان ادیبوں پر قلم اٹھایا ہے جو ادبی حلقوں میں افسانہ نگاری یا ناول نگاری یا غیر افسانوی نثر یا شاعری کے میدان سے تعلق رکھتے ہیں۔ نئے لکھنے پڑھنے والوں کو یہ کتاب بہت فائدہ پہنچائے گی اور ان کے ذہن کے دریچوں کو وسیع کرے گی۔

'بصیرت تنقید' کی طباعت بھی عمدہ اور خوب صورت ہے۔

شاعری

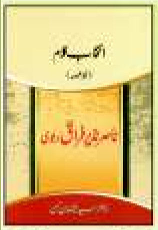

انتخاب کلام (غیر مطبوعہ) ناصر نذیر فراق دہلوی

مرتب: ڈاکٹر سیّد فیضان حسن

صفحات: 280، قیمت: 173

ناشر: مرتب، 2206، نیا محلہ، گلی قاسم جان، بلّی ماران، دہلی 6

مبصر: ڈاکٹر احمد امتیاز، شعبۂ اردو، دہلی یونیورسٹی، دہلی

مذکورہ کتاب عہدِ داغ اور عہدِ اقبال سے وابستہ ایک ایسے اہم شاعر پر ہے جن کا تعلق براہِ راست اردو کے بڑے شاعر خواجہ میر درد سے ہے۔ ناصر نذیر فراق دہلوی کا شمار اُنیسویں صدی نصف آخر کے شعرا میں ہوتا ہے۔ وہ ایک کہنہ مشق اور قادر الکلام شاعر تھے جنھوں نے اردو کی مختلف شعری اصناف میں طبع آزمائی کی۔ بنیادی طور پر دیکھا جائے تو ناصر نذیر فراق دہلوی غزل کے شاعر تھے اور اپنے حقیقی نانا خواجہ میر درد کی نسبت سے تصوف کے موضوعات کو غزل میں برتنے پر قادر تھے۔ اردو غزل کے علاوہ انھوں نے مثنویات، مراثی، رباعی، واسوخت، سلام، نظموں، قطعات، ساقی نامہ وغیرہ میں بھی طبع آزمائی کی۔ ناصر نذیر فراق نے فارسی زبان میں بھی غزلیں کہی ہیں۔

ناصر نذیر فراق کے عہد میں غزلیہ شاعری کا خمیر دو متضاد فکر سے اُٹھا تھا۔ شعرا کا کہیں گروہ وہ تھا جن پر داغ اور امیر کا گہرا اثر تھا اور وہ بہت حد تک قدیم غزلیہ روایت کے پاسبان تھے۔ دوسرا گروہ مغرب کی جدید فکر سے متاثر تھا جس کے یہاں روایت سے یکسر انحراف تھا اور نئی مغربی فکر کو غزل کے قالب میں ڈھالنے کا رجحان حاوی تھا۔ اس عہد میں ہمیں ایسے شعرا بھی مل جاتے ہیں جن کے یہاں جدید و قدیم دونوں رنگوں کی آمیزش ملتی ہے۔ ایسے شعرا نہ تو قدیم روایت سے قریب نظر آتے ہیں اور نہ ہی انھیں ہم پوری طرح جدید کہہ سکتے ہیں۔ ایسے شعرا کے یہاں تخلیقی لمس ایک نئے ذائقے سے دوچار کرتا ہے۔ ناصر نذیر فراق دہلوی کی غزلوں میں ہمیں یہی ذائقہ دیکھنے کو ملتا ہے۔ اگر اردو کی غزلیہ روایت میں ناصر نذیر فراق کے مقام و مرتبہ کی بات کی جائے تو بلاشبہ ہم کہہ سکتے ہیں کہ ناصر نذیر فراق نے غزل کے متصوفانہ تیور کو برقرار رکھا اور رومان و نشاط کی کیفیت کو اس تیور سے ہم آہنگ کیا۔ زندگی کے تئیں ان کا رویہ بے حد سنجیدہ اور طمانیت سے بھرا ہوا ہے۔ ان کی غزلیہ شاعری کا ایک خاص وصف یہ بھی ہے کہ انھوں نے دہلوی رنگ کو ارضی سطح پر برتنے اور فنِ جمال سے سیراب کرنے کی کوشش کی ہے۔ ان کی خوش نظری میں بے ثباتی عالم کا درد بھی جھلکتا ہے۔ خاص بات یہ بھی ہے کہ انھوں نے خیالات کے وفور کو عبرت کا منظر بننے سے باز رکھا ہے۔ انھوں نے اپنی غزلیہ شاعری میں روایت کے احترام کو قائم رکھتے ہوئے تزکیۂ جذبات اور روحانی ترفع کو نمایاں کیا اور اردو شاعری کو ایک نیا لب و لہجہ دیا۔

اُنیسویں صدی نصف آخر کا زمانہ نہایت پُر آشوب اور ہنگاموں سے بھرا ہوا تھا۔ ماحول کی ناسازگاری اور ناآسودہ حالی سے معرفت کی جانب قلبی صعود عین فطری تھا۔ اس عہد کے بیش تر شعرا کے یہاں یہی رجحان دیکھنے کو ملتا ہے۔ فراق دہلوی نے بھی اپنے عہد کی فکر اور تہذیبی میراث کو اپنی شاعری میں پیش کرنے کی کوشش کی۔ وہ شعور جس کے اظہار پر وہ قادر تھے اسے اپنی زبان میں خوبصورتی سے برتا، کہیں پرانی روایتوں سے منسلک رہے اور کہیں زبان کو نئی تازگی سے ہمکنار کیا۔ ان کی لفظیات اور تراکیب، ان کی تشبیہات و استعارات ہمیں بتاتے ہیں کہ ان کی دنیا اُس کائناتی اُصول کی پابند ہے جن کی طرف قرآن و احادیث نے اشارے کیے ہیں۔ اگر ہم فراق دہلوی کے

یہاں تصوف کے موضوعات کا ذکر کریں تو انھوں نے اس کے مختلف موضوعات پر اشعار کہے ہیں۔ خصوصاً جیسا کہ اس کتاب کے مرتب نے بھی اشارہ کیا ہے، فراق دہلوی کے یہاں دو موضوعات بقیہ دیگر موضوعات سے زیادہ اہمیت رکھتے ہیں۔ ایک 'مضمونِ فنا' اور دوسرا 'بے ثباتیِ دنیا'— صوفیائے کرام کے یہاں 'فنا' سے مراد ہستی کا نیست و نابود ہو جانا نہیں ہے بلکہ ایک مرحلے سے دوسرے مرحلے میں منتقل ہو جانا ہے۔ اقبال کا ایک خط جو مولوی ظفر احمد صدیقی کے نام لکھا گیا تھا اس میں 'فنا' کی وضاحت کرتے ہوئے لکھا ہے کہ "... جب احکامِ الٰہی، خودی میں اس حد تک سرایت کر جائیں کہ خودی کے پرائیویٹ امیال و عواطف باقی نہ رہیں اور صرف رضائے الٰہی اس کا مقصود ہو جائے تو زندگی کی اس کیفیت کو بعض اکابر صوفیائے اسلام نے فنا کہا ہے۔" (اقبال نامہ— شیخ عطاء اللہ، ص 193) 'بے ثباتیِ دنیا' کے لیے تو قرآن میں ارشاد بھی ہوا ہے: "کُلُّ نَفْسٍ ذَائِقَةُ الْمَوْتُ" اور یہاں میر کا وہ مشہور شعر یاد آتا ہے۔

کہا میں نے گل کا ہے کتنا ثبات کلی نے یہ سن کر تبسم کیا

مرتب موصوف نے فراق دہلوی کے یہاں آنے والے مذکورہ دونوں موضوعات پر اپنے مقدمہ میں بحث کی ہے۔

ناصر نذیر فراق دہلوی کے یہاں جو فنی خوبیاں پائی جاتی ہیں اُن میں سے 'سہلِ ممتنع' بھی ایک ہے۔ 'سہلِ ممتنع' کے بارے میں رشید احمد صدیقی کا خیال ہے کہ جب کوئی شعر حسنِ معنی، حسنِ خیال اور حسنِ بیان کے اعتبار سے ضرب المثل بن جائے یا اس میں بن جانے کی صلاحیت ہو تو وہ 'سہلِ ممتنع' ہے۔ فراق دہلوی کے یہاں ایسے اشعار کی خاصی تعداد ہے، جنھیں ہم اس ذیل میں شمار کر سکتے ہیں۔ ڈاکٹر سیّد فیضان حسن نے ایسے کئی اشعار کی طرف اشارے کیے ہیں۔ مثلاً

دن گزرتا ہے ہے رات جاتی ہے رائیگاں یوں حیات جاتی ہے

جلد کر لے جو تجھ کو کرنا ہے زندگانی کا اعتبار نہیں

حرفِ رخصت سنا دیا آخر آپ نے دل دُکھا دیا آخر

مرتب موصوف نے ناصر نذیر فراق دہلوی کی لکھی گئی مثنویات پر بھی قلم اُٹھایا ہے اور فراق دہلوی کی اس تجدید کی طرف اشارہ کیا ہے جو اُن کا اختصاص ہے۔ فراق دہلوی نے اپنے مراثی میں واقعاتِ کربلا کو پیش کیا تاہم انھوں نے اس واقعہ کو مثنوی کا جامہ بھی پہنایا ہے۔ اس انتخاب میں مثنوی 'حسینؓ بیتی' کے کچھ حصے شامل ہیں۔ یہ مثنوی بحرِ متقارب مثمن محذوف (فعولن فعولن فعولن فعل) میں ہے۔

اُنیسویں صدی نصف آخر کے بہت سے شعرا آج بھی گمنامی میں ہیں یا بہت سے ایسے شعرا ہیں جن پر خاطر خواہ توجہ ہی نہیں دی گئی ہے۔ ڈاکٹر سیّد فیضان حسن نے بالخصوص ایسے شعرا کو اپنی تلاش و تحقیق سے دریافت کیا ہے اور ان کے مقام و مرتبہ کا تعین کیا ہے۔ ناصر نذیر فراق دہلوی پر ان کی اس غیر مطبوعہ کلام کی تدوین سے قبل بھی ایک کتاب منظرِ عام پر آ چکی ہے۔ اسی طرح آغا شاعر قزلباش دہلوی، خمکدۂ خیام، سیماب امروہوی شخصیت اور فن بھی منظرِ عام پر آ چکی ہیں۔ ڈاکٹر سیّد فیضان حسن بے حد عرق ریزی سے تحقیق کرنے والے محقق ہیں۔ نئی دریافت کے لیے آپ ہمیشہ کوشاں رہتے ہیں۔ حال ہی میں آپ کا تحقیقی مقالہ غمگین دہلوی پر شائع ہوا ہے۔ میں سمجھتا ہوں کہ اس قسم کی تحقیق سے نہ صرف ادب کے ذخیرے میں اضافہ ہوتا ہے بلکہ ادب کی تاریخی و تحقیقی روایت بھی مستحکم ہوتی ہے۔

مذکورہ کتاب میں مرتب نے تحقیق کے معیار کا خیال رکھا ہے اور اپنے مقدمہ میں خواجہ میر درد اور ناصر نذیر فراق دہلوی کے متصوفانہ خیالات کا موازنہ کیا ہے اور دونوں شعرا کے امتیازات تفصیل سے بیان کیے ہیں۔ ڈاکٹر سیّد فیضان حسن نے جس عرق ریزی سے اس تحقیقی مرحلے کو طے کیا ہے وہ قابلِ لحاظ ہے۔ ان کی اس دریافت اور تحقیق و تنقید سے نہ صرف ادب میں نئے گوشے کھلیں گے بلکہ اُردو ادب کی تاریخ میں یہ کتاب ایک اضافہ کا سبب بھی بنے گی۔

مضامین

عالمی حرارت اور موجودہ آب وہوا میں تبدیلی

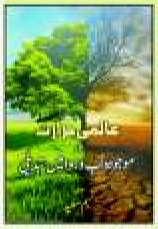

مصنف: نسیم سعید

صفحات: 108، قیمت: 80/روپے، سنہ اشاعت: 2021

ناشر: الفاظ پبلی کیشن کامٹی

مبصر: پرویز احمد یعقوبی، پیلی حویلی چوک کامٹی ضلع ناگپور 441001

علاقہ وِدربھ کے چھوٹے سے شہر اور وسیع و عریض ادبی سرزمین کامٹی کے ادبا و شعرا اور مصنفین نے ہر دور میں اپنی نمائندگی درج کروائی اور اپنے فن کا مظاہرہ کیا ہے۔ گذشتہ چند برسوں میں ہونہار نوجوانوں کا رجحان ادب و تصنیف کی جانب بڑھا ہے۔ وہ مختلف موضوعات پر مضمون رقم کر رہے ہیں اور ملک کے معیاری اخبار و رسائل کی زینت بھی بن رہے ہیں۔ یہ اس بات کا ثبوت ہے کہ نئے لکھنے والے موضوعات کا سنجیدگی سے مطالعہ بھی کر رہے ہیں اور ان پر غور و فکر بھی۔ ان جیالوں میں نسیم سعید صاحب کا بھی شمار ہوتا ہے۔

'عالمی حرارت اور موجودہ آب وہوا میں تبدیلی' نسیم سعید کے سائنسی مضامین کا مجموعہ ہے، جس میں چند اہم موضوعات و مسائل پر غور و خوض کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ جیسے:

- عالمی حرارت اور اس کے اس دنیا پر ہونے والے اثرات
- دنیا کی تباہی و بربادی کی وجوہات اور انسان کی مفاد پرستی اور خود غرضی
- موسموں کا بدلتا مزاج
- گلیشیر کا تیزی سے پگھلنا
- سردیوں اور گرمیوں میں درجہ حرارت کا تفاوت
- نئی نئی بیماریوں کی پیدائش
- انسانی قوت مدافعت اور عمر میں کمی واقع ہونا
- مختلف آلودگیوں میں اضافہ اور اس کے اثرات
- تاب کار عناصر اور اس کے انشقاق کے اثرات
- فصلوں کی بربادی۔ وغیرہم

عالمی حرارت (گلوبل وارمنگ) کیا ہے؟

عالمی حرارت کو موسمیاتی تبدیلی بھی کہا جاتا ہے۔ جب ہم کوئلہ، تیل یا قدرتی گیس جلاتے ہیں تو کاربن ڈائی آکسائیڈ گیس پیدا ہوتی ہے۔ یہ کاربن ڈائی آکسائڈ گیس جب پودوں اور سمندر میں جذب ہونے سے بچ جاتی ہے تو فضائی آلودگی کا باعث بنتی ہے۔ یہی عالمی حرارت کہلاتی ہے۔ یہ ایک قدرتی عمل ہے جس سے سطحِ زمین پر حرارت پیدا ہوتی ہے۔

اس کرۂ ارض میں قدرتی وسائل کروڑوں برسوں سے مخفی حالت میں پڑے ہوئے تھے۔ پچھلی چند صدیوں یا دہائیوں میں ان وسائل کو نکالنے کے بعد کثرت سے استعمال کیا جاتا رہا ہے۔ صنعتی انقلاب کے ساتھ ہی ان وسائل کا بے دریغ استعمال آلودگی کا باعث بن رہا ہے۔

آکسیجن تمام جانداروں کے لیے ناگزیر ہے۔ جنگلات کا صفایا اس کمی کا باعث بن رہا ہے۔ آکسیجن کے تین ایٹموں کے ملنے سے اوزون گیس بنتی ہے۔ یہ گیس ہماری بیرونی فضا میں زمین سے 12 کلومیٹر سے 48 کلومیٹر تک اکٹھی ہو رہی ہے۔ اوزون کا یہ ہالہ ہمارے سیارے کو سورج سے آنے والی مضر شعاعوں سے بچاتا ہے۔ فضا میں آلودگی کی وجہ سے اوزون لہر میں دراڑیں پڑ رہی ہیں۔

مختلف جنگیں بھی عالمی حرارت میں جوق در جوق اضافے کا باعث بن رہی ہیں۔ دوسری جنگ عظیم ناگاساکی و ہیروشیما کی تباہی پر ختم ہوئی۔ امریکہ نے ایٹمی اسلحہ کے استعمال سے ایٹمی تابکاری سے آلودگی کو اس حد تک بڑھایا کہ برسوں بعد بھی ان شہروں میں اپاہج بچے پیدا ہوتے رہے بلکہ آج بھی ہو رہے ہیں۔ اس وقت پوری دنیا میں ایٹمی اسلحہ اس قدر اکٹھا ہو چکا ہے کہ اس سے اس دنیا کو کئی بار تباہ کیا جا سکتا ہے۔ اور تقریباً دنیا کے اکثر ایٹمی پلانٹ غیر محفوظ ہیں۔

عالمی حرارت سے پوری دنیا کے درجہ حرارت میں دھیرے دھیرے اضافہ ہوتا ہے، جس کے سبب موسمیاتی تبدیلیاں واقع ہوں گی مثلاً جہاں بارش ہو رہی ہے وہاں خشکی آسکتی ہے اور جہاں خشکی ہے وہاں بارشیں ہونا شروع ہو سکتی ہیں۔ اسی طرح کچھ علاقوں میں بالکل قحط طاری ہو سکتا ہے اور کچھ علاقے سیلاب کی لپیٹ میں آسکتے ہیں۔ ماحولیات میں گرمی کا اضافہ ہو رہا ہے اس لیے ہر سال پوری دنیا کے درجہ حرارت میں بھی اضافہ ہو رہا ہے۔ عالمی حرارت سے گلیشیر پگھل کر پانی میں تبدیل ہو جاتے ہیں جن کی وجہ سے سمندر کی سطح میں اضافہ ہوتا ہے۔

آب و ہوا کی تبدیلی کے سبب دنیا بھر کے جاندار، حشرات الارض اپنا مستقل مسکن چھوڑ کر کہیں دوسرے موزوں مقام پر منتقل ہونے کے لیے مجبور ہو جاتے ہیں۔ یہ ماحولیاتی نظام کے بحران کی شروعات ہے۔ ہمارے ملک میں سیلاب، طوفان اور زمین کے کھسکنے جیسی قدرتی آفات کی وجہ بھی آب و ہوا کی تبدیلی ہے۔

پیڑ پودے انسان کی بنائی ہوئی کاربن ڈائی آکسائیڈ جذب کر کے پرورش پاتے ہیں اور دنیا کو گرم ہونے سے بچاتے ہیں۔ ہمیں ان توانائیوں کا استعمال کم کرنا چاہیے جو گلوبل وارمنگ میں اضافہ کر سکتی ہیں، جو توانائی جتنی بار دوبارہ استعمال کی جا سکتی ہے اسے دوبارہ استعمال کیا جائے۔ ہیٹر اور ایئر کنڈیشن کا استعمال کم کیا جائے۔ حرارتی بلب کو انرجی سیور سے بدلا جائے۔ ماحولیاتی تحقیق کے مطابق جن گھروں کے اطراف پیڑ پودے ہوتے ہیں وہاں تناؤ اور ذہنی امراض سے متاثر ہونے کا خطرہ دوسروں کی بہ نسبت کم ہوتا ہے۔ عرصہ حیات میں اضافہ ہوتا ہے۔ ہر فرد کم از کم سات پودے یا درخت ضرور لگائے تاکہ گلوبل وارمنگ کم کرنے میں ہماری مدد شامل ہو کیونکہ یہ زمین ہماری ہے اور یہ زندگی بھی ہماری ہے۔ ہم ان دونوں کی حفاظت کے ضامن بنیں۔ معاشرے میں اگر اس بارے میں آگاہی پیدا کریں تو ہم گلوبل وارمنگ کو کم کرنے میں اپنا انسانی کردار ادا کر سکتے ہیں۔ دوسروں کو آگاہ کرنا اور ان کے اقدامات کی حوصلہ افزائی کرنا نہایت ضروری ہے۔

رسائل و جرائد

ماھنامہ عالمی زبان

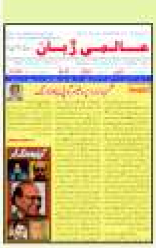

مدیر: آفاق سیفی، ترتیب: ڈاکٹر سیفی سرونجی

جلد: 4، شمارہ: 10

قیمت: 20 روپے، اکتوبر 2020

ناشر: انتساب پبلی کیشنز، سرونج۔ 822464 (ایم پی)

مبصر: شارق عدیل، مارہرہ، ضلع ایٹہ 207401

'عالمی زبان'، اکتوبر 2020 کا شمارہ اردو زبان کی قابل قدر شخصیت پروفیسر گوپی چند نارنگ کے نمبر کی صورت میں ترتیب دیا گیا ہے۔ اس سے قبل بھی بہت سے مدیران نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کے فکروفن کے ساتھ ان کی شخصیت کو بھاری بھرکم نمبروں میں سمیٹنے کی کوشش متعدد بار کی، مگر ناکام رہے۔ چونکہ انھوں نے اردو زبان کے حوالے سے ایسے علمی کرشمات دکھائے ہیں کہ انھیں کسی بھی ایک نمبر میں پوری طرح سمیٹنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔

مگر یہ دیکھ کر حیرت ہو رہی ہے کہ آفاق سیفی، استوتی اگروال اور ڈاکٹر سیفی سرونجی نے کل 32 صفحات میں پروفیسر گوپی چند نارنگ پر اس نمبر کو اس خوبصورتی سے ترتیب دیا ہے کہ اسے یادگار بنا دیا ہے۔ اداریہ ڈاکٹر سیفی سرونجی نے 'محسنِ اردو: پروفیسر گوپی چند نارنگ' کے عنوان سے تحریر کیا ہے اور بہت ہی سلجھے ہوئے انداز میں گفتگو کی ہے اور یہ سمجھانے کی کوشش کی ہے کہ انھوں نے اردو زبان کی ترقی کے لیے جو کوششیں کی ہیں انھیں آنے والی نسلیں کبھی نظر انداز نہیں کر سکیں گی۔

ڈاکٹر سیفی سرونجی کے اس اعتراف میں حقیقت کی روشنی ست رنگی دھنک کی طرح جھلملاتی ہے، ورنہ جب بھی کوئی کسی بڑی شخصیت پر لکھنے کا ارادہ کرتا ہے تو وہ اس کے بارے میں دیر تک سوچتا ہے اور جب وہ اپنی سوچوں سے مطمئن ہو جاتا ہے تب کہیں جا کر قلم کو زحمت دیتا ہے اور کسی نہ کسی مقام پر شخصیت پرستی کے احساسات کا شکار ہو جاتا ہے۔

مگر ڈاکٹر سیفی سرونجی نے اداریہ کو شخصیت پرستی کے الزام سے بھی بچالیا ہے اور پروفیسر گوپی چند نارنگ کی قابلِ ذکر انسان پسند خوبیوں کو بھی بیان کر دیا ہے۔ اس اداریہ کی یہی سب سے بڑی خوبی ہے۔ اس کے بعد کے صفحے پر 'مشاہیر کی نظر میں پروفیسر گوپی چند نارنگ' کے عنوان سے مشفق خواجہ، محمد ایوب واقف، پروفیسر شہزاد انجم، نظام صدیقی، شمیم طارق، پروفیسر خالد محمود کی آرا کو مع تصاویر نمایاں کیا گیا ہے۔ ان ادبی شخصیات کی آرا میں پروفیسر گوپی چند نارنگ کی شخصیت کے رنگ اور ادبی رنگ اس طرح آپس میں گڈمڈ ہو کر ایک مکمل رنگ بن گئے ہیں جنھیں ہزارہا کوششوں کے بعد بھی ایک دوسرے سے الگ نہیں کیا جا سکتا ہے۔

مشفق خواجہ کے خیال میں، ''ڈاکٹر گوپی چند نارنگ کے ظاہری اور باطنی کمالات کا احاطہ کرنا بہت مشکل ہے۔ وہ اعلیٰ درجے کے نقاد اور ماہر لسانیات ہیں۔ ان کی نقادی کا لوہا فضیل جعفری جیسے تنگ مزاج نے بھی مانا ہے جو اپنے علاوہ کسی اور کو نقاد ماننے سے پہلے سو مرتبہ سوچتے ہیں۔'' مشفق خواجہ ہمیشہ اپنی بات اس قدر خوش کن انداز میں کہتے تھے کہ لہجے کی چبھن میں بھی لطف آ جاتا ہے، مگر محمد ایوب واقف، چیختے ہوئے لہجے میں کہہ رہے ہیں ''ہم یہ بھی صاف صاف کہہ دینا چاہتے ہیں کہ جناب گوپی چند نارنگ، اپنی زندگی کے ہر دور میں اردو زبان، اس کے رسم الخط اور اس کے شاندار ادب کے ترجمان اور نگہبان رہے ہیں''۔ محمد ایوب واقف نے جو دوٹوک انداز میں اردو زبان سے نارنگ صاحب کی محبتوں کا اعتراف کیا ہے اس میں رتی برابر بھی علت کی آمیزش نہیں ہے۔

بقیہ لوگوں نے بھی پروفیسر گوپی چند نارنگ کی ادبی خصوصیات کو پوری ایمانداری سے سراہا ہے۔ مضامین کے سلسلے میں ہندوپاک کے متعدد معروف نام شامل ہیں۔ ذوالفقار احسن نے اپنے مضمون 'نارنگ کے ایک مضمون: نثری نظم کی شناخت' کے تعلق سے جو اظہار خیال کیا ہے ''اس کے کسی بھی پہلو سے اس دور میں انکار نہیں کیا جا سکتا ہے، چوں کہ یہ مضمون نثری نظم کے تخلیقی وجود کی حمایت دلائل کے ساتھ کرتا ہے۔ اس مضمون میں نثری نظم کے حوالے سے کچھ ایسی باتوں کو زیر بحث لایا گیا ہے کہ ان کا اعتراف گروہی احساس کے قدرآور ناقدین بھی کرنے پر مجبور ہیں۔''

پروفیسر عزیز اللہ شیرانی نے اپنے مضمون 'پروفیسر گوپی چند نارنگ اور اردو نصاب تعلیم' میں اپنے موقف کو بہت ہی بھرپور انداز میں ظاہر کیا ہے۔ اس کا مطالعہ نئے پرانے تمام لوگوں کے لیے ضروری ہے۔ ان دونوں مضامین کے بعد کے مضامین لکھنے والوں کی فہرست میں جو نام ہیں ان سے بھی اردو والے بے خبر نہیں ہیں۔ یعنی حافظ رضوان، خالد ملک، ایم خالد فیاض، ڈاکٹر ریحان احمد قادری، ڈاکٹر صالحہ صدیقی، توصیف احمد ڈار،

اسماء بدر، ڈاکٹر ظفر سرونجی ان تمام ادبی شخصیات نے پروفیسر گوپی چند نارنگ کی علمی خوبیوں کا ذکر اس طرح کیا ہے کہ اعتراف کے بہت سے رنگ خود بخود ابھر آتے ہیں۔

'عالمی زبان' کی نائب مدیرہ استوتی اگروال نے پروفیسر نارنگ سے انٹرویو کے آئینے کے نام میں جو ہلکی پھلکی گفتگو کرتے ہوئے ان کی سراہنا کی ہے یہ بھی کوئی معمولی بات نہیں ہے اس لیے ان کے حوصلے کی تعریف ضروری ہے ورنہ ان کی عمر کے لوگوں میں تو کسی بڑی شخصیت کے تعلق سے منہ کھولنے کا حوصلہ بھی نہیں ہوتا ہے اور یہاں تو اردو زبان کی عالمی تاریخی شخصیت پروفیسر گوپی چند نارنگ کا معاملہ ہے جن سے سوال کرنے میں اردو زبان کو باقاعدہ جاننے والے بھی ہچکچاتے ہیں۔

اس کے علاوہ اسد رضا، ف۔س۔اعجاز، پروفیسر مناظر عاشق ہرگانوی، ابوذر ہاشمی، کوثر صدیقی، حقانی القاسمی، شافع قدوائی، کیول دھیر کی مختصر آرا کو فروزاں کیا گیا ہے جو دیگر حضرات کی طرح ہی خلوص ومحبت کے ساتھ پروفیسر گوپی چند نارنگ کی عالمانہ تحریروں کی صداقت کا اعتراف کرتی ہیں اور ان کے ساتھ ہی پروفیسر گوپی چند نارنگ کی کچھ اہم اور ضروری کتابوں کے عکس دیے گئے ہیں تاکہ مطالعے کو اہمیت دینے والے حضرات ان کو حاصل کر کے پڑھ سکیں۔ کچھ نارنگ صاحب کے خاندان اور دوستوں کی تصاویر بھی دی گئی ہیں جو خوب صورت لمحوں کی یادیں تازہ کرتی ہیں۔ اس لیے پروفیسر گوپی چند نارنگ کے حوالے سے 'عالمی زبان' کا یہ شمارہ بھی لوگوں کی یادوں میں ہمیشہ محفوظ رہنے والا ہے۔ ادارے کے تمام لوگ مبارکباد کے مستحق ہیں۔

سہ ماہی 'عالمی فلک'

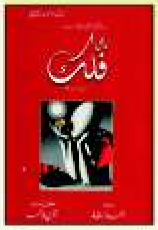

مدیر: احمد نثار، معاون مدیر: آفرین فاطمہ
جلد: 1، شمارہ: 3، اپریل تا جون 2021
صفحات: 320، قیمت: 300 روپے
ناشر: عالمی فلک، کڈس کامپلیکس، محمد علی روڈ
سٹی کالونی، پوسٹ B پالی ٹیکنک، ضلع دھنباد، جھارکھنڈ 828130
مبصر: حقانی القاسمی، نئی دہلی

جنگلاتی زمین 'جھارکھنڈ' میں بھی علم وادب کی سرسبز اور شاداب فضا ہے۔ وہاں کے کئی بڑے شہروں مثلاً جمشید پور، رانچی، دھنباد، ہزاری باغ، گریڈیہہ وغیرہ میں ادیبوں اور شاعروں کی ایک بڑی تعداد ہے جن میں سے بعض کو قومی سطح کی شناخت بھی حاصل ہے۔ وہاں سے ماضی میں کئی اہم ادبی رسالے شائع ہوتے رہے ہیں اور کچھ رسالے ہنوز نکل رہے ہیں۔ 'عالمی فلک' بھی اسی تسلسل کی ایک کڑی ہے جس کے مدیر احمد نثار اچھے شاعر اور نثر نگار بھی ہیں۔ اس مجلّے کے تین شمارے اب تک شائع ہو چکے ہیں اور ادبی دنیا میں اس کو خاطر خواہ پذیرائی بھی حاصل ہوئی ہے۔

'عالمی فلک' کتابی سلسلہ 3 بھی مشمولات اور محتویات کے اعتبار سے اہم ہے کہ اس میں کچھ ایسی تحریریں بھی ہیں جو ذہن کے بند دریچوں کو کھولتی ہیں اور ادبی معاشرے سے نئے سوالات بھی قائم کرتی ہیں۔ خاص طور پر مدیر مجلّہ نے اپنے اداریے میں جو سوالات قائم کیے ہیں ان پر ارباب علم ودانش کو سنجیدگی سے غور کرنے کی ضرورت ہے۔ انھوں نے لکھا ہے کہ ''اس باذوق قارئین کے لیے آج یقیناً ایک سوال ہے کہ کوئی رسالہ یا کتاب کیوں پڑھی جائے، محض وقت گزاری کے لیے یا اپنے ادبی وعلمی ذوق کی تسکین کے لیے۔ ظاہر ہے کہ ہر باشعور قاری کسی تحریر وتخلیق کے مطالعے کے لیے وقت صرف کرتے ہوئے اس کی اہمیت ومعنویت کو ذہن میں رکھنا ضروری سمجھے گا کیونکہ غیر معیاری تحریروں کے مطالعے میں وقت صرف کرنا آج کے مصروف تر اور ذہنی طور پر پریشان کن حالات میں تضییع اوقات کے سوا کیا ہوسکتا ہے؟'' یہ سوال اہم ہے۔ اس پر مذاکرہ و مباحثہ ہوسکتا ہے۔ آگے ایک اور اہم نکتے کی طرف مدیر مجلّہ نے اشارہ کیا ہے کہ ''یہاں ہم اس حقیقت کو بھی تسلیم کرنے میں حق بہ جانب ہیں کہ معیاری تخلیق کا حصول بھی ہمارے لیے ان دنوں ایک مسئلہ ہے۔ ہمیں موصول ہونے والی تحریروں میں کتنی ہی ایسی ہوتی ہیں جو اعلیٰ معیار کی حامل نہیں ہوتیں خصوصاً تنقیدی مضامین اور شعری تخلیقات میں معیار کا یہ مسئلہ زیادہ ہی پیچیدہ نظر آتا ہے۔'' یہ نکتہ بھی قابل غور ہے اور اس پر بحثیں ہوتی رہی ہیں۔ جہاں تک ادبی تخلیقات کے معیار کا سوال ہے تو آج کے عہد میں معیار سے زیادہ بڑا مسئلہ زبان وادب کی بقا کا ہے۔ صرف معیار پر مرکوز یا مرتکز رہا جائے تو ماہنامہ اور سہ ماہی رسائل بند کر کے سالنامے شائع کرنا پڑیں گے۔ ماضی میں جوش ملیح آبادی کے مجلّہ 'کلیم' کے ساتھ بھی کچھ ایسا ہی ہوا کہ انھیں ایک دو شمارے کے بعد رسالہ بند کرنا پڑا تھا۔ اداریے کے تسلسل میں ہی ڈاکٹر سرور حسین کی تحریر 'معاصر ادب اور تقاضے' اور یعقوب یاور کی 'ادب کی صنفی شناخت کا مسئلہ' پڑھی جائے تو بہت سے اور اہم سوالات سامنے آئیں گے۔ یعقوب یاور نے بڑی اہم بات لکھی ہے کہ ''ساری دنیا میں یکساں طور پر انسان نے سب سے پہلے شعر کو نثر کے مقابلے میں زیادہ اہمیت دی۔ نثر کو کافی بعد میں پہچانا اور تسلیم کیا گیا۔ اور شاید یہی وجہ ہے کہ شعر کے قواعد وضوابط جس حد تک آزمودہ اور مفید ہیں، نثر کے ضوابط کو اس حد تک اعتبار حاصل نہیں ہو پایا ہے بلکہ یہ کہیں تو شاید غلط نہ ہوگا کہ ہم نثری تخلیقات کو بھی انھیں ضابطوں کے تحت پرکھتے ہیں جو شاعری کے لیے متعین کیے گئے تھے۔ چنانچہ شاعری کی طرح ہی ناول اور افسانے ادب کا حصہ ہیں اور ناول افسانے ہی کی طرح تنقید اور تحقیق کو بھی ادب میں شمار سمجھے جاتے ہیں۔ ان سب کا ادبی معیار بھی مختلف ہے اور مطالعے کے اثرات کا دائرہ بھی۔ ان کے مراتب کے تعین پر اب بھی خاطر خواہ گفتگو ہونا باقی ہے۔''

اس تحریر میں اور بھی بحث طلب امور ہیں۔ ظاہر ہے کہ جب تخلیق کی عظمت کا معیار ہی متعین نہ ہو اور کوئی واضح Canon بھی نہ ہو تو ایسی صورت میں قواعد وضوابط کی تشکیل یا تخلیق کے مراتب ومدارج کا تعین کیسے کیا جائے؟ اس پر مبسوط گفتگو ہونی چاہیے۔

ان دو تحریروں کے علاوہ مضامین کے ذیل میں علی احمد فاطمی، رؤف خیر، خورشید اکرم، حیدر وارثی، اختر آزاد اور محمد حنیف خان کی بیش قیمت تحریریں شامل کی گئی ہیں۔ صدیق عالم جیسے فکشن نگار سے نورینہ اکرم نے جو سوالات کیے ہیں وہ فکشن کے بہت سے اہم نکات اور جزئیات کا احاطہ کرتے ہیں۔ صدیق عالم نے بڑی قیمتی بات کہی ہے کہ ''ادب اور آرٹ انسان کی زندگی سے کبھی ختم ہونے والا نہیں ہے کیونکہ ان کا خاتمہ انسان کا خاتمہ ہے۔ جب تک انسان زندہ ہے اس کا امیجی نیشن زندہ رہے گا۔ جب تک امیجی نیشن زندہ ہے الفاظ زندہ رہے ہیں اور جب تک الفاظ زندہ ہیں انسان مر نہیں سکتا۔''

فکشن کے تحت حسین الحق، شموئل احمد، ثروت خان، سید احمد قادری، احمد صغیر، خورشید حیات، حنیف سید، یمیس کرن، سلیم سرفراز، اعجاز روشن اور ڈاکٹر رشید جہاں انور جیسے نام شامل ہیں۔ شمارے میں شامل تمام افسانوں پر گفتگو ممکن نہیں ہے۔ افسانوں کا انتخاب مدیر کے حسن ذوق کا ثبوت ہے۔ اسی طرح منظومات، تراجم، تبصرے اور مکتوبات بھی اس رسالے کی اہمیت اور معنویت کو دوچند کرتے ہیں۔ مجھے امید ہے کہ احمد نثار کی یہ ادارتی کوشش ہر حلقے میں قدر کی نگاہ سے دیکھی جائے گی۔ مجلّے کے سرورق پر شاید غلطی سے 'سہ ماہی تحقیقی اور تخلیقی ادب کا ترجمان' شائع ہو گیا ہے جب کہ 'تحقیقی اور تخلیقی ادب کا ترجمان سہ ماہی عالمی فلک' ہونا چاہیے۔ ■

عالمی اردونامہ

ازبکستان میں اردو-ہندی کی تدریس

ورلڈ اردو ایسوسی ایشن اور جنوب ایشیائی زبانوں کے شعبہ، تاشقند اسٹیٹ یونیورسٹی آف اورینٹل اسٹڈیز، تاشقند، ازبکستان کے زیر اہتمام یک روزہ بین الاقوامی سمینار کامیابی کے ساتھ اختتام پذیر ہوا۔ اس میں ازبکستان، ہندستان، پاکستان، کناڈا، برلن، ڈنمارک، ماریشس اور کئی یوروپی ممالک کے نامور ادیبوں اور اساتذہ نے شرکت کی۔ اس سمینار کا افتتاح تاشقند اسٹیٹ یونیورسٹی آف اورینٹل اسٹڈیز کی ریکٹر محترمہ پروفیسر گل چہرہ رخسیوا نے کیا۔ انھوں نے اپنی گفتگو میں اس بات کا ذکر کیا کہ تقریباً ستر سال سے یہاں اردو- ہندی کی تدریس ہورہی ہے۔ اس شعبے نے اردو-ہندی کے بڑے ادیبوں کو جنم دیا ہے اور ہندوستان کے درمیان تہذیبی روابط مضبوط کرنے کی سمت میں اہم اقدام کیا ہے۔ پروفیسر خواجہ اکرام نے کہا کہ ورلڈ اردو ایسوسی ایشن اردو زبان و تہذیب کی ترویج کے لیے کام کر رہا ہے اسی سلسلے کی یہ ایک اہم کڑی ہے۔ انھوں نے کہا کہ مشرق وسطیٰ میں تاشقند اردو- ہندی تعلیم و تدریس کا عظیم مرکز ہے۔ یہاں کے ادیبوں میں کئی بڑے نام ہیں جنھوں نے اردو زبان و ادب اور ہندی ادب کے لیے نہایت ہی قابل قدر خدمات انجام دی ہیں۔ کناڈا سے ڈاکٹر سید تقی عابدی مہمان خصوصی کے طور پر شریک ہوئے۔ انھوں نے تاشقند میں موجود اردو-ہندی کے اس مرکز کی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے بتایا کہ تہذیبی اعتبار سے برصغیر ازبکستان سے بہت قریب ہے۔ اس لیے ہمیں اس سمت میں مزید کام کرنے کی ضرورت ہے۔ دوسرے مہمان خصوصی کلچرل کانسلر کے ڈائرکٹر پروفیسر چندر شیکھر نے بتایا کہ ہندوستانی حکومت اس سمت میں کافی اہم کوششیں کر رہی ہے اور مستقبل قریب میں کئی اہم اقدامات ہونے ہیں۔ انھوں نے یہ بھی بتایا کہ یہاں کے اساتذہ بہت ہی سنجیدگی سے بنیادی کام کر رہے ہیں، ان کی حوصلہ افزائی کے لیے ہمیں مزید کچھ کام کرنے ہیں۔ ڈنمارک سے مہمان خصوصی نصر ملک نے یونیورسٹی کی ریکٹر اور تمام اساتذہ کو مبارکباد پیش کی۔ افتتاحی تقریب کی صدارت ازبکستان میں اردو کے بڑے محسن استاد محترم ڈاکٹر تاش مرزا نے کی۔ انھوں نے ورلڈ اردو ایسوسی ایشن کی اس پہل کو سراہتے ہوئے کہا کہ یہ یقیناً بہت اہم سمینار ہے جس میں ہندوستان، پاکستان کے علاوہ دنیا بھر سے احباب شریک ہیں اس سے ہمارے اساتذہ کی حوصلہ افزائی ہوگی اور انھیں مزید کام کرنے کی تحریک ملے گی۔ سمینار کے تکنیکی اجلاس کا موضوع 'اردو- ہندی شعر و ادب میں سماجی اور معاشرتی مسائل کی عکاسی' تھا جس کی صدارت پروفیسر خواجہ اکرام اور پروفیسر دیوندر چوبے نے کی۔ اس اجلاس میں مندرجہ ذیل اردو ہندی کے اساتذہ نے اپنے مقالے پیش کیے۔

بابری عہد کا ادب: ڈاکٹر تمارہ خوجائیوا، ازبیک ہند ادبی تعلقات: ڈاکٹر شیرین جلیلوا، پراچین بھارتی اور ازبیک تاجکوں کی سانسکرتک سماناؤں کا تجزیہ: ڈاکٹر محیا عبدالرحمانوا، ڈپٹی نذیر احمد کے ناول 'ایامیٰ' میں بیوگی کے مسائل: ڈاکٹر سراج الدین نورماتوف، ہند آریائی زبانوں میں نظام عدد کا ارتقا: مکتوبہ مرتضیٰ خوجائیوا، یاشپل اور چمپا بھارتی کے فن: مشابہات اور تفرقات: عدالت یونسووا، ازبکستان میں سنیتا جین کی تصانیف کا مطالعہ: محرم میرزائیوا، اردو کے طلبہ کی تعلیم میں اردو کہانیوں کی اہمیت: معمورہ سلیمانوا، پریم چند کے افسانوں میں سماجی مسائل: مہری مماجانوا، امرتا پریتم کی شاعری کے چند پہلو: شاہراہ میدوا مخلصہ، بابر نامہ کے اردو تراجم: کمالہ ایرگاشیوا، اردو اور ازبیک زبانوں کی تاریخی مماثلتیں: موجودہ صادیقوا، ازبکستان میں ہندی کی تدریس: ان مقالوں کے بعد پروفیسر چوبے نے مقالوں پر بھرپور روشنی ڈالی۔ برلن کے مہمان عارف نقوی نے تمام مقالوں کو سراہتے ہوئے کہا کہ غیر ملکیوں سے اتنی صاف ستھری زبان سننا یقیناً حیرت کی بات ہے۔ انھوں نے سب کو مبارکباد پیش کی۔ پروفیسر الیاس مہر پاکستان اور ڈاکٹر شگفتہ فردوس پاکستان نے بھی اظہار خیال کرتے ہوئے ان کی تعریف کی اور تعلیم و تدریس کے لیے اپنی معاونت کی پیشکش کی۔ پروفیسر خواجہ اکرام کے شکریے کے ساتھ اس سمینار کا اختتام ہوا۔

روزنامہ 'میرا وطن'، دہلی، 24 جون 2021

ترکی اور دنیا میں اردو کے طلبہ وطالبات کے روشن مستقبل کے امکانات

شعبۂ اردو، استنبول یونیورسٹی، ترکی کے بیرونی حلیفوں کے مابین ہونے والے آن لائن مشاورتی اجلاسوں کی دوسری نشست کا اہتمام ہندوستان کے معروف ادارہ ورلڈ اردو ایسوسی ایشن کے ساتھ گزشتہ دنوں عمل میں آیا۔ اس مشاورتی اجلاس کا موضوع 'ترکی اور دنیا میں اردو کے طلبہ و طالبات کے روشن مستقبل کے امکانات' تھا۔ یہ ان مشاورتی اجلاسوں کی دوسری کڑی ہے جسے شعبہ اردو، استنبول یونیورسٹی، ترکی اور ورلڈ اردو ایسوسی ایشن، ہندوستان کے درمیان دستخط شدہ ایم او یو کے تحت منعقد کیا گیا ہے اور انشاء اللہ ان مشاورتی اجلاسوں کا سلسلہ جاری رہے گا۔ واضح رہے کہ ترکی میں یونیورسٹیوں کے شعبہ جات کی یوروپین کمیونٹی کی شرائط کے مطابق Accreditation International کا سلسلہ شروع ہوا ہے۔ یہ دو تین سال کے دوران تعلیمی، تدریسی، تحقیقی اور سماجی تعلقات کے میدانوں پر محیط معیار سازی کا سلسلہ ہوتا ہے جس میں تعلیمی نصاب سے لے کر امتحانات کا جواب نامہ تیار کرنے اور تمام ریکارڈوں کی باقاعدہ فائلنگ اور تحفظ کی صورت حال کو متعین کرنا ہے اور مزید برآں طلب علموں کے فارغ التحصیل

ہونے کے بعد کاروباری دنیا میں ان کو جن مشکلات سے سامنا ہوتا ہے ان مشکلات کی تحقیق اور ازالہ کی راہیں تلاش کرنے تک کے وسیع موضوعات شامل ہوتے ہیں۔ اس سلسلے کی ایک اہم کڑی بیرونی حلیف یعنی ملکی اور غیر ملکی پارٹنرز کے ساتھ ایم او یو دستخط کرکے ان سے سال میں دو مرتبہ اجلاس منعقد کرنے ہیں جن میں مختلف شعبہ جات کے طلبہ و طالبات کو تعلیم و تدریس کے مرحلے کے اختتام کے بعد کی زندگی کے امکانات کے بارے میں صلاح و مشورہ کرنا ہے۔

ان مشاورتی اجلاسوں کی دوسری آن لائن نشست 5 جون 2021 کو ہوئی جس کے مہمان اعزازی پروفیسر ڈاکٹر خواجہ محمد اکرام الدین تھے۔ ڈاکٹر خواجہ اکرام ورلڈ اردو ایسوی ایشن کے سربراہ اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی، نئی دہلی کے شعبہ اردو کے استاد ہیں اور وہ ہندوستان کے اہم ادارے قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر بھی رہے ہیں۔ اس نشست کا آغاز ڈاکٹر خلیل طوقار، صدر شعبۂ اردو، استنبول یونیورسٹی نے مہمان اعزازی کا خیر مقدم کرتے ہوئے کیا اور کہا کہ اس میں کوئی شک نہیں کہ اردو زبان نہ صرف برصغیر کی بلکہ ہم ترکوں کا بھی تہذیبی اور ثقافتی ورثہ ہے جس کی مضبوطی، تحفظ اور آبیاری ہم سب کی ذمہ داری ہے۔ پروفیسر خواجہ اکرام الدین نے ترکی، استنبول یونیورسٹی اور پروفیسر خلیل طوقار کے شکریہ سے اپنی گفتگو کا آغاز کیا۔ انھوں نے استنبول میں اردو تدریس کی سو سال سے زائد عرصے پر محیط خدمات کی ستائش کی اور کہا کہ بیرونی ممالک میں شعبۂ اردو استنبول یونیورسٹی کو امتیاز حاصل ہے۔ انھوں نے یہ بھی کہا کہ ترکی میں اردو تدریس کا سلسلہ دراصل برصغیر میں تہذیبی روابط استوار کرنے کی سمت میں ایک اہم اور مثبت اقدام ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 11 جون 2021

عربی اردو ترجمے کی صورت حال

دوحہ، قطر: شیخ احمد ایوارڈ برائے ترجمہ اور بین الاقوامی مفاہمت کی تقریبات کے ضمن میں ہر سال ایوارڈ کی میڈیا کمپنی، ایوارڈ کے لیے منتخب کی گئی زبانوں میں عربی ترجمے کی صورت حال کو سامنے لانے کے لیے مذاکروں اور سیمناروں کا اہتمام کرتی ہے۔ اسی ضمن میں ہندوستان میں عربی سے اردو اور اردو سے عربی ترجمے کی موجودہ اور تاریخی صورت حال اور اس حوالے سے افراد اور اداروں کی خدمات اور پیش آمدہ مشکلات کے وقیع موضوع پر علمی آن لائن مذاکرے کا اہتمام کیا گیا جس میں شیخ حمد ایوارڈ کی میڈیا ایڈوائزر ڈاکٹر حنان الفیاض نے بذات خود شرکت کی۔ ویبینار کی نظامت میڈیا پرسنالٹی اور ترجمہ نگار عبید طاہر نے کی، جب کہ شرکا میں جامعہ ملیہ اسلامیہ میں عربی شعبے کے صدر اور صدارتی ایوارڈ یافتہ پروفیسر عبدالماجد القاضی اور شعبے کے سابق سربراہ پروفیسر حبیب اللہ خان، علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے شعبۂ عربی کے پروفیسر صدارتی تمغے سے سرفراز ثناء اللہ ندوی اور جے این یو میں اسلامی اور افریقی اسٹڈیز سینٹر کے سابق سربراہ اور صدارتی ایوارڈ یافتہ پروفیسر مجیب الرحمٰن شامل تھے۔ پروفیسر حبیب اللہ خان نے ہندوستان میں تراجم کے سلسلے میں اداروں اور افراد کی خدمات کا جائزہ لیا اور بتایا کہ اٹھارہ ہزار سے زیادہ کتابیں اداروں کی سطح پر عربی سے ترجمہ کی گئی ہیں جب کہ شخصی خدمات کا اندازہ لگانا ممکن ہی نہیں ہے۔ پروفیسر مجیب الرحمٰن نے اپنی ریسرچ کا حوالہ دیتے ہوئے بتایا کہ 90 فیصد تراجم عربی سے اردو میں کیے گئے ہیں جب کہ صرف 10 فیصد اردو سے عربی میں کیے گئے ہیں۔ انھوں نے اس کے اسباب اور تدارک کے ذرائع پر بھی روشنی ڈالی۔ ویبینار کے تیسرے موضوع یعنی ترجمے کے میدان میں ذاتی تجربات کو پروفیسر ثناء اللہ ندوی نے موضوع گفتگو بناتے ہوئے کہا کہ مترجم کے لیے ضروری ہے کہ وہ دونوں زبانوں پر مہارت کے ساتھ ساتھ اصل متن کے موضوع سے بھی واقفیت رکھتا ہو۔ ویبینار کے آخری مقرر پروفیسر عبدالماجد قاضی نے درست ترجمے کی راہ میں حائل رکاوٹوں کا علمی اور تحقیقی جائزہ لیا اور بالخصوص شعری ترجمہ کرتے ہوئے ممکنہ پریشانیوں کی وضاحت کی اور مثالوں کے ذریعے واضح کیا کہ ایک لفظ کے ادھر ادھر ہونے سے کس طرح اصل متن کی روح ختم ہوسکتی ہے۔ ویبینار کے آخر میں ایوارڈ کمیٹی کی میڈیا ایڈوائزر ڈاکٹر حنان الفیاض نے مقررین کی وقیع گفتگو پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے ایوارڈ کے وژن، مقاصد، شرائط اور اس کی مالیت اور تقسیم کے طریقہ کار پر روشنی ڈالی، اس کے بعد ویبینار کے ناظم اور ہند و پاک کے لیے میڈیا کمیٹی کے کوآرڈینیٹر عبید طاہر نے شرکا اور ان لائن دیکھنے والے تقریباً چار ہزار ناظرین کا شکریہ ادا کرتے ہوئے دو گھنٹے سے زیادہ جاری رہنے والے وقیع اور علمی مذاکرے کے اختتام کا اعلان کیا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 22 جون 2021

جن کتابوں نے متاثر کیا

ماہنامہ 'اردو دنیا' کا نیا سلسلہ

ہزاروں کتابوں میں چند ہی کتابیں ایسی ہوتی ہیں جو آپ کے ذہن و دل کی دنیا بدل دیتی ہیں۔ ایسی کتابوں کی قوت، اہمیت و معنویت کو قارئین سے شیئر کرنے کے لیے 'اردو دنیا' میں ایک نیا سلسلہ شروع کیا جارہا ہے۔ جس میں مختلف اصناف پر مشتمل نئی اور پرانی کتابوں کے بارے میں صاحبانِ علم و ہنر یہ بتائیں گے کہ کن کتابوں نے انھیں متاثر کیا ہے۔

صاحبانِ ذوق کتاب کے اسلوب، موضوع اور دیگر تلازمات کے علاوہ یہ بھی بتائیں گے کہ یہ کتابیں کیوں پڑھنی چاہئیں۔ آپ نے ابھی تک جتنی کتابیں پڑھی ہیں ان میں سے چند کا انتخاب کیجیے اور اپنے مطالعاتی سفر میں ان افراد کو بھی شامل کیجیے جن تک شاید ان کتابوں کی رسائی نہیں ہوپاتی ہے۔ منتخب کتابوں کے تعلق سے اپنے منطقی و معروضی خیالات اور تاثرات ہمیں لکھ بھیجیے۔

قومی اردو کونسل کی سرگرمیاں

یوگ ہمیں تناؤ سے قوت اور منفی رجحان سے مثبت رجحان اور تخلیقیت کی طرف لے جاتا ہے: ڈاکٹر شیخ عقیل احمد

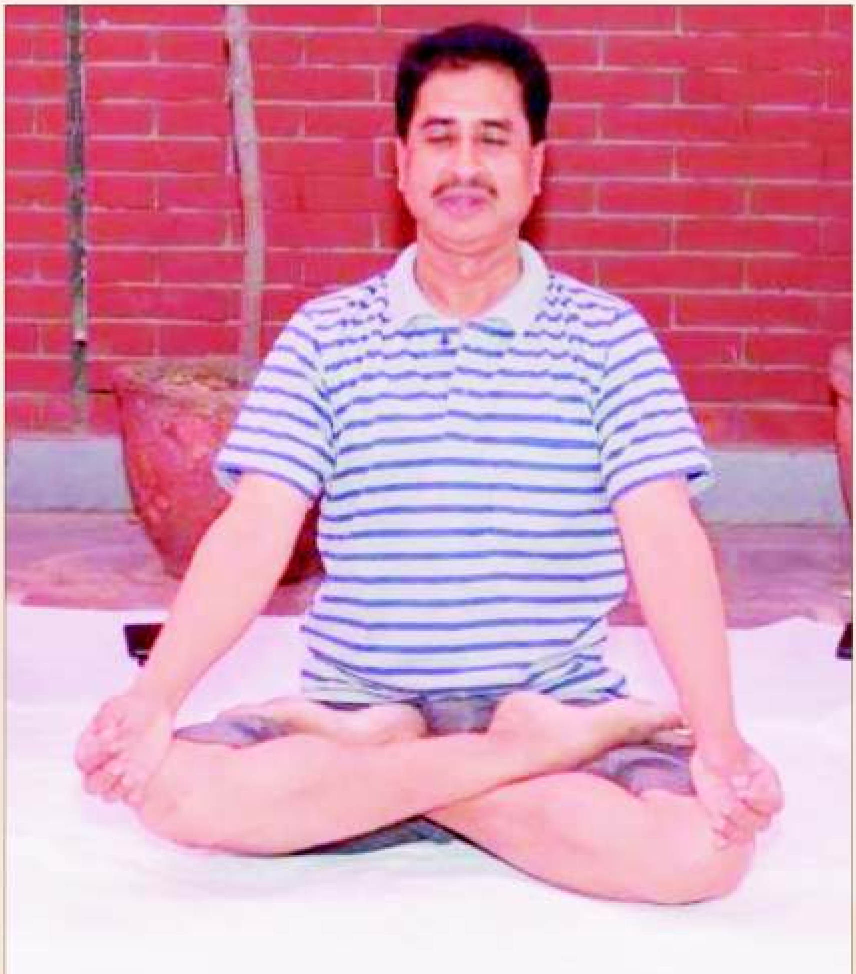

نئی دھلی: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کے ڈائرکٹر ڈاکٹر شیخ عقیل احمد نے آج یوگا ڈے کے موقع پر کہا کہ کامیاب اور بامقصد زندگی گزارنے کے لیے انسان کا جسمانی اعتبار سے صحت مند ہونا نہایت ضروری ہے اور جسم کو صحت مند رکھنے میں یوگ اہم رول ادا کرتا ہے، ہم یوگ کو اپنا کر اپنی زندگی کو صحت منداور کارگر بنا سکتے ہیں۔ چونکہ ایک صحت مند انسان ہی زندگی میں کامیابیوں سے ہم کنار ہوسکتا ہے، اس لیے ہمیں اپنی زندگی کے معمولات میں یوگ کوضرور شامل کرنا چاہیے۔ ڈاکٹر عقیل نے کہا کہ یوگا کا تعلق ہندوستانی تہذیب سے ہے اور یہ ہندوستانی وراثت کا اہم جز ہے۔ انھوں نے کہا کہ یوگ ہندوستان کی قدیم روایت و ثقافت کا ایک انمول تحفہ ہے۔ یہ دماغ اور جسم، انسان اور فطرت کے درمیان ہم آہنگی پیدا کرنے اور صحت مند و تندرست رہنے کا ایک جامع نظریہ پیش کرتا ہے۔ یہ محض ورزش نہیں ہے بلکہ جسمانی و روحانی سکون وطمانیت کا ذریعہ بھی ہے۔ یوگ زندگی کے طور طریقوں میں خوشگوار بدلاؤ لاکر ہمارے لیے مددگار ثابت ہوسکتا ہے۔ شیخ عقیل احمد نے اپنے بارے میں بتایا کہ وہ ہر روز صبح بیس سے پچیس منٹ تک یوگ کرتے ہیں جس کا ان کی زندگی پر مثبت اثر پڑا ہے اور غیر معمولی فوائد حاصل ہوئے ہیں۔

شیخ عقیل احمد نے کہا کہ وزیر اعظم نریندر مودی کا یہ قول یوگ کی بہترین تعریف ہے کہ یوگ ہمیں تناؤ سے قوت اور منفی رجحان سے مثبت رجحان اور تخلیقیت کی سمت لے جاتا ہے۔ قومی اردو کونسل کے ڈائرکٹر نے کہا کہ وزیر تعلیم ڈاکٹر رمیش پوکھریال نشنک کی قیادت میں این سی پی یو ایل بھارت کی اس اہم وراثت کو آگے بڑھانے کے لیے یوگ پر تحریر کردہ کتابوں کو اردو زبان میں شائع کرے گی اور پوری اردو دنیا کو یوگ کی جسمانی وطبی اہمیت سے روشناس کرائے گی۔

پریس ریلیز، رابطۂ عامہ سیل، قومی اردو کونسل، 21 جون 2021

اردو اور تعلیم سے متعلق قومی اور علاقائی خبریں

دھلی

جشنِ اردو

نئی دھلی: ماہنامہ 'آئینۂ حق' دہلی کے کامیابی کے ساتھ 20 سال مکمل ہونے پر 'جشن اردو' کے عنوان سے جامعہ عربیہ سراج العلوم کے 'شیخ الہند منزل' میں قاری محمد فاروق جامعی مدیر اعلیٰ ماہنامہ آئینۂ حق دہلی کی صدارت میں منعقد ہوا۔ پروگرام کا آغاز حافظ محمد حسان ابن مولانا عظیم الدین واعظ بانی و مدیر اعلیٰ سابق ماہنامہ آئینۂ حق دہلی کی تلاوت و ہدیۂ نعت سے ہوا۔ پروگرام کی نظامت مولانا محمد واصف نفیس مظاہری مدیر ماہنامہ آئینۂ حق دہلی نے کی۔ اس موقعے پر مولانا محمد واصف مظاہری نے ماہنامہ 'آئینۂ حق' کی خدمات اور صحافتی کردار پر سیر حاصل گفتگو کی۔ اس پروگرام میں غازی آباد کے ائمہ و علماء نے بطور خاص حصہ لیا اور قاری محمد فاروق جامعی مدیر اعلیٰ و مولانا محمد واصف نفیس مظاہری کی خدمات کو سراہتے ہوئے کہا کہ ماہنامہ 'آئینۂ حق' دہلی نے جہاں سماج و معاشرہ کی اصلاح میں نمایاں کردار انجام دیا ہے وہیں سماج کے ہر طبقے کی رہنمائی کا فریضہ بھی انجام دیا ہے، پروگرام میں قاری عرفان علیمی، مفتی محمد حسن القاسمی، قاری محمد نواب، مفتی غلام المرسلین، مفتی خلیل، مولانا جناب الدین حافظ خالد، قاری سلیم، مولانا ناظم قاسمی وغیرہ نے اپنے تاثرات کا اظہار کرتے ہوئے حوصلہ افزا کلمات سے نوازا اور ماہنامہ 'آئینۂ حق' دہلی کی توسیع و اشاعت کا بھی وعدہ کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 24 جون 2021

اتر پردیش

ڈاکٹر عظیم امروہوی، جون ایلیا اور شوق امروہوی کی یاد میں

امروھہ: امروہہ سے تعلق رکھنے والی ثقافتی تنظیم امروہہ فاؤنڈیشن نے اپنے 10 سال مکمل ہونے پر امروہہ کی متعدد علمی و ادبی شخصیات کی یاد میں مشاعرے کا انعقاد کیا جس کا سلسلہ کئی روز سے جاری ہے۔ اس سلسلے میں 13 اہم مشاعروں کا انعقاد کیا گیا۔ پہلے عالمی مرثیہ سینٹر کے چیئرمین ڈاکٹر عظیم امروہوی کی یاد میں عالمی مشاعرے کا انعقاد کیا گیا جس کی صدارت کنیڈا سے صوالح انچانے کی جب کہ نظامت وسیم حسن وفا علی گڑھ نے انجام دی۔ ڈاکٹر عظیم امروہوی کی زندگی پر فاؤنڈیشن کے صدر فرمان حیدر نقوی نے روشنی ڈالی اور بتایا کہ ڈاکٹر عظیم امروہوی ہماری تنظیم کے سرپرست تھے اور 50 سے زائد کتابوں کے مصنف تھے۔ اس مشاعرے میں امریکہ سے تبسم علوی، نعیم جاوید، ڈاکٹر قمر سرور، حسنین بخاری، ارشد شرفی، یوسف خاں، کاظم وسطی، شہناز بانو جیسے نامور شعراء کرام نے حصہ لیا۔ اسی سلسلے میں انجمن ترقی اردو سے وابستہ امروہہ کی نامور شخصیت شوق امروہوی کی یاد میں نہایت ہی کامیاب مشاعرے کا اہتمام ڈاکٹر محمد امیر ضیا پاکستان کی صدارت میں کیا گیا جس کی نظامت شاہد انور نے انجام دی۔ اس مشاعرے میں اٹلی سے جیم فے گوری مہمان خصوصی کے طور پر شریک رہے۔ مہمان ذی وقار میں بنگلہ دیش سے شمیم زمنوی، آسٹریلیا سے الیاس شیخ جرمن سے سرور غزالی اور بھارت سے فاروق بخشی شریک تھے۔ نامور شعراء کرام نے اس مشاعرے میں کلام پیش کیا جس کو اردو ادب سے وابستہ شخصیات نے بہت پسند کیا۔ اختتامی مشاعرہ جون ایلیا کی یاد میں منعقد کیا گیا جس کی صدارت کناڈا سے تقی عابدی نے کی۔ مہمان خصوصی کے طور پر محترمہ ذکیہ غزل کناڈا نے شرکت کی اور افتتاح زیب النساء زوبی پاکستان نے کیا۔ اس مشاعرے کی نظامت پیمبر عباس نقوی نے انجام دی۔ محفل مشاعرہ میں ملک اور بیرون ملک کے نامور شعراء کرام موجود تھے۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 21 جون 2021

ڈاکٹر رضا حیدر کی ادبی خدمات

لکھنؤ: ادارۂ لوح و قلم اور شفق چینل کے باہمی اشتراک سے غالب انسٹی ٹیوٹ کے سابق ڈائرکٹر اور اردو کے

ممتاز ادیب، معروف نقاد اور قابل اعتبار محقق ڈاکٹر سید رضا حیدر کو خراج عقیدت پیش کرنے کے لیے آن لائن عالمی ویبینار کا انعقاد کیا گیا۔ لوح و قلم کے چیئرمین ڈاکٹر مرزا شفیق حسین شفق نے ان کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف کے لیے ایک روزہ عالمی سیمینار منعقد کیا جس میں اکابرین دین و ادب نے ڈاکٹر رضا حیدر کی علمی و ادبی شخصیت کے مختلف ابعاد و جہات کی تفہیم کی قابل قدر کوششیں کیں۔ ویبینار کا افتتاح کرتے ہوئے ریاست کیرالہ کے گورنر اور معروف اسکالر عارف محمد خان نے کہا کہ ڈاکٹر سید رضا حیدر ایسے لوگوں میں تھے جنھوں نے زبان و ادب کی بڑی شائستگی اور سنجیدگی سے خدمت کی ہے۔ حقیقت میں وہ زبان و ادب کے سچے خادم تھے۔ پروفیسر شارب ردولوی نے صدارتی تقریر کرتے ہوئے کہا کہ ڈاکٹر رضا حیدر براہ راست میرے شاگرد نہیں تھے مگر انھوں نے ہمیشہ مجھے وہی عزت دی جو ایک طالب علم اپنے استاد کو دیتا ہے۔ وہ نہایت منتعلق اور سلیقہ شعار ادبی ذوق رکھنے والے نوجوان تھے وہ ایک اچھے منتظم اور فعال انسان تھے۔ مولانا سید کلب جواد نے کہا کہ ڈاکٹر رضا حیدر ایک پروقار انسان تھے۔ وہ نوجوانوں کے لیے آئیڈیل پرسنالٹی تھے۔ کناڈا ٹورنٹو سے ماہر رثائیات ڈاکٹر تقی عابدی نے کہا کہ ڈاکٹر رضا حیدر کے انتقال سے ہم نے ایک دانشورانہ فکر رکھنے والے تجربہ کار منتظم کو کھو دیا ہے۔ جرمنی برلن سے ممتاز افسانہ نگار اور شاعر عارف نقوی نے کہا کہ ڈاکٹر رضا انسان دوستی، ملنساری اور وضع داری کا اعلیٰ ترین نمونہ تھے۔ تہران یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کی پروفیسر وفا یزداں منش وفا نے کہا کہ ڈاکٹر رضا حیدر ایران تشریف لا چکے ہیں۔ ہماری لائبریری کے لیے انھوں نے بہت ساری کتابیں تحفتاً بھیجی تھیں وہ وعدوں کے وفا کرنے والے انسان تھے۔ فارسی ادب کی معروف اسکالر علی گڑھ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے شعبہ کی سابق صدر پروفیسر آذرمی دخت صفوی، دہلی یونیورسٹی دہلی کے شعبہ اردو کے سابق صدر پروفیسر عتیق اللہ، مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور کے صدر پروفیسر اختر الواسع نے ڈاکٹر رضا حیدر کی شخصیت کے مختلف پہلوؤں پر روشنی ڈالی۔ غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کے چیئرمین جسٹس بدر درریز احمد، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کے جنرل سکریٹری اور جواہر لال نہرو یونیورسٹی کے شعبۂ اردو

کے پروفیسر صدیق الرحمٰن قدوائی، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کے ٹرسٹی اور سابق الیکشن کمشنر آف انڈیا ایس وائی قریشی، غالب انسٹی ٹیوٹ دہلی کے ٹرسٹی جسٹس آفتاب علم نے بھی اپنے تاثرات کا اظہار کیا۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 8 جون 2021

ایک شام کیفی اعظمی کے نام

کانپور: اعجاز لٹریری سوسائٹی کانپور کی جانب سے 28 تاریخ کی شام ساڑھے سات بجے سوسائٹی کی نائب صدر ڈاکٹر ماہ طلعت صدیقی نے ایک ویبینار 'ایک شام کیفی اعظمی کے نام' سے منعقد کیا، جس میں فلم اور ادب کی قدآور

شخصیات نے شرکت کی۔ حسن کمال (نغمہ نگار) نے بتایا کہ ان کی ملاقات کیفی صاحب سے لکھنؤ یونیورسٹی کی طالب علمی کے دور میں ہوئی اور انھوں نے ان سے جڑی یادیں شیئر کیں۔ جاوید صدیقی (رائٹر) نے کیفی اعظمی کے آئی پی ٹی اے سے تعلق پر تفصیلی روشنی ڈالی۔ انھوں نے مراد علی (ایکٹر) کی زبانی پیش کی گئی کیفی اعظمی کی نظم 'دائرہ' کی بہت تعریف کی، جس کو مراد علی نے کیفی اعظمی کے انداز میں پیش کیا جو بہت مقبول ہوئی۔ مظفر علی (ڈائریکٹر) نے کیفی اعظمی کے فلمی سفر پر خیالات کا اظہار کیا۔ ان کے مطابق وہ انقلاب کو کئی نگاہوں سے دیکھتے تھے۔ انھوں نے کیفی اعظمی کو اپنے زمانہ کا نایاب شخص بتایا۔ ادیب اطہر نبی نے کیفی اعظمی کو شاعر ہی نہیں مجاہد بھی قرار دیا۔ انھوں نے اپنے قلم سے مزدور طبقے کی جو رہنمائی کی وہ قابل تحسین ہے۔ کلاسیکل موسیقار اسمتا بیلور نے کیفی اعظمی کی نظم 'اتنا تو زندگی میں کسی کی خلل پڑے' بہت خوبصورت انداز میں پڑھی۔ سائنسداں ڈاکٹر قمر رحمٰن نے کیفی اعظمی کے حوالے سے بات کی اور ان کی نظم 'عورت' پیش کی۔ پروگرام کی نظامت سہیل اختر نے کی۔ انھوں نے کیفی اعظمی کی نظم 'عجیب آدمی تھا' پڑھ کر سنائی جو بہت پسند کی گئی۔ اس موقعے پر ڈاکٹر انیس انصاری آئی اے ایس، سید معین علوی، احمد عثمان، احمد حماد، ڈاکٹر وسیم خاں (امریکہ) اور ڈاکٹر شارق (انگلینڈ) موجود تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 29 جون 2021

آسمانی کتب اور دیگر مذہبی کتابیں: تاریخ وتعارف

علی گڑھ: علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کی دینیات فیکلٹی اور اسلامک فقہ اکیڈمی انڈیا کے تعاون و اشتراک سے دو روزہ بین الاقوامی ویبینار/سیمینار 'آسمانی کتب اور دیگر مذہبی کتابیں: تاریخ و تعارف' کے عنوان سے 26،27 جون کو منعقد ہوا۔ پروفیسر طارق منصور شیخ الجامعہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اپنے افتتاحی خطاب میں موضوع کی اہمیت پر روشنی ڈالتے ہوئے کہا کہ ہم ایک تکثیری سماج میں رہتے ہیں اور ہماری بہت ساری قدریں باہم مشترک ہیں۔ ان مشترک قدروں پر ہم کو سنجیدگی اور مرکزیت کے ساتھ عمل کورونا ہوگا اس کے نتیجہ میں ایک صحت منداور صالح معاشرے کی تشکیل عمل میں آسکے گی۔ پروفیسر محمد سعود عالم قاسمی ڈین فیکلٹی آف تھیالوجی نے اپنے استقبالیہ خطاب میں کہا کہ پرامن بقائے باہم کے علاوہ معاصر مذاہب اور ان کی مقدس کتابوں کو سمجھنا ضروری ہے۔ عموماً لوگ اس بات سے واقف نہیں ہوتے کہ مذہبی کتابوں میں کس طرح کی درجہ بندی ہے، کن کتابوں کو قانونی درجہ حاصل ہے اور کون سی کتابیں ثانوی ہیں؟ اسی کے ساتھ ہمیں یہ بھی سمجھنا ہوگا کہ تمام ادیان میں جو مشترکہ اقدار ہیں وہ تمام انسانوں کا سرمایہ ہیں، اس لیے ان تمام روشن قدروں کو گہرائی سے سمجھنا اور آگے بڑھانا ہوگا۔ مہمان خصوصی پروفیسر اختر الواسع صدر مولانا آزاد یونیورسٹی جودھپور نے اپنے خطاب میں کہا کہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی نے اپنے قیام کے پہلے ہی دن سے ادیان و مذاہب کو جوڑنے کی کوشش کی ہے۔ اس کے تابندہ نقوش یہ ہیں کہ جب مہابھارت اور دیگر مذہبی کتابوں کے تراجم اردو میں ہوئے تو ان کو علی گڑھ مسلم یونیورسٹی کے پبلی کیشن ڈویژن نے بڑے اہتمام سے شائع کیا۔ اسی طرح آج اس بات کو سمجھنے کی بھی ضرورت ہے کہ میکس مولر کو ہندوستانی مذاہب کا پہلا قدرداں اور محقق سمجھا جاتا ہے جب کہ حقیقت یہ ہے کہ ابو ریحان البیرونی نے پہلے ہندوستانی تہذیب اور یہاں کی مذہبی روایات کو پڑھ کر مطالعۂ ادیان کے خطوط متعین کیے اور سرسید احمد خان نے مطالعۂ مذاہب کو تعلیم گاہوں کی ضرورت قرار دیا۔

روزنامہ 'ہندوستان ایکسپریس' دہلی، 29 جون 2021

بہار

کلیم عاجز: یادگاری ویبینار

پٹنہ: کلیم عاجز کی نثر انسان دوستی اور اعلیٰ تہذیبی اقدار پر مشتمل ہے۔ شاعری کی طرح کلیم عاجز کی نثر میں بھی ان کا اسلوب منفرد ہے، بیان کی سادگی، برجستگی اور وضاحت ان کی نثر کا خاص وصف ہے، تصنع ان کے یہاں نام کو بھی

نہیں ہے۔ کلیم عاجز کو اپنی تہذیب اور اس کے مظاہر سے بے پناہ انس تھا۔ ان خیالات کا اظہار پروفیسر شہزاد انجم نے کیا۔ وہ آج یہاں محکمہ کابینہ سکریٹریٹ کے تحت اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیراہتمام ایک آن لائن پروگرام 'کلیم عاجز یادگاری ویبینار' سے خطاب کر رہے تھے۔

اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر احمد محمود نے کہا کہ یہ ویبینار کلیم عاجز جیسی عظیم الشان شخصیت کے شایان شان نہیں ہے کیونکہ ہم کورونا کے سبب اسے اسٹیج پروگرام کے طور پر پیش کرنے سے قاصر رہے۔ انھوں نے کہا کہ کلیم عاجز جیسی اعلیٰ وارفع شخصیت دبستان بہار میں نگینے اور کوہ نور کی حیثیت رکھتی ہے۔ صدارتی خطاب کرتے ہوئے پروفیسر ابوذر عثمانی نے کلیم عاجز کو امتیازی شان کا حامل شاعر قرار دیا اور کہا کہ کلیم عاجز نے جس طرح اپنے غم کے سرمایے کو شعری پیکر عطا کیا ہے اس کی مثال ملنا محال ہے۔ پروفیسر علی احمد فاطمی نے کہا کہ ان کو سمجھنے کے لیے ان کے غم اور شعور غم کو سمجھنا ضروری ہے۔ محمد رضوان نے کلیم عاجز کی شخصی زندگی کے احوال و آثار پر روشنی ڈالی اور انھیں ایک بڑا شاعر، شفیق استاد، مثالی تاجر اور مخلص مبلغ بتایا۔ پروگرام کی ابتدا کرتے ہوئے اردو پروگرام انچارج اسلم جاوداں نے کہا کہ کلیم عاجز بہار کی شعری عظمت کا نشان اور ایوان غزل کی شان تھے۔ انھوں نے اپنی عالی قدر شاعری اور لازوال نثر نگاری سے دبستان بہار کو عالمی شناخت عطا کی جس پر ہم اہل بہار کو بجا طور پر ناز ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 30 جون 2021

پروفیسر عبدالمغنی یادگاری ویبینار

پٹنہ: محکمہ کابینہ سکریٹریٹ کے تحت اردو ڈائرکٹوریٹ کے زیر اہتمام ایک آن لائن پروگرام 'پروفیسر عبدالمغنی: یادگاری ویبینار' کا انعقاد کیا گیا جس میں دانشوران اردو نے پروفیسر عبدالمغنی کو ایک اعلیٰ مفکر، دانشور، منفرد نقاد،

سربلند ادیب، جلیل القدر صحافی اور بہار میں اردو تحریک کا سالار تسلیم کرتے ہوئے انھیں خراج عقیدت پیش کیا۔ اس ویبینار کی صدارت پروفیسر احمد سجاد نے کی جب کہ پروفیسر اعجاز علی ارشد، ڈاکٹر منظر حسین اور ڈاکٹر سید احمد قادری مقالہ خواں کی حیثیت سے شریک ویبینار تھے۔ پروگرام کے آغاز میں اردو ڈائرکٹوریٹ کے ڈائرکٹر احمد محمود نے تمام شرکاء اور سامعین و سامعات کا دلی استقبال کرتے ہوئے کہا کہ ہم آپ کے شکرگزار ہیں کہ آپ نے اپنا قیمتی وقت نکال کر اس پروگرام کو کامیاب بنانے میں اپنا تعاون پیش کیا۔ ڈائرکٹر موصوف نے بتایا کہ پروفیسر عبدالمغنی بڑے اصول پسند، وقت کے پابند، نفیس الطبع اور دیندارانہ مزاج کے حامل تھے۔ اگرچہ وہ انگریزی کے استاد تھے لیکن ان کا زیادہ تر وقت اردو دوستوں کے ساتھ اردو زبان کے فروغ اور ترقی کے لیے منصوبہ سازی کرنے اور اس پر عمل درآمد کرانے میں گزرتا تھا۔ پروفیسر احمد سجاد نے کہ پروفیسر عبدالمغنی کی زندگی علم دوستی، اصول پسندی، وضع داری، حق گوئی اور دینداری سے عبارت رہی۔ وہ بے حد اخلاق مند، وقت کے پابند اور اخلاقی قدروں کے علمبردار تھے۔ شاعری اور ادب کے حوالے سے وہ اقبال اور مولانا مودودی سے متاثر رہے۔ پروفیسر عبدالمغنی کا یہ طرہ امتیاز تھا کہ وہ کسی بھی موضوع پر پوری شرح و بسط کے ساتھ اس طرح گفتگو کرتے جیسے کوئی مقالہ پڑھ رہے ہوں۔ پروفیسر اعجاز علی ارشد نے 'عبدالمغنی اور اردو تحریک' کے حوالے سے گفتگو کرتے ہوئے کہا کہ عبدالمغنی صاحب نے اردو تحریک کو اس اعتبار سے ایک نیا رخ دیا کہ اسے جلسے، جلوس، احتجاج اور نعرہ بازی کے حصار سے آگے بڑھا کر حکمت عملی اور منصوبہ بندی سے آشنا کیا۔ انھوں نے حالات اور زمانے کے مطابق باضابطہ مختصر اور طویل مدتی منصوبے بنائے اور کامیابی کے ساتھ اردو تحریک کو آگے بڑھایا۔ ڈاکٹر منظر حسین کے مقالے کا عنوان 'پروفیسر عبدالمغنی کا نظریہ ادب: ان کی تصانیف کی روشنی میں' تھا۔ انھوں نے پروفیسر عبدالمغنی کی کتابوں کی روشنی میں بتایا کہ وہ تعمیری اور صالح ادب کے علمبردار تھے۔

روزنامہ 'سچ کی آواز' دہلی، 24 جون 2021

مہاراشٹر

شمالی امریکہ میں خواتین کی اردو خدمات

سولاپور: اردو زبان و ادب کے ماہر ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی نیویارک کی یکم جولائی 75ویں سالگرہ کے موقع پر

بھارتیہ اردو وکاس فاؤنڈیشن سولاپور کے زیر اہتمام انجمن علم و ادب اور ساؤتھ ایشین کلچرل سوسائٹی آف شکاگو امریکہ کے زیر اشتراک 'تو ہے اردو کا قلندر خانقاہِ شوق میں' کے عنوان سے آن لائن ادبی و تہنیتی نشست کا انعقاد عمل میں آیا۔ فاؤنڈیشن کے صدر سلطان اختر نے مہمانان کا تعارف کرایا۔ بطور مہمان پروفیسر ڈاکٹر آفتاب احمد آفاقی وارانسی نے ڈاکٹر فاروقی کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ فاروقی صاحب بیک وقت محقق و نقاد ہیں۔ اردو کو پھیلانے کے لیے بڑا کام کر رہے ہیں۔ شکاگو امریکہ سے اردو کی معتبر شاعرہ و ادیبہ غوثیہ سلطان نوری نے کہا کہ پروفیسر فاروقی تہذیب و تمدن کی جان اور علم کی پہچان ہیں۔ ادب اور دنیا دونوں کو کھلی آنکھ سے دیکھتے ہیں۔ 'شمالی امریکہ میں خواتین کے اردو خدمات' قلمبند کرنے والے وہ پہلے مصنف ہیں۔ ڈاکٹر شبیر اقبال دھولیہ نے کہا کہ 'ڈاکٹر فاروقی کی خدمات ناقابل فراموش ہیں۔' نواب رونق جمال درگ، پروفیسر سلیم دولت کوٹی بیجاپور، پروفیسر مومن بیجاپوری، ڈاکٹر نزہت شاہ امریکہ، ڈاکٹر جاوید شارب پالوجی ممبئی، غلام ثاقب بیڑ، ارشد صدیقی بیڑ، پروفیسر جاوید پاشاہ بیڑ، ایوب نلامندو سولاپور، ریاض توحیدی جموں کشمیر، انور کمشنر سولاپور، شگفتہ فاروقی امریکہ، سنگری نور احمد نور سولاپور کے علاوہ صدر نشست ڈاکٹر نذیر فتح پوری مدیر سہ ماہی اسباق پونہ نے اپنے صدارتی خطبے میں تمام تقاریر کا جائزہ لیا۔ موصوف کی علمی و ادبی خدمات کے اعتراف میں انھوں نے کہا کہ مخلص اور بے غرض اردو کے چاہنے والوں میں مجھے عبدالقادر فاروقی کا نام جگمگ کرتا نظر آیا۔

واضح رہے کہ ڈاکٹر فاروقی انجمن ڈگری کالج بیجاپور میں صدر شعبہ اردو تھے۔ 1993 میں امریکہ کا سفر اختیار کیا۔ آپ افسانہ نگار، محقق و صحافی ہیں۔ آپ کی تقریباً 17 کتابیں منظر عام پر آچکی ہیں۔ آپ کے فن و شخصیت پر 4 کتابیں، گوشے، سیمینار، ایک Ph.D. بھی ایوارڈ ہوئی ہے۔ ڈاکٹر عبدالقادر فاروقی صاحب نے تمام مہمانان کا شکریہ ادا کیا۔ سامعین میں ڈاکٹر شمس الدین کیرلا، یعقوب الرحمٰن ایوت محل، رفیق قاضی پونہ، پروفیسر ڈاکٹر عبدالرشید شیخ، اعظم خان اورنگ آباد کے علاوہ دیگر حضرات و خواتین شریک تھے۔

پریس ریلیز: سلطان اختر، 1 جولائی 2021

مدھیہ پردیش

اردو شاعری کے ارتقائی سفر میں باجن کی حصہ داری

برہانپور: صوفی شاعر حضرت شاہ بہاؤالدین باجن کے 530 سالہ عرس کے موقع پر دارالسرور ایجوکیشن اینڈ ویلفیئر سوسائٹی برہان پور (رجسٹرڈ) کے زیر اہتمام آن لائن کانفرنس 'اردو شاعری کے ارتقائی سفر میں باجن کی

حصہ داری' کے عنوان سے 25 جون 2021 بروز جمعہ منعقد ہوئی۔ کانفرنس کی صدارت سپریم کورٹ کے ایڈوکیٹ خلیل الرحمٰن صاحب نے فرمائی۔ انھوں نے صدارتی خطبہ پیش کرتے ہوئے کہا: شاہ بہاؤالدین باجن کا شعر و ادب

کی ثروت مندی میں بڑا حصہ ہے، ایک جلسہ یا ایک مقالہ اس کا متحمل نہیں ہوسکتا۔ موصوف نے مزید کہا کہ آپ یقین کیجیے برہان پور کی سرزمین پانچ سو سالوں میں باجن جیسی شخصیت پیدا نہیں کرسکی۔ افسوس نہ ان کا کوئی کام دکھائی دیتا ہے اور نہ ہی ان کا تعارف۔ انہوں نے مقالہ نگاران کے مقالات پر مختصراً تبصرہ و تجزیہ بھی پیش کیا۔

کویت کے صاحب دیوان شاعر مسعود حساس نے بڑی خوبصورت نظامت فرمائی۔ اپنے مرصع و مسجع جملوں سے نظامت میں چار چاند لگا دیے۔ سوسائٹی کے چیئرمین تنویر رضا برکاتی نے افتتاحی کلمات پیش کرتے ہوئے کہا: آج کی یہ کانفرنس باجن کے تعارف کے سلسلے میں عالمی سطح پر نقش اول کی حیثیت رکھتی ہے۔ ہم آئندہ باجن پر انٹرنیشنل سیمینار اور کانفرنس کے انعقاد کا عزم رکھتے ہیں۔ برہانپور کے معروف استاد شاعر و ادیب جمیل اصغر نے اپنا مقالہ پیش کرتے ہوئے کہا: اردو زبان و ادب کے مؤرخین و محققین نے باجن کی تصنیف خزانۂ رحمت کو اردو کا نہایت قدیم ماخذ قرار دیا ہے اور خود باجن کو اردو کے اولین شاعر کی حیثیت سے متعارف کروایا ہے۔

خلیل انصاری ایڈووکیٹ نے اپنے مقالے میں کہا کہ زبان و ادب کی خدمات کے سلسلے میں باجن کی خدمات کو نظر انداز نہیں کیا جاسکتا۔ معروف شاعر و ناظم طاہر نقاش نے اپنے مقالے میں کہا کہ اردو زبان جو آج پوری دنیا میں اپنی شیرینی کا لوہا منوا رہی ہے اس کی ابتدائی تدوین میں باجن کے ملفوظات اہمیت کے حامل ہیں۔ تنویر رضا برکاتی نے تمام مہمانان اور لائیو دیکھنے والوں کا شکریہ ادا کیا۔

پریس ریلیز: تنویر رضا برکاتی، 5 جولائی 2021

راجستھان

مہارانا پرتاپ کے عہد میں نظام تعلیم

ادے پور: شعبۂ اردو موہن لال سکھاڑیا یونیورسٹی، ادے پور کے زیر اہتمام مہارانا پرتاپ کی 481 ویں سال گرہ کے موقعے پر 14 جون 2021 کو مہارانا پرتاپ کے عہد میں نظام تعلیم کے موضوع پر یک روزہ قومی ویبینار کا انعقاد کیا گیا جس میں کثیر تعداد میں اساتذہ، طلبا اور ان کے سرپرستوں کے علاوہ عوام نے شرکت کی۔ میواڑ کی سرزمین خاص کر جھیلوں کے شہر ادے پور میں قائم موہن لال سکھاڑیا یونیورسٹی کے شعبۂ اردو کا یہ جشن ولادت رانا کا پروگرام، اپنی نوعیت کا تاریخی پروگرام تھا۔ اس موقعے پر یونیورسٹی کے وائس چانسلر پروفیسر امریک سنگھ نے اساتذہ طلبا اور عوام سے خطاب کرتے ہوئے کہا کہ مہارانا پرتاپ کی شجاعت اور بے مثال کردار، سماج کو صدیوں تک رہنمائی کرتے رہیں گے۔ مہارانا پرتاپ کی شجاعت میواڑ کے عوام کے لیے تاریخی برتری اور جذباتی لگاؤ کی علامت ہے جو تاریخ کے ساتھ ہمیشہ زندہ رہے گی۔ اس جشن ولادت مہارانا پرتاپ کے مہمان خصوصی پروفیسر راجیش مسرا، آر۔ آئی۔ ای، اجمیر تھے۔ انھوں نے اپنے پراثر خطاب میں کہا کہ آزادی کے لیے مہارانا پرتاپ کی جدوجہد میواڑ کے عوام کے لیے ہمیشہ شوق وولولے کا ماخذ رہے گی۔ مہارانا پرتاپ کی کامیاب رہنمائی آج بھی ہمارے تعلیمی نظام کو دیانت داری کے ساتھ قائم کرنے میں مددگار ثابت ہے۔ صدر شعبۂ اردو پروفیسر حدیث انصاری نے مہمان، مندوبین، اساتذہ، عوام اور طلبا کا خیر مقدم کرتے ہوئے کہا کہ مہارانا پرتاپ جس طرح ایک بہادر سپہ سالار تھے اسی طرح ایک عظیم رہنما اور سیاست داں بھی تھے۔ اگرچہ یہ ان کی پوری زندگی، سیاسی برتری کو قائم رکھنے کی جدوجہد میں گزری لیکن وہ میواڑ کے عوام کی نفسیاتی تعلیم و تربیت اور خوش حالی کی طرف سے کبھی غافل بھی نہیں رہے۔ کوہ اراولی کی وادیوں میں آباد، میواڑ کے بہادر قبائلی آدیواسی عوام اور سپاہیوں میں اپنی تہذیب وثقافت سے منسلک رہنے کا ہر وہ کام کیا اور حکمت عملی اپنائی، جس سے ان کے حوصلے بلند رہیں۔ اس کامیاب تاریخی جشن ولادت مہارانا پرتاپ اور قومی ویبینار کے اختتام پر شعبۂ اردو کی طالبات ارم ندا، غوثیہ بانو، فردوس بانو نے حاضرین کا شکریہ ادا کیا اور نظامت کے فرائض محترمہ مبینہ بانو نے انجام دیے۔

پریس ریلیز: پروفیسر حدیث انصاری، صدر شعبۂ اردو، موہن لال سکھاڑیا یونیورسٹی، ادے پور، 14 جون 2021

اعزاز و اکرام

خورشید حیات

نئی دہلی: مشہور و معروف افسانہ، ناول اور تنقید نگار خورشید حیات کو اردو زبان و ادب میں ناقابل فراموش خدمات انجام دینے کے لیے چھتیس گڑھ اردو اکادمی نے سال دو ہزار اکیس کے 'مجاہد اردو مولانا عبدالرؤف محوی ایوارڈ' سے نوازا ہے جس پر اردو کے مشہور ناول نگار اور ساہتیہ اکادمی ایوارڈ یافتہ حسین الحق، معروف ادیب نورالحسنین اور مشہور نقاد حقانی القاسمی نے انھیں مبارکباد پیش کی ہے۔ انھوں نے ایوارڈ ملنے پر خوشی کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ یہ ایوارڈ مسٹر خورشید حیات کی اردو کے تئیں

خدمات کا اعتراف ہے۔ انھوں نے امید ظاہر کی ہے کہ وہ آئندہ بھی اردو کی خدمت پوری تندہی کے ساتھ جاری رکھیں گے۔ مشہور نقاد حقانی القاسمی نے مسٹر خورشید حیات کو مبارکباد اور ان کی تنقیدی خدمات کا اعتراف کرتے ہوئے کہا کہ خورشید حیات تخلیقی اور تنقیدی امتزاج سے نئے ادب کی تختیاں تحریر کر رہے ہیں۔ ان کی محنتوں سے بہت سی گمنام اور فراموش کردہ شخصیتوں کے چہرے پر روشن ہیں۔ اجاڑ اور ویران علاقوں کو بھی اپنے لفظوں سے آباد کر رہے ہیں۔

واضح رہے کہ گزشتہ دنوں چھتیس گڑھ اردو اکادمی نے سال دو ہزار اکیس کا مجاہد اردو مولانا عبدالرؤف محوی ایوارڈ دینے کے لیے مسٹر خورشید حیات کو منتخب کیا ہے۔ اس کا اعلان ایوارڈ کمیٹی کے اجلاس میں کیا گیا۔ چھتیس گڑھ اردو اکادمی کا یہ ایوارڈ لاک ڈاؤن ختم ہونے کے بعد، نہایت اعزاز کے ساتھ ایک اہم تقریب میں دیا جائے گا۔ مسٹر خورشید حیات برسوں سے بڑی تندہی اور خلوص کے ساتھ اردو زبان و ادب کی خدمت کر رہے ہیں۔ پورے برصغیر میں خورشید حیات کے ادبی کاموں کو احترام کی نظر سے دیکھا جاتا ہے۔ ان کے افسانے ملک و بیرون ملک کے نہایت موقر رسائل و جرائد اور اخبارات میں شائع ہوتے ہیں۔ اس کے علاوہ ان کی کئی کتابیں بھی زیور طبع سے آراستہ ہوچکی ہیں۔ حال ہی میں ان کی ایک تنقیدی کتاب 'لفظ تم بولتے کیوں ہو؟' منظر عام پر آئی ہے۔ ان کا افسانوی مجموعہ اردو ایڈز 2000 میں شائع ہوا۔ اس کے علاوہ ہندی میں ان کا افسانوی مجموعہ 'سورج ابھی جاگ رہا ہے' 2004 میں شائع ہوا ہے۔ اسی کے ساتھ ان کا ناول 'عورت سمندر سڑک' اور ہندی کہانیوں کا مجموعہ 'انوکھی تبدیلی' بھی شائع ہوا ہے۔ مسٹر خورشید حیات کو اس سے پہلے درجنوں ایوارڈوں کے علاوہ 'قاضی عبدالودود ایوارڈ' سے بھی نوازا جاچکا ہے۔

روزنامہ 'میرا وطن' دہلی، 2021

نویں محمد خلیل سائنس داں ایوارڈ کا اعلان

نئی دھلی: وگیان پریشد پریاگ (الٰہ آباد) جس کے قیام کو 106 سال ہو چکے ہیں، بہ حیثیت ادارے کے سائنس کو عوام میں پھیلانے میں مصروف ہے، حال ہی میں اردو سائنسی خدمات کے لیے ڈاکٹر شمس الاسلام فاروقی اور حقانی القاسمی کو 'نویں محمد خلیل سائنس ایوارڈ' سے نوازے جانے کا اعلان کیا گیا ہے، جو بالترتیب سال

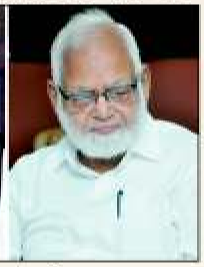

2018 اور 2020 کے لیے دیا جائے گا۔ ڈاکٹر فاروقی کافی عرصہ سے سائنس پر لکھ رہے ہیں، اس سے قبل بھی ان کو کئی اداروں نے ایوارڈ سے نوازا ہے جب کہ معروف ادیب حقانی القاسمی کی متعدد کتابوں کو سراہا گیا اور ایوارڈ کے لیے منتخب کیا گیا ہے، بہ حیثیت صحافی انھوں نے سائنس پر متعدد مضامین لکھ کر اردو قارئین کو روشناس کرایا ہے، حال ہی میں ان کے زیر ادارت شائع شدہ یک موضوعی مجلّہ 'انداز بیاں' میڈیکل ڈاکٹروں کی ادبی خدمات کو بے حد مقبولیت ملی۔ یہ مجلّہ سائنس و ادب کا ایسا مرقع ہے، جو نئی راہوں کی نشاندہی کرتی ہے اور اردو و سائنس کے گہرے رشتوں کو نمایاں کرتا ہے۔ یہ ایوارڈ توصیفی سند اور انعامی رقم پر مشتمل ہے۔ یہ ایوارڈ گزشتہ کئی برسوں سے ہندی اور اردو میں سائنس کی خدمات کے لیے دیا جاتا ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 5 جولائی 2021

رسم اجرا

دستک (کبیر نمبر)

وارانسی: شعبۂ اردو بنارس ہندو یونیورسٹی کے زیر اہتمام شائع ہونے والے ریسرچ جرنل 'دستک' کے تازہ شمارہ کبیر نمبر کا اجرا عمل میں آیا۔ اس موقع پر صدر شعبۂ اردو اور رسالے کے مدیر پروفیسر آفتاب احمد آفاقی نے شمارے کی تیاری کے تعلق سے اپنے تجربات کا اظہار کرتے ہوئے کہا کہ کبیر کو پڑھنا اور ان کے فکر و عمل کو سمجھنا ہندوستانی اقدار اور اس کی روح سے روبرو ہونے جیسا ہے۔ انھوں نے کہا کہ کبیر کے تعلق سے بنیادی کام ہے۔ ہمارا ارادہ ہے کہ 'تلاش کبیر' کے نام سے ان کے سارے سرمایے اور

ریسرچ جرنل 'دستک' کا اجرا

مطالعات کو ایک کتاب کی صورت میں پیش کیا جائے۔ فی الحال دستک کے اس شمارے میں تقریباً دو درجن نئے پرانے مضامین یکجا کر دیے گئے ہیں۔

اس موقعے پر شعبہ کے سینئر استاد ڈاکٹر مشرف علی نے ریسرچ جرنل 'دستک' کی تیاری اور اس کی دشواریوں پر روشنی ڈالی اور اس کے مشمولات کا تعارف پیش کیا۔ ڈاکٹر احسان حسن نے کہا کہ دستک کی تیاری میں ریسرچ اسکالرس، طلبا اور اساتذہ بالخصوص صدر شعبہ اور ڈاکٹر عبدالسمیع نے جس محنت سے کام کیا وہ قابل ستائش ہے۔ ڈاکٹر محمد قاسم انصاری نے دستک (کبیر نمبر) کے مشمولات پر تبصرہ کرتے ہوئے کہا کہ بلاشبہ یہ شمارہ اردو رسائل کی تاریخ میں منفرد مقام حاصل کرے گا اور اسے تادیر یاد رکھا جائے گا۔

ڈاکٹر عبدالسمیع نے پروگرام کی نظامت کے دوران دستک (کبیر نمبر) کے مشمولات کا بھرپور تعارف پیش کیا اور ان مضامین کی حصولیابی میں کن دشواریوں سے گزرنا پڑا ان کی جانب بھی اشارے کیے۔ رسم اجرا کا یہ پروگرام بیک وقت آف لائن اور آن لائن عمل میں آیا۔ اساتذہ اور ریسرچ اسکالرس شعبے میں موجود تھے جبکہ طلبا اور سامعین و ناظرین کی بڑی تعداد نے آن لائن شرکت کی۔ شکریے کی رسم ڈاکٹر رقیہ بانو نے ادا کی۔

پریس ریلیز: ڈاکٹر عبدالسمیع، شعبۂ اردو، بی ایچ یو، 24 جون 2021

نقوشِ ناظر

ھاپوڑ: شمالی ہند میں واقع دورِ شاہجہانی کی یادگار دینی درسگاہ جامعہ عربیہ خادم الاسلام کے سابق مہتمم مولانا ناظر حسین قاسمی کی حیات و خدمات کے اعتراف میں ایک پروقار مگر مختصر پروگرام کا انعقاد کیا گیا، جس میں مولانا ناظر حسین مرحوم کی حیات و خدمات اور کمالات پر مشتمل 'نقوشِ ناظر' نامی کتاب جس کو جامعہ ہذا کے استاذ حدیث و تفسیر مولانا مفتی محمد ایوب قاسمی نے مرتب کیا ہے، کا اجرا عمل میں آیا۔ پروگرام میں علاقائی اور باہری علما و دانشوروں نے شرکت کی۔ پروگرام کے مہمانِ خصوصی مفتی دارالعلوم دیوبند محمود حسن بلند شہری نے بھی شرکت کی۔ پروگرام کی صدارت جامعہ کے شیخ الحدیث مولانا یامین قاسمی نے کی اور نظامت مفتی محمد مستقیم نے کی۔ خطبۂ استقبالیہ مولانا مفتی عبدالقدیم قاسمی مہتمم جامعہ عربیہ خادم الاسلام نے دیا۔ مجلس کا آغاز دارالعلوم دیوبند کے استاذ فن تجوید مولانا قاری سید ارشاد قاسمی کی تلاوتِ قرآن پاک اور قاری شکیل توڑی کی نعت نبی سے ہوا۔ مفتی محمود حسن بلند شہری نے اسلاف کے گراں قدر علمی سرمائے کے امین مولانا ناظر حسین کی حیات اور ان کے اوصاف و کمالات کا تذکرہ کرتے ہوئے کہا کہ وہ ایک ایک مثالی شخصیت کے مالک تھے، ان میں گوناگوں خوبیاں تھیں۔ مولانا ناظر حسین قاسمی کو خراج عقیدت پیش کرتے ہوئے تاجر حاجی لیسین قریشی نے کہا کہ یہ ایک آفتاب کی طرح روشن اور تابناک و مقناطیسی شخصیت کے مالک تھے جو ان سے ملتا وہ ان کی شخصیت سے متاثر ہوئے بغیر نہیں رہ پاتا وہ علاقہ کے لیے زندہ جاوید ولی اور شجر گل افشاں کی طرح تھے۔ تاثرات پیش کرنے والے علما و دانشورانِ قوم میں سے آل انڈیا ملی کونسل کے صدر مولانا حکیم عبداللہ مغیثی مہتمم جامعہ گلزار حسینیہ اجراڑہ میرٹھ، مولانا شاہ عالم نائب ناظم مجلس تحفظ ختم نبوت کل ہند دارالعلوم دیوبند، مفتی محمد خورشید قاسمی استاذ دارالعلوم میرٹھ، مولانا محمد عباس مہتمم محمودیہ شہر میرٹھ، و بابو انوار احمد مدرسہ امدادالاسلام کمال پور، مولانا سید عبدالواحد قاسمی، قاری شوکت علی مہتمم مدرسہ اعزاز العلوم ویٹ، مولانا خالد حسین قاسمی مہتمم محمود المدارس مسوری، ڈاکٹر محمد ذاکر حسین ڈائرکٹر تعلیم و تدریس اکادمی، سابق ایم ایل اے مولانا جمیل احمد ٹنڈیرہ، بدرالدین قریشی سابق صدر طلبہ یونین جامعہ ملیہ اسلامیہ دہلی اور گجراج سنگھ وغیرہ کے نام شامل ہیں۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 3 جولائی 2021

وفیات

دلیپ کمار

ممبئی: شہنشاہِ جذبات کے نام سے مشہور ہندوستان کے عظیم فنکار دلیپ کمار کا 7 جولائی کو 98 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ دلیپ کمار کافی دنوں سے علیل چل رہے تھے اور

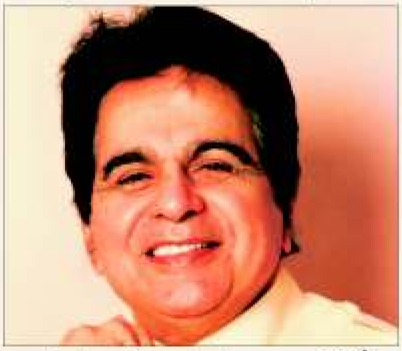

ان کا ممبئی کے ہندوجا اسپتال میں علاج چل رہا تھا۔ کچھ دن پہلے ان کے شفایاب ہونے کے بعد انھیں گھر لے جایا گیا تھا۔ تاہم ان کی طبیعت دوبارہ خراب ہوگئی اور انھیں دوبارہ اسپتال میں داخل کرایا گیا مگر وہ جانبر نہ ہوسکے اور کروڑں مداحوں کو چھوڑ کر راہی ملک بقا ہوگئے۔ دلیپ کمار کو جوہو واقع سانتا کروز قبرستان میں دفن کیا گیا جہاں سیکورٹی کے سخت انتظامات کیے گئے تھے۔ دلیپ کمار کی بیوی سائرہ بانو نے سانتا کروز قبرستان پہنچ کر انھیں آخری بار سلام پیش کیا اور اس موقع پر وہ روتی بلکتی اور بے حال نظر آئیں۔ دلیپ کمار کو سرکاری اعزاز کے ساتھ الوداع کہا گیا۔ ان کے جسد خاکی کو ترنگے پرچم میں لپیٹ کر رکھا گیا تھا۔ گھر سے قبرستان لاتے وقت ایمبولنس پر سوار کرنے سے پہلے انھیں گارڈ آف آنر بھی دیا گیا۔ اس موقعے پر وہاں موجود سبھی لوگوں کی آنکھیں چھلک رہی تھیں۔ دلیپ کمار کے انتقال کی افسوس ناک خبر پر ان کے اہل خانہ، بالی ووڈ فنکاروں اور دنیا بھر میں موجود ان کے مداحوں کی جانب سے شدید دکھ کا اظہار کیا جارہا ہے۔ خیال رہے کہ دلیپ کمار 1922 میں پشاور کے محلے خداداد میں پیدا ہوئے تھے، دلیپ کمار نے اپنے فلمی کیریئر کا آغاز 1944 میں فلم 'جوار بھاٹا' سے کیا مگر فلم انڈسٹری میں اپنی اصل پہچان 1960 میں تاریخی فلم 'مغل اعظم' میں شہزادہ سلیم کا کردار ادا کرکے بنائی۔ دلیپ کمار نے اپنے فلمی کیریئر کے دوران کئی لازوال فلموں میں عمدہ اداکاری کے جوہر دکھائے۔ ان کی خدمات کے پیش نظر حکومت ہندوستان کی طرف سے انھیں پدما بھوشن ایوارڈ، دادا صاحب پھالکے سمیت کئی اعزازات دیے گئے جب کہ 1998 کو انھیں پاکستان کے سب سے بڑے سویلین اعزاز نشان پاکستان سے بھی نوازا گیا۔ دلیپ کمار نے 65 سے زائد فلموں میں کام کیا۔

دلیپ کمار کو اردو زبان پر عبور حاصل تھا۔ وہ روانی کے ساتھ اچھی اردو بولتے تھے اور اردو کے مکالموں کو درست تلفظ کے ساتھ ادا کرتے تھے۔ اردو زبان سے گہری وابستگی اور مہارت نے انھیں فلمی دنیا میں بلند مقام دلایا۔ ابتداءً فلموں میں کام کرنے کے لیے ان کا انتخاب ترجیحی طور پر اس لیے ہوا تھا کہ وہ اچھی اردو جانتے تھے۔ اس لیے ان کی وفات نہ صرف فلمی دنیا کا خسارہ ہے بلکہ اردو دنیا کا بھی نقصان ہے۔

دریں اثنا صدر جمہوریہ رام ناتھ کووند نے دلیپ کمار کی وفات پر جاری اپنے پیغام میں کہا کہ دلیپ کمار نے اپنی شخصیت سے ابھرتے ہوئے ہندوستان کی تاریخ کا خلاصہ کیا۔ ان کی دلکش اداکاری نے تمام حدود کو عبور کرلیا اور برصغیر بھر میں انھیں پسند کیا گیا۔ وزیراعظم نریندر مودی سمیت ہندوستان کے چوٹی کے سیاست دانوں اور مختلف شعبوں سے وابستہ اہم شخصیتوں نے اپنے اپنے انداز میں رنج و غم کا اظہار کیا اور ان کی موت کو ایک عہد کا خاتمہ کہا۔

روزنامہ 'راشٹریہ سہارا' دہلی، 8 جولائی 2021

پروفیسر ابوالکلام قاسمی

علی گڑھ: اردو کے ممتاز ناقد، کہنہ مشق مدیر، بزرگ استاذ اور درجنوں کتابوں کے مصنف پروفیسر ابوالکلام

قاسمی کا 8 جولائی کو طویل علالت کے بعد انتقال ہوگیا۔ موصوف کی عمر 71 سال تھی اور وہ علی گڑھ مسلم یونیورسٹی سے سبکدوش ہونے کے بعد وہیں رہائش پذیر تھے۔ ابوالکلام قاسمی کا وطنی تعلق بہار کے ضلع دربھنگہ کی دوگھرا نامی علمی بستی سے تھا، ان کی پیدائش 20 دسمبر 1950 کو ہوئی اور انھوں نے دینیات سے اپنی تعلیم کا سلسلہ شروع کیا اور 1967 میں دارالعلوم دیوبند سے فضیلت کی تکمیل کی، اس کے بعد جامعہ ملیہ اسلامیہ نئی دہلی سے ہائر سیکنڈری پاس کرنے کے بعد اے ایم یو سے گریجویشن، ایم اے اور 1984 میں پی ایچ ڈی مکمل کی۔ اے ایم یو میں ہی شروع سے آخر تک درس و تدریس کی خدمت سے جڑے رہے، شعبۂ اردو کی صدارت کی، فیکلٹی آف آرٹس کے ڈین بھی رہے، متعدد رسالوں کی ادارت بھی کی، جن میں علی گڑھ میگزین (دو سال)، الفاظ (مدت اشاعت: چار سال)، انکار (مدت اشاعت: تین سال)، تہذیب الاخلاق (پندرہ سال سے زائد)، فکر و نظر اور امروز جیسے علمی، ادبی، تحقیقی و تنقیدی مجلات شامل ہیں۔ قاسمی صاحب اردو ادب و تنقید کا جلی عنوان تھے، خاص طور پر مشرقی تنقیدی رویوں اور روایات پر انھوں نے خوب لکھا، مشرقی شعریات، معاصر تنقیدی رویے، شاعری کی تنقید وغیرہ ان کی اہم کتابیں ہیں۔ انھوں نے ناول کے فن پر ای ایم فارسٹر کی شہرہ آفاق کتاب Aspects of the Novel کا ترجمہ 'ناول کا فن' کے نام سے کیا، جو 1992 میں شائع ہوا اور ادبی حلقوں میں اس کی خوب پذیرائی ہوئی۔ قاسمی صاحب نے کم و بیش نصف صدی کے تدریسی دورانیے میں سیکڑوں شاگرد بھی پیدا کیے، جو ملک و بیرون ملک میں علمی و ادبی خدمات انجام دے رہے ہیں۔

روزنامہ 'اودھ نامہ' لکھنؤ، 9 جولائی 2021

سید لطیف حسین ادیب

بریلی: مشہور ادیب ڈاکٹر سید لطیف حسین ادیب کا بریلی میں 7 جولائی کو انتقال ہوگیا۔ وہ کچھ وقت سے علیل تھے۔ وہ 1931 میں پیدا ہوئے تھے۔ بریلی کالج بریلی کے پہلے اردو پی ایچ ڈی تھے۔ ان کا علمی مقالہ مولوی عبدالحق نے انجمن ترقی اردو کراچی کی جانب سے باسم

سرشار کی ناول نگاری شائع کیا تھا۔ وہ نارتھ ایسٹرن ریلوے کے محکمۂ اکاؤنٹس میں ملازم تھے۔ ان کی دوسری کتب کے نام یہ ہیں: ناشاد کانپوری، چند شعرائے بریلی، جگر بریلوی: ایک تعارف، تذکرہ نعت گویان بریلی، تذکرہ شعرائے بریلی، موصوف روہیلہ تاریخ روہیلہ آثار

اور روہیلہ ادب پر سند کا درجہ رکھتے تھے۔ اس کے علاوہ وہ ایک اچھے تیراک اور ایک اچھے شکاری بھی تھے۔ انھوں نے کافی لوگوں کو تیراکی بھی سکھائی۔

روزنامہ 'انقلاب' بریلی، 8 جولائی 2021

غلام مرتضیٰ راہی

فتح پور: جدید لب و لہجے کے ممتاز شاعر غلام مرتضیٰ راہی کا 10 جولائی 2021 کی صبح آٹھ بجے فتح پور یوپی میں انتقال ہوگیا۔ ان کی عمر تقریباً 85 سال تھی۔ ان کی پیدائش

1937 میں ہوئی تھی۔ وہ اردو روزنامہ 'سیاست جدید' سے کئی برسوں تک منسلک رہے۔ اس کے بعد سرکاری ادارے سے وابستگی ہوئی۔ ان کے شعری مجموعوں میں لامکان، لاریب، حرف مکرر، لاکلام، لاشعور، لاسخن، کلیاتِ راہی، گل سر سبد وغیرہ کے علاوہ ایک خودنوشت 'راہی کی سرگذشت' قابل ذکر ہیں۔ ان کی شخصیت پر عشرت ظفر کی کتاب 'حرف باریاب' اور محمد اور یس رضوی ایم اے کی 'کلام راہی اور صنائع و بدائع' اور ڈاکٹر محمد حسن نظامی کی 'غلام مرتضیٰ راہی: حیات و کارنامے' شائع ہو چکی ہیں۔ ان کے انتقال پر کئی اداروں اور اہم شخصیات نے رنج و غم کا اظہار کیا ہے۔

فیس بک اور دیگر ذرائع سے

حیرت فرخ آبادی

رانچی: ہندوستان کے مشہور و معروف شاعر جناب جیوتی پرساد مصر حیرت فرخ آبادی صاحب کا 11 جولائی کی

رات پونے بارہ بجے انتقال ہوگیا۔ وہ 9 فروری کو 91 سال کے ہوگئے تھے۔ وہ 2004 سے انجمن بقائے ادب رانچی (رجسٹرڈ) کی مسند صدارت کو زینت بخشتے رہے تھے۔ اردو میں ان کے دو شعری مجموعہ کلام 'نوائے ساز دل' اور 'حسن التماس' کافی مقبول ہوئے۔ ان کا ہندی شعری مجموعہ 'جو کریدے گھاؤ' من کے ہاتھوں ہاتھ لیا گیا۔ آپ کی پیدائش تو بہرائچ میں 1930 میں ہوئی تھی مگر جلد ہی ان کا خاندان فرخ آباد ہجرت کر گیا تھا جہاں انھوں نے ابتدائی تعلیم حاصل کی۔ گورکھپوری کے سنت اینڈ ریوز کالج سے گریجویشن کیا جہاں مجنوں گورکھپوری جیسے اردو کے بہترین استاذ ملے جن کی سرپرستی میں انھوں نے باقاعدہ شاعری شروع کی۔ اسکول کے زمانے سے ہی یعنی 13 سال کی عمر سے حیرت صاحب نے شاعری شروع کردی تھی۔ وہ رانچی بہ سلسلہ ملازمت نیوری واقع وکاس ودیالیہ 1960 میں تشریف لائے اور انگریزی کے بے حد مقبول استاذ ثابت ہوئے۔ آپ 1990 میں سبکدوش ہوئے اور 10 سالوں تک گرین لینڈ اسکول ہساگ کے پرنسپل رہے۔ تادم حیات (کورونا وقفہ چھوڑ کر) اپنے گھر پر بچوں کو انگریزی کی تعلیم دیتے رہے۔ استاذ تو آپ انگریزی کے رہے مگر اردو کے بے حد مقبول شاعر ثابت ہوئے۔ اپنے پیچھے دو بیٹے، ایک بیٹی، ایک پوتا اور ایک پوتی چھوڑ گئے۔ کچھ دنوں قبل یعنی 21 مئی کو ان کی شریک حیات محترمہ مالتی مصرا کا لمبی بیماری کے بعد انتقال ہوگیا تھا۔ 12 جولائی کی دوپہر عیسائیوں کے کانٹاٹولی قبرستان میں تدفین انجام پائی۔

روزنامہ 'فاروقی تنظیم' رانچی، 13 جولائی 2021

سیف سہسرامی

سہسرام: اردو کے مشہور شاعر سیف سہسرامی نے 15 جون کو اس دارفانی کو الوداع کہہ دیا۔ وہ 81 سال کے تھے اور کافی دنوں سے علیل تھے۔ انھوں نے آخری سانسیں اپنی رہائش گاہ محلہ نور گنج میں لیں۔ ان کا جسد خاکی ان کے خاندانی قبرستان کھوریہ میں سپرد خاک کیا گیا۔ جنازے میں معروف شاعر کفیل انور، قسیم سہسرامی، عالم پرویز اور سہسرام کے دوسرے شعرا، ادبا، وکلا اور ہر شعبے کے لوگ کثیر تعداد میں شریک تھے۔ پسماندگان میں ایک بیوہ بیٹی سیدہ ماہ نور اور کئی بھتیجے شامل ہیں۔ مرحوم نے ہند و پاک میں شاگردوں کی کثیر تعداد اور معتد بہ کلام یادگار کے طور پر چھوڑے ہیں۔ مشہور شاعر منیر سیفی، ارشاد آرزو اور قسیم سہسرامی ان کے بھتیجے ہیں۔ سیف سہسرامی کی پیدائش 1940 میں حکیم سید واجد حسین کے گھر ہوئی تھی۔ ابھی دو ماہ کی عمر تھی کہ سایۂ پدری سے محروم ہوگئے۔ ان کی نشو ونما بڑے بھائیوں سید وہاب الدین مخمور سہسرامی اور سید قمر الدین کیف سہسرامی کے زیر سایہ ہوئی۔ وہ نوخیزی میں ہی درس و تدریس سے جڑ گئے تھے اور آخری سانس تک اسی مشغلہ کو اپنائے رہے۔ شعر و شاعری انھیں وراثت میں ملی تھی۔ مرحوم کا شمار ماہرین عروض میں تھا۔ ان کے شاگردوں کی خاصی تعداد بیرون ملک میں بھی ہے۔ ان کی رحلت پر پروفیسر حسین الحق نے کہا کہ سیف کا گزر جانا سہسرام کے ادبی حلقے کا ناقابل تلافی خسارہ ہے۔ ڈاکٹر اے کے علوی نے کہا کہ سیف صاحب ہمارے بزرگ بھی تھے اور شہر کی زینت بھی۔ ادبی دنیا انھیں ہمیشہ یاد رکھے گی۔ شبیر سہسرامی، شگفتہ سہسرامی اور دوسرے ادیبوں و شعروں نے بھی تعزیت پیش کرتے ہوئے ان کے درجات کی بلندی کی دعا کی ہے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 جون 2021

ہمایوں قدیر

مراد آباد: شہر کے پہلے میئر اور اردو صحافت کے شعبے میں نمایاں مقام رکھنے والی شخصیت ہمایوں قدیر نے 9 مئی کو اس دنیائے فانی کو الوداع کہا۔ ان کے انتقال کی خبر سے شہر کے باشندوں خصوصاً صحافیوں، سیاست دانوں اور اردو ادب نوازوں میں غم کی لہر دوڑ گئی۔ نماز عصر کے بعد

مرحوم کی نماز جنازہ ادا کی گئی اور کچہری روڈ واقع کلن شاہ کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ ہمایوں قدیر جو قریب 80 برس کے تھے، بہت ہی نرم خو، ملنسار اور خوش اخلاق انسان تھے۔ سادگی ان کی پہچان تھی۔ وہ ہمیشہ مسکراتے رہتے تھے۔ ہمایوں قدیر نے اردو صحافی کے طور پر جو شہرت حاصل کی، اس کی کوئی مثال نہیں ہے۔ انھیں مراد آباد شہر کا پہلا میئر بننے کا اعزاز بھی ملا۔ ایک لمبے عرصے سے ان کی صحت خراب تھی۔ وہ طویل عرصے سے اسپتال میں داخل تھے۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 10 مئی 2021

ضیا عباس نجمی

امروہہ: سینئر صحافی و شاعر ضیا عباس نجمی کا پپنیا اسپتال میں مختصر علالت کے بعد 7 جولائی کو 63 سال کی عمر میں انتقال ہوگیا۔ ان کی نماز جنازہ عزا خانہ مساۃ پچھی میں ہوئی اور درگاہ حضرت شاہ ولایت کے قبرستان میں سپرد خاک کیا گیا۔ مرحوم آئی ایم انٹر کالج کے لکچرار ماسٹر توکل حسین مرحوم کے فرزند تھے اور ای ٹی وی اردو حیدرآباد میں طویل عرصہ تک خدمات انجام دے کر سبکدوش ہوئے۔ وہ جمال عباس فہمی کے بھائی تھے۔ ان کا آبائی وطن میرٹھ تھا لیکن والد کی ملازمت کی وجہ سے امروہہ میں قیام رہا اور پوری زندگی امروہہ میں ہی بسر کی۔ مرحوم بہترین شاعر اور ناظم ہونے کے ساتھ ساتھ تحت اللفظ خواں بھی تھے اور جشن علی اکبر کے عنوان سے طرحی محفل مقاصدہ بھی منعقد کراتے تھے۔ ان کے پسماندگان میں ایک بیٹی اور ایک بیٹا شجاع عباس ہیں۔ مختلف اخبارات سے منسلک رہنے کے ساتھ گنگا جمنی تنظیم ادبی سنگم کے بھی سرگرم کارکن تھے۔ ان کے انتقال سے پوری صحافی برادری، شاعر برادری اور سماجی و ادبی حلقوں میں غم کا ماحول ہے۔ ان کی تدفین میں کثیر تعداد میں لوگوں نے شرکت کی۔

روزنامہ 'صحافت' دہلی، 8 جولائی 2021

ڈاکٹر انتخاب عالم ساحل

ہاپوڑ: ڈاکٹر انتخاب عالم ساحل 15 جون کو داغ مفارقت دے گئے۔ علالت کے بعد وہ مقامی اسپتال میں داخل کیے گئے لیکن وہ اس مختصر سی بیماری میں بھی جانبر نہیں ہوسکے۔ ڈاکٹر انتخاب عالم ساحل طب کے پیشے سے وابستہ تھے اور شاعری بھی کرتے تھے۔ ان کے کئی شاگرد بھی ہیں۔ ایک ایسا انسان جس نے شاعری کی دنیا میں نام حاصل کیا اور ہر دلعزیز بھی ہوا وہ شخص اہل خانہ اور دوست واحباب کو غمگین کر گیا۔ وہ ایک اچھے انسان ہونے کے ساتھ ساتھ اہل علم اور علم دوست بھی تھے۔ وہ دوستی نبھانا خوب جانتے تھے، اللہ تعالیٰ مرحوم کی مغفرت کرے اور جنت میں اعلیٰ مقام عطا کرے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 16 جون 2021

موسیٰ تاج چالیس گانوی

جلگاؤں: خطہ خاندیش کے معمر شاعر شیخ موسیٰ تاج چالیس گانوی 13 جون کو انتقال کر گئے۔ انھوں نے بھساول میں اپنے بیٹے کے مکان میں آخری سانس لی۔ ان کی تدفین بعد نماز عشا بھساول کے کھڑکا روڈ پر واقع قبرستان میں عمل میں آئی۔ انتقال کے وقت مرحوم کی عمر 97 سال تھی۔ شیخ موسیٰ تاج چالیس گانوی کا آبائی وطن مشرق خاندیش چالیس گاؤں ضلع جلگاؤں کے قصبہ پیپر کھیڑ تھا۔ ان کی پیدائش 3 فروری 1924 بتائی جاتی ہے۔ ان کا پورا نام شیخ موسیٰ شیخ داؤد تھا۔ ان کا گھرانہ بہت ہی سادہ زندگی گزارتا تھا۔ ان کے فرزند شیخ خلق اور شیخ ریاض سے حاصل کردہ تفصیلات کے مطابق مرحوم شیخ موسیٰ تاج نے ساتویں جماعت تک ہی تعلیم حاصل کی تھی۔ معاشی حالات کی نازساگاری کی بنا پر تعلیم کا سلسلہ منقطع کردیا اور تلاش معاش کے سلسلے میں اپنے بڑے بھائی عزیز شیخ مخدوم کے ساتھ پاچورہ میں 'مان سنگھ لمیٹڈ' نامی وناسپتی کے کارخانے میں ملازمت اختیار کی اور ایک عرصے تک بطور ٹرنر کمپنی میں کام کیا۔ بعد میں کوپرگاؤں ضلع احمد نگر میں عارضی طور پر رہائش اختیار کی اور پھر 1971 میں جلگاؤں آگئے تھے اور فی الحال اپنے بڑے بیٹے شیخ خلیق کے یہاں مقیم تھے۔ طالب علمی کے زمانے سے وہ شعر وسخن کی طرف مائل تھے۔ اساتذہ کے کلام کے مطالعہ سے انھیں مشق سخن کی ترغیب ملی۔ اب تک ان کا کوئی شعری مجموعہ شائع نہیں ہوا ہے۔ 'گل فشاں' کے عنوان سے ان کا مجموعہ کلام زیر طباعت ہے۔ شاعری میں ان کے استاد اکرام دھولیوی تھے۔

روزنامہ 'انقلاب' دہلی، 14 جون 2021

Subscription Form "Urdu Duniya"

سالانہ خریداری فارم

میں 'اردو دنیا' کا رکی سالانہ خریدار بننا چاہتا/چاہتی ہوں۔

150 روپے کا ڈرافٹ/ منی آرڈر................ بتاریخ................ بنام National Council for Promotion of Urdu Language منسلک ہے۔

میں نے زرِ تعاون سالانہ -/150 روپے A/C: 90092010045326، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کروادیا ہے۔

آپ 'اردو دنیا' ایک سال کے لیے اس پتے پر بھجوائیں:

نام : ....

پتہ : ....

....

....

اس فارم کو درج ذیل پتے پر بھیج دیں:

Sales Department: NCPUL, West Block 8, Wing7, RK Puram, New Delhi - 110066

فون: 011-26109746 فیکس: 011-26108159, E-mail.:sales@ncpul.in

دستخط

قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان کی چند مطبوعات

ساحری، شاہی، صاحب قرانی: داستان امیر حمزہ کا مطالعہ، جلد دوم

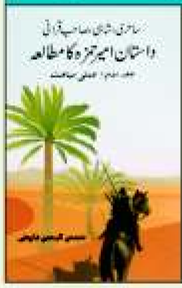

مصنف: شمس الرحمٰن فاروقی

پہلی اشاعت: 2006

دوسری طباعت: 2021

صفحات: 224، قیمت 120 روپے

ہندوستان کی تحریک آزادی اور اردو شاعری

مصنف: گوپی چند نارنگ

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 600

قیمت: 265 روپے

اردو ریڈیو اور ٹیلی ویژن میں ترسیل و ابلاغ کی زبان

مصنف: کمال احمد صدیقی

تیسری طباعت: 2021

صفحات: 646

قیمت: 280 روپے

अभ्यास पुस्तिका उर्दू कैसे लिखें

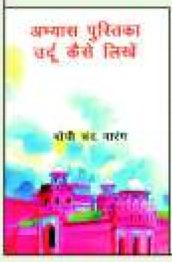

مصنف: گوپی چند نارنگ

چوتھی طباعت: 2021

صفحات: 98

قیمت: 50 روپے

مثالی طالب علم کیسے بنیں؟

مصنف: سعید احمد سندیلوی

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 125

قیمت: 85 روپے

اردو ہندی فکشن میں اساطیر

مصنف: ناز قادری

پہلی اشاعت: 2021

صفحات: 290

قیمت: 150 روپے

دستور ہند کا معمار ڈاکٹر بھیم راؤ امبیڈکر

مصنف: خواجہ عبدالمنتقم

دوسری طباعت: 2020

صفحات: 155

قیمت: 80 روپے

آؤ سائنسی خط پڑھیں!

مصنف: عبدالودود انصاری

پہلی اشاعت: 2020

صفحات: 101

قیمت: 75 روپے

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، ونگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066

فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in

उर्दू दुनिया, मासिक, अगस्त-२०२१,वर्ष:२३, अंक:०८
URDU DUNIYA Monthly, August-2021, Vol.23, Issue:08
National Council for Promotion of Urdu Language
Ministry of Education, Department of Higher Education, Government of India

RNI NO. 70323/99
DL (S) - 01/3394/2020-22
ISSN 2249 - 0639
Date of Publication:24/07/2021
Date of Dispatch : 25 & 26 of advance month
Total Pages:100

ایک قدم صفائی کی جانب

اردو زبان میں علم و آگہی کا معتبر ادبی جریدہ

قومی اردو کونسل کی منفرد پیشکش

اردو زبان و ادب سے متعلق اہم تنقیدی و تحقیقی موضوعات پر فکر انگیز اور تلاش و جستجو کو صحیح سمت دینے والے مواد کے ساتھ ہر تین ماہ بعد منظرِ عام پر آنے والا نہایت سنجیدہ علمی مجلّہ خود بھی پڑھیں اور دوسروں کو بھی پڑھنے کا مشورہ دیں!

ہندستانی خریداروں کے لیے سالانہ قیمت: 100 روپے، فی شمارہ: 25 روپے

بنام NCPUL اکاؤنٹ نمبر: 90092010045326 A/C: ، IFSC: CNRB0019009 میں جمع کریں۔

شعبۂ فروخت: قومی کونسل برائے فروغ اردو زبان، ویسٹ بلاک 8، وِنگ 7، آر کے پورم، نئی دہلی-110066
فون: 011-26109746، فیکس: 011-26108159، E-mail.:ncpulsaleunit@gmail.com, sales@ncpul.in
شاخ : 110-7-22 تھرڈ فلور، ساجد یار جنگ کمپلکس بلاک نمبر 5-1، پتھر گٹی، حیدرآباد-500002 فون: 24415194 - 040

(قومی اردو کونسل کی ویب سائٹ، http://www.urducouncil.nic.in پر بھی دستیاب)

Printed and Published by Dr. Aquil Ahmad, Director NCPUL, on behalf of National Council for Promotion of Urdu Language, and printed at S.Narayan and sons, B-88 Okhla Indl. Area Phase II. New Delhi-110020
And Published at Farogh-E-Urdu Bhawan FC-33/9 institutional Area Jasola New Delhi-110025
LPCDELHI,DELHIPSO,DELHIRMS,DELHI-6